دیباچہ

ترامیم اور اضافوں کے ساتھ "عشق کا عین" کا یہ اسپیشل ایڈیشن آپ کے ہاتھ میں ہے۔ امید تو یہی ہے کہ یہ آپ کو پچھلے عام ایڈیشن کے مقابلے میں بہت زیادہ پسند آئے گا۔ کوشش کی گئی ہے کہ ہر اعتبار سے یہ اسپیشل ایڈیشن ہی ہو۔

آپ جانتے ہیں کہ "عشق کا عین" سب سے پہلے سسپنس ڈائجسٹ میں شائع ہوئی تھی۔ ڈائجسٹ کیلئے لکھتے ہوئے کہانی کی ضخامت کم از کم میرے لیے ہمیشہ ایک بڑا مسئلہ ہوتی ہے مجھے سسپنس ڈائجسٹ کے پبلشر اور مدیر اعلیٰ جناب معراج رسول سے اپنی وابستگی پر ہمیشہ فخر رہا ہے۔ وہ بہت اچھی اور غیر معمولی کہانیوں کی ہمیشہ قدر کرتے ہیں اور انہیں چھاپتے ہوئے کسی طرح کا خطرہ مول لینے سے کبھی نہیں ہچکچاتے مگر کوئی کہانی جب بہت زیادہ پھیل جائے اور ڈائجسٹ میں کئی قسطوں میں شائع ہو تو انکے لیے مسئلہ کھڑا ہو جاتا ہے۔ بہت سے قارئین ایسے سلسلے کو پسند نہیں کرتے۔ وہ یا تو کہانی پڑھتے ہی نہیں یا ادھوری چھوڑ دیتے ہیں۔ دونوں صورتوں میں وہ ایک غیر معمولی کہانی سے محروم ہو جاتے ہیں جو ڈائجسٹ کیلئے بھی اچھا نہیں۔ اسلئے ڈائجسٹ کیلئے لکھتے وقت کہانی کی باگیں کھینچکر رکھنی پڑتی ہیں۔ آخری حد تک اختصار سے کام لینا پڑتا ہے۔ کبھی کبھی اس کوشش میں کہانی مجروح بھی ہو جاتی ہے۔ اسکی اثر انگیزی میں کمی ہو جاتی ہے، جسکا لکھنے والے کے سوا کسی کو پتا نہیں چلتا۔ اس لحاظ سے یہ کمی بے ضرر ہی ہوتی ہے۔

"عشق کا عین" میں تشنگی کا احساس مجھے اس پر بننے والی ٹی وی سیریل کا اسکرپٹ لکھتے وقت ہوا۔ ہر کہانی میں بیانیہ ہوتا ہے اور اسے اسکرین پر دکھانا آسان کام نہیں۔ جہاں کہانی میں تشنگی خوب صورت لگتی ہے، ٹی وی ڈرامے کے لیے وہی تشنگی تباہ کن ثابت ہو سکتی ہے۔ اس میں ابہام پیدا ہوتا ہے اور تاثر میں فرق پڑتا ہے۔ سو اسکرپٹ لکھتے وقت مجھے احساس ہوا کہ کہانی میں الٰہی بخش کے باپ کے کردار کے ساتھ انصاف نہیں کیا جا سکا۔ میں نے یہ کمی دور کرنے کی کوشش کی نتیجہ یہ نکلا کہ پیر بخش اس کہانی میں بجا طور پر ایک بڑی قوت کی حیثیت اختیار کر گیا۔ پھر کچھ نئے کردار بھی متعارف کرانے پڑے۔ ان میں ایک ماسٹر جی ہیں، جن سے حاجرہ کو بیٹی کی حیثیت سے Relate کر دیا گیا۔ دو اور کردار مجذوبوں کے کہانی میں شامل ہوئے۔ الٰہی بخش کے ایک بیٹے کا کردار بھی بڑھایا گیا۔ اس وجہ سے دو اور کردار کہانی کا حصہ بنے۔

ابھی دو دن پہلے مجھے سیریل "عشق کا عین" کی پہلی قسط دکھائی گئی۔ اگر اس کے بعد میں جواں سال پروڈیوسر ڈائریکٹر میر محمد مہر کو بھرپور داد نہ دوں تو یہ بے انصافی ہو گی۔ میر محمد نے جس جذبے سے اس سیریل کو کیا ہے، اسکا اجر تو انشاءاللہ اسے مل جائے گا بلکہ ملتا ہی رہے گا۔ آپ جب بھی دیکھیں گے تو اسے سراہے بغیر نہیں رہیں گے۔ ایبٹ آباد میں اصل لوکیشنز پر بے حساب دشواریوں کے باوجود اس نے جس محبت اور جاں فشانی سے ریکارڈنگ کی ہے، سیریل کا ایک ایک فریم اس کی گواہی دیتا ہے۔ کہانی کے حقیقی کرداروں شاہ فرید، سجاد حسین شاہ اور شفقت شاہ نے ایبٹ آباد میں ریکارڈنگ کے دوران جس طرح ہر ممکن تعاون کیا اس کے لیے شکریہ بہت چھوٹا لفظ ہے۔ ان کے لیے دل کی گہرائیوں سے دعا نکلتی ہے۔

خیر، اسکرپٹ مکمل کرنے کے بعد مجھے خود بھی "عشق کا عین" کی اصل کہانی ادھوری لگنے لگی۔ چنانچہ میں نے اسکرپٹ میں کیے گئے اضافوں کو کہانی میں شامل کیا۔ کتاب کے دو ایڈیشن اللہ کے فضل و کرم سے ہاتھوں ہاتھ نکل گئے تھے اور کتاب کی مانگ جاری تھی لیکن میں اب اسے تشنگی کے ساتھ شائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ سوچ لیا تھا کہ اب یہ اسپیشل ایڈیشن ہی شائع کیا جائے گا لیکن اس کی اشاعت میں بوجوہ تاخیر ہوتی رہی۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہم اس میں کوئی کمی نہیں چھوڑنا چاہتے تھے۔ اس کی کمپوزنگ زیادہ بہتر خط میں دوبارہ کرائی گئی۔ ٹائٹل از سر نو بنوایا گیا اور وہ بھی دوہرا، یعنی سرورق کے ساتھ پس ورق بھی۔ اب فیصلہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

میں ان تمام خواتین و حضرات سے معذرت خواہ ہوں، جن کی بے تابی نے مجھے شرمسار کیا۔ جنھوں نے خط لکھے، جو کتاب کے لیے میرے گھر آئے مگر جنھیں کتاب نہ مل سکی۔ خدا کرے، یہ کتاب پڑھ کر وہ بے ساختہ کہیں یہ دیر آید درست آید والی بات ہے۔ ہم نے اپنی طرف سے پوری کوشش کی ہے کہ یہ کتاب آپ کے لیے ایک بہترین تحفہ ثابت ہو گر قبول افتد زہے عز و شرف

والسلام، علیم الحق حقی

پیش لفظ

(عشق کا عین جیسے خوبصورت اور بہترین ناول کا پیش لفظ بھی ایک بڑے مصنف محی الدین نواب نے تحریر کیا ہے، جو درج ذیل ہے۔ادارہ کتاب گھر اس سلسلے میں صرف اتنا ہی کہنا چاہے گا کہ ہم انشاء اللہ آپ تک اردو زبان کی بہترین کتب پہنچاتے رہیں گے)

علیم الحق حقی میرے ان چاہنے والوں میں سے ہیں، جن کی چاہت عقیدت مندی کے مرحلہ میں داخل ہو جاتی ہے۔ان کی یہ خواہش تھی بلکہ ضد تھی کہ زیرِ نظر کتاب کا پیش لفظ میں لکھوں۔پیش لفظ کے سلسلے میں میرا خیال ہے کہ اسے لکھنا جتنا دشوار ہے، اتنا ہی آسان بھی ہے۔سیدھی سی بات ہے، مصنف کیلئے تعریفی الفاظ لکھنے ہوتے ہیں پھر ان حالات میں حقی مجھے چاہتے ہیں، میں حقی کو چاہتا ہوں تو لکھنے کا مرحلہ اور آسان ہو جاتا ہے کہ

''من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو''

میں ان دنوں اس قدر مصروف رہا ہوں کہ دو سطروں کا بھی ایک خط کسی عزیز کو نہیں لکھ پاتا۔ایسے میں حقی کی خواہش یا ضد میرے لیے ایک مسئلہ بن گئی کہ پیش لفظ لکھنے کا وقت کیسے نکالوں؟

میں نے ابتداء میں حقی کی تقریباً ہر شائع ہونے والی کہانی پڑھی۔پھر مصروفیات نے مجھے ان کی تحریروں سے دور کر دیا۔جب سسپنس ڈائجسٹ میں ''عشق کا عین'' شائع ہوئی اور قارئین کی جانب سے اس کہانی کی بہت زیادہ پذیرائی ہونے لگی تو میں نے سوچا۔اس کہانی کو پڑھنے کا وقت نکالوں گا لیکن فلم، ٹی وی، ڈرامہ نگاری، ناول نگاری اور اکیس برسوں سے جاری رہنے والے ''دیوتا'' کے تسلسل نے مجھے حقی تک پہنچنے کا موقع ہی نہیں دیا۔حقی کہ پچھلے دو برسوں سے سسپنس کے قارئین کو مجھ جیسے رائٹروں کی کمی محسوس نہیں ہونے دی۔

بہرحال میرے لیے یہ مسئلہ تھا کہ میں پیش لفظ لکھنے کا وقت کیسے نکالوں؟ کیونکہ لکھنے سے پہلے ''عشق کا عین'' پڑھنا لازمی تھا اور یہ کوئی مختصر سی کہانی نہیں ہے۔آپ اس کی ضخامت دیکھ رہے ہیں۔یہ میرے لیے چیلنج بن گئی کہ نہ میں اسے پڑھ سکوں گا اور نہ اس پر اپنی کوئی رائے دے سکوں گا۔

ایسے وقت ایک روایتی سی تدبیر سوجھی کہ ''عشق کا عین'' ابتدا سے آخری صفحہ تک پڑھنا ضروری نہیں ہے جس طرح خط کا مضمون بھانپ لیتے ہیں لفافہ دیکھ کر اسی طرح ہم لکھنے والے کسی بھی کہانی کا ابتدائی حصہ اور آخری حصہ پڑھ کر سمجھ لیتے ہیں کہ لکھنے والا کتنے پانی میں ہے یعنی کنارے سے پانی کی گہرائی کا اندازہ کر کے رسمی طور پر پیش لفظ لکھا جا سکتا ہے بلکہ لکھا جاتا ہے۔

پھر میں نے یہی کیا کہانی کا پہلا صفحہ کھولا اور اسے پڑھنا شروع کیا۔پھر وہ ہوا جس کی توقع نہ تھی۔کہانی کا پہلا پیراگراف پڑھتے ہی یکبارگی مجھے ایک پتھر سا آ کر لگا۔حالانکہ کہانی کے مرکزی کردار الٰہی بخش نے پتھر اٹھایا تھا، مارا نہیں تھا لیکن عشق کے حوالے سے حقی نے جو بات سمجھائی، وہ یہ تھی کہ عشق میں پتھر کھائے جاتے ہیں، مارے نہیں جاتے۔

شاید میں عشق کو کسی حد تک سمجھتا ہوں اس لیے الٰہی بخش کا اٹھایا ہوا پتھر مجھے ایسی محبت سے لگا کہ میں پڑھتا ہی چلا گیا اور یہ سوچتا رہا کہ کہیں آگے جا کر رک جاؤں گا۔

لیکن آگے پھسلن تھی۔میں پھسلتا چلا گیا۔حقی نے الٰہی بخش کی کردار نگاری کے لئے جو تکنیک اختیار کی اس نے مجھے سحر زدہ کر دیا جس الٰہی بخش نے صرف ایک بار مارنے کے لیے پتھر اٹھایا تھا، وہ ساری عمر بڑے پیار سے پتھر کھاتا رہا۔

توانائی کے بغیر زندگی قائم نہیں رہتی اور پتھر کے بغیر عشق نہیں پنپتا۔ وہ ایبٹ آباد سے پتھر کھا کر کراچی آیا۔ کراچی کے فٹ پاتھ سے جتنا روزگار حاصل کیا، اتنے ہی پتھر بھی کھائے۔ پھر ایک پیار کرنے والی "سادی" اس کی زندگی میں ایسے پتھر کی طرح آئی جو پھول کی طرح لگتی رہی اور اندر سے زخمی کرتی رہی۔ وہ سمجھ نہ سکا کہ وہ زخم اسے عشق مجازی سے بے خودی کے عالم میں عشق حقیقی کی طرف لے جا رہے ہیں۔ "عین" کے معنی ہیں جوہر۔ اصل شئے (عشق) کو اچھی طرح نچوڑنے، چھاننے اور پھٹکنے کے بعد جو خالص مادہ رہ جاتا ہے وہ جوہر یا عشق کا عین ہے۔ وہ چھوٹے سے چھوٹا ذرہ جو لا یتجزیٰ ہے جسے سائنس نے توڑ کر بہت بڑی طاقت بنا دیا ہے، وہ طاقت عشق کا عین ہے۔ جو علم سائنس کے پہلے سے تھی۔

دوا کو آگ میں پکا کر جو ست حاصل کیا جاتا ہے، وہی سب "عشق کا عین" ہے۔

یہ عین وہ نفیس مادہ ہے جو آنکھوں سے نظر نہیں آتا اور جو بصارت سے نہیں بصیرت سے نظر آتا ہے تو پھر انا الحق کی سولی پر یا فٹ پاتھ کے الٰہی بخش کے کردار میں دکھائی دیتا ہے۔

حقی نے کئی جگہ ایسی منظر نگاری کی ہے جو ذہن میں نقش ہو کر رہ جاتی ہے۔ کہانی کے ایک مقام پر جب الٰہی بخش اتنا پھیلتا ہوا لگا ہے کہ اس کے پھیلاؤ کے لئے کائنات چھوٹی پڑ جاتی ہے۔

ایک اور مقام پر جب الٰہی بخش جذب کے عالم میں ہوتا ہے اور اس کے دل کی دھڑکنوں کے بجائے اللہ اللہ کی آوازیں سنائی دیتی ہیں تو پڑھنے والے کے دل میں بے اختیار ایمان پرور تحریک پیدا ہوتی ہے۔ میرے خیال کے مطابق یہ ایسی ایمان افروز کہانی ہے کہ اگر علیم الحق حقی کا نام درج نہ ہوتا تو اس پر آسمانی صحیفے کا گمان ہوتا۔ میں پڑھنے سے جی چرا رہا تھا لیکن آخری صفحے تک بے تکان پڑھتا چلا گیا۔ یہ کہانی پہلے صفحے سے کوہ ندا کی طرح پکارتی ہے اور پڑھنے والا سحر زدہ ہو کر آخری صفحے تک دوڑتا چلا جاتا ہے۔

الٰہی بخش جس سرونٹ کوارٹر میں رہتا تھا اس کے ایک کمرے میں خوب صورت کتابیں خاصی تعداد میں تھیں۔ سادی ان کو دیکھ کر الٰہی بخش سے کہتی ہے "اگر کتابوں سے دوستی ہو جائے تو آدمی اکیلا نہیں رہتا"۔ میں کہتا ہوں "حقی کے قلم سے دوستی ہو جائے تو ہم اور آپ اکیلے نہیں رہیں گے۔

محی الدین نواب

حاصل عشق—"عشق کا عین"

دنیا بھر کے ذخیرہ نثر و نظم میں جس موضوع پر سب سے زیادہ لکھا گیا ہے، وہ محبت کا موضوع ہے۔ سالہا سال گزر گئے مگر اس موضوع کی تازگی اور کشش برقرار ہے اور آئندہ بھی رہے گی۔

عشق اگر واقعی عشق ہے تو پھر وہ حال میں قابل ستائش ہے۔ چاہے وہ مجازی ہو یا حقیقی، سفلی ہو یا نوری، کسی عام شخص نے کیا ہو یا خاص نے...... زیر نظر کہانی بھی عشق کے موضوع پر ایک یادگار تحریر ہے۔

علیم الحق حقی سے میرا غائبانہ تعارف تو تھا مگر براہ راست تعارف ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ سسپنس میں میری کہانی "اداس آنکھیں اداس شامیں" شائع ہوئی تو حقی صاحب نے ایک سچے قلم کار کی حیثیت سے از خود اپنے اوپر یہ ذمے داری عائد کر لی کہ وہ کہانی کے بارے میں اپنے محسوسات مجھ تک پہنچائیں۔ اس کے بعد میں نے بھی ان کی پرانی اور نئی کہانیاں اہتمام سے پڑھیں اور ان کے قلم میں چھپے ہوئے جذبے کی سچائی اور بے پناہ طاقت کا معترف ہو گیا۔

"عشق کا عین" شروع کرتے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ مصنف ایک بڑی اور یادگار کہانی لکھنے جا رہا ہے۔ وہ اصل کہانی شروع کرنے سے پہلے ہی بڑے اعتماد کے ساتھ قاری کو اپنی گرفت میں جکڑ لیتا ہے۔ پھر "پہلی نظر" والے واقعے کے بعد جوں جوں کہانی آگے بڑھتی ہے، قاری اس میں ڈوبتا چلا جاتا ہے۔ مصنف کا قلم جن واقعات کو چھپانا چاہتا ہے۔ بڑی مہارت سے چھپاتا ہے اور جو واقعات ظاہر کرنا چاہتا ہے وہ کسی قابل ذکر کوشش کے بغیر ظاہر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ سادی کے احساسات ہماری نگاہوں سے اوجھل ہیں لیکن پھر بھی ان احساسات کے بارے میں ہمیں خوبصورت اشارے ملتے رہتے ہیں۔ الٰہی بخش کا عشق ایک پراسرار پتھر جیسا ہے۔ ایک ایسا پتھر جو کروڑوں اربوں سال زمین کی اتھاہ گہرائیوں میں دفن رہتا ہے، وہاں بے پناہ دباؤ، حرارت اور ہیبت ناک کیمیائی عمل برداشت کرتا ہے اور آخر ہیرا بن جاتا ہے۔ یہ کہانی پتھر سے ہیرا بننے کے درمیانی عمل کی کہانی بھی ہے۔ کہانی کے آخری مرحلے میں کچھ دیر کے لئے ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ہم تصوف کی دھند میں چھپ کر مرکزی کردار سادی سے بچھڑ گئے ہیں لیکن آخری صفحات چشم کشا ہیں۔ سادی کے کردار کی گرہیں کھلتی ہیں اور پوری کہانی پر ایک نئے تحیر خیز زاویے سے روشنی پڑتی ہے۔ سادی کا کردار پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے اور دل و دماغ پر نقش ہو جاتا ہے۔ یہ یادگار کہانی پڑھنے کے بعد یہ شعر خود بخود ذہن میں آ رہا ہے۔

ایک ایسی بھی گھڑی عشق میں آئی تھی کہ ہم
خاک کو ہاتھ لگاتے تو ستارہ کرتے

طاہر جاوید مغل

الٰہی بخش کو پہلی نظر میں عشق ہوا تو یہ کوئی حیرت کی بات نہیں۔ اس کا خمیر ہی عشق کی مٹی سے اٹھا تھا!

بچپن ہی سے وہ عشق اور محبت کی باتیں سنتا رہا تھا۔ اس وقت سے جب اسے محبت کے "م" اور عشق کے "ع" کی پہچان بھی نہیں تھی۔ محبت اور عشق کی تلقین اس کے باپ کا وظیفہ تھا۔ وہ ہر وقت اس عشق اور محبت کی بات کرتا، جو انسان ہونے کے ناتے اس پر اور اس کی آنے والی نسلوں پر فرض تھی اور یہ تعلیم اسے اس کے بزرگوں نے اسی طرح دی تھی۔ وہ نسلاً عاشق تھے۔

الٰہی بخش کی سمجھ میں اپنے باپ کا فلسفۂ عشق کبھی نہیں آیا۔ ابتدا میں تو وہ سمجھنے کے قابل ہی نہیں تھا۔ باپ بھی عشق کی وہ تلقین اسے گھٹی سمجھ کر پلاتا تھا کہ گھٹی کا اثر کبھی نہیں جاتا، بلکہ وہ بہت مضبوط اور دیرپا اثر ہوتا ہے۔ انسان اس سے کسی طرح لڑ ہی نہیں سکتا۔ مگر جب الٰہی بخش سمجھداری کی حدود میں داخل ہوا، تب بھی ابا کا فلسفۂ عشق اس کے حلق سے کبھی نہیں اترا۔ الٹا اس کے اندر ایک مزاحمت پیدا ہوگئی۔ اس کے مزاج میں عشق سے بغاوت آ گئی۔

مگر الٰہی بخش کو معلوم نہیں تھا کہ باپ کی عشق کی تلقین یادداشت کے آغاز سے بھی بہت پہلے سے اس کے ساتھ ہے۔ اس کی سماعت کے ایوان کا دروازہ پہلی بار اسی دستک سے کھلا تھا۔ اسے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ جب اس نے لکھنا سیکھا تو پہلے اپنے رب کا نام لکھا تھا۔ ہاں، اس کے باپ پیر بخش کو یہ سب کچھ یاد تھا۔

پیر بخش اس رات کو کبھی نہیں بھولا۔ وہ اس کی زندگی کی اہم ترین رات تھی۔

اس رات وہ بہت مضطرب تھا اور گھر کے صحن میں ادھر سے ادھر اور اُدھر سے اِدھر ٹہل رہا تھا۔ کبھی وہ چارپائی پر آ بیٹھتا اور کمرے کے بند دروازے پر نظریں جما دیتا۔ جانے کتنی دیر یہ عمل دہرایا گیا، تب کہیں کمرے کا دروازہ کھلا اور دائی رشیدہ باہر آئی۔

پیر بخش اٹھ کر اس کی طرف لپکا "آپا رشیدہ، خیر تو ہے نا۔" اس نے دائی سے پوچھا۔

"پہلا پہلا بچہ ہے نا، معاملہ بگڑا ہوا ہے۔ بس تو دعا کر پیر بخش" دائی نے کہا۔

"اللہ سب ٹھیک کرے گا آپا۔" پیر بخش نے بڑے یقین سے کہا۔ پھر بے تاب ہو کر بولا "آپا تم نے روئی تو رکھی ہے نا؟"

رشیدہ نے اسے یوں دیکھا، جیسے اس کے پاگل ہو جانے سے ڈر رہی ہو۔

"دیکھو آپا، میں نے بہت بڑی ذمے داری ڈالی ہے تم پر۔" پیر بخش نے گڑگڑا کر کہا۔ "پیدا ہوتے ہی اس کے کانوں میں روئی ٹھونس دینا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے، میں یہ کر لوں گی۔ پر تو زینب کے لئے دعا کر۔" رشیدہ نے کہا اور پلٹ کر کمرے میں چلی گئی۔

پیر بخش پھر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ مگر اب اس کے انداز میں اطمینان تھا۔

رات کے لمحے چپکے چپکے دبے پاؤں گزرتے رہے۔ پیر بخش بیٹھا اپنے رب سے خیر و عافیت مانگتا رہا۔ اس کے ہونٹ ساکت تھے مگر دھڑکن دعا بن گئی تھی۔ پھر کمرے سے ابھرنے والی کربناک نسوانی چیخوں نے اسے چونکا دیا۔ وہ پریشان ہو گیا۔ گھٹی گھٹی چیخوں کا وہ سلسلہ رک نہیں رہا تھا۔ اس نے چہرہ آسمان کی طرف کیا اور زیر لب دعا کرنے لگا۔ "مالک، جیسے تُو نے ہمیشہ میری مشکل آسان کی، اس بار بھی کر دے۔" اس نے اللہ کو پکارا "ربا تجھے تو سب معلوم ہے۔ نسلوں سے ہماری ایک آرزو ہے۔ وہ آرزو میرے دادے نے میرے باپ کو دی، میرے باپ نے مجھے دی اور میں اپنی اولاد کو دوں گا۔ تجھ سے اور تیرے پیارے نبیؐ سے محبت کی آرزو۔ پر ہم تو اس قابل ہی نہیں تھے۔ ہم تو تیری غلامی کے قابل بھی نہیں۔ ربا میں تیرا بھکاری، تیرے سامنے جھولی پھیلاتا ہوں۔ مجھے نصیب والی اولاد دے مالک، اسے وہ محبت دے، جس کی تڑپ مجھے میرے پرکھوں سے ملی ہے۔ جس کو میری نسلیں ترستی رہی ہیں۔ ہمارے بھاگ جگا دے مالک، میں اپنی اولاد کے لئے دنیا نہیں مانگتا۔ اللہ بادشاہ، مجھے تو سب جہانوں کی سب سے بڑی نعمت چاہئے....." وہ گڑگڑائے جا رہا تھا۔ اس کا چہرہ آسمان کی طرف تھا۔ آنکھیں فرطِ احترام سے بند تھیں اور اس کیفیت میں اسے یہ

احساس بھی نہیں تھا کہ بند آنکھوں سے راہ بنا کر بہنے والے آنسوؤں نے اس کے چہرے کو دھو دیا ہے۔

پھر وہ کیفیت دو آوازوں سے ٹوٹی۔ وہ یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ ان میں پہلی آواز کون سی تھی۔ شاید دونوں ساتھ ہی شروع ہوئی تھیں۔ ان میں ایک تو فجر کی اذان کی آواز تھی اور دوسری اس کے نومولود بیٹے کے رونے کی آواز۔ وہ دنیا میں اپنی آمد کا اعلان کر رہا تھا۔

آنسوؤں سے وضو کرنے والا پیر بخش روتے روتے مسکرایا۔ اس نے آنکھیں کھول کر بند دروازے کو دیکھا۔ وہ اس کی طرف پہلا بے تاب قدم بڑھانے ہی والا تھا کہ ٹھٹک گیا۔ واہ رے ناشکرے! اس نے خود کو ڈانٹا اور فوراً ہی قبلہ رخ ہو کے سجدہ ریز ہو گیا۔

اس وقت وہ سراپا شکر تھا۔ اس کی سانس، اس کی دھڑکن، جسم کا رواں رواں اللہ کا شکر ادا کر رہا تھا۔

دروازہ کھلا اور دائی رشیدہ مسکراتی ہوئی باہر آئی۔ "بیٹا مبارک ہو پیر بخش۔"

"خیر مبارک آپا رشیدہ۔" پیر بخش نے کرتے کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور اس میں جو کچھ تھا، نکال کر دائی کی طرف بڑھا دیا۔ "یہ لو آپا، جو بھی ہے تمہارا نصیب۔"

دائی رشیدہ نے بند مٹھی کو کھول کر دیکھا اور بولی۔ "یہ تو بہت زیادہ ہیں پیر بخش۔"

"میں نے کہا نا، تمہارا نصیب۔" پیر بخش نے کہا، پھر چونک کر پوچھا۔ "بچے کے کانوں میں روئی تو لگا دی ہے نا۔"

"ہاں لگا دی ہے۔" رشیدہ نے چڑ کر کہا۔ "پر تجھے بیوی کی نہیں، روئی کی فکر ہے!"

پیر بخش نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں۔ وہ بولا۔ "بچے کو لپیٹ کر لاؤ آپا۔ میں اسے لے کر جاؤں گا۔"

"کہاں لے کر جائے گا۔ اسے گھٹی دینی ہے ابھی۔ شہد چٹانا ہے۔"

"کچھ نہیں کرنا۔ اسے پہلے جانا ہے۔" پیر بخش نے جھنجلا کر کہا۔ "تم اسے جلدی سے لاؤ۔"

رشیدہ نے اسے یوں دیکھا، جیسے وہ سچ مچ پاگل ہو گیا ہو۔ اندر جا کر اس نے زینب سے بھی یہی کہا۔ زینب نے آنکھیں کھولیں اور گھبرا کر پوچھا۔ "خیر تو ہے کیا ہوا؟"

"بچہ مانگ رہا ہے۔ کہیں لے کر جائے گا۔"

زینب مسکرا دی۔ اس مسکراہٹ میں طمانیت اور فخر تھا۔ "لے جاؤ آپا۔ ضروری ہو گا، تبھی کہہ رہا ہے۔"

رشیدہ بچے کو لپیٹتے ہوئے بڑبڑائی۔ "مجھے سمجھ نہیں آتی تم لوگوں کی۔"

زینب مسکراتی رہی۔ کچھ بولی نہیں۔ رشیدہ بچے کو باہر لے گئی۔

پیر بخش نے سب سے پہلے بچے کے کان ٹٹولے۔ روئی دیکھ کر اسے اطمینان ہوا۔ اس نے بچے کو بڑی نزاکت سے اپنے ہاتھوں پر لیا اور تیز قدموں سے دروازے کی طرف بڑھا۔ گلیوں میں چلتے گزرتے اس کا شدت سے جی چاہا کہ بیٹے کا چہرہ دیکھے۔ مگر اس نے خود کو ڈانٹ دیا۔ "نہیں پیرو، ابھی نہیں۔ تو کون ہوتا ہے اسے پہلے دیکھنے والا۔"

گلی سے نکل کر کھیت کے کنارے چلتے ہوئے وہ بچے کا چہرہ دیکھنے کی پاگل خواہش سے لڑتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ منصب شاہ کے دروازے پر پہنچ گیا۔ اس نے دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔ اندر سے ایک مردانہ آواز نے پوچھا۔ "کون ہے بھئی۔"

"السلام علیکم باجی سرکار۔ میں ہوں پیر بخش۔"

دروازہ کھلا۔ منصب شاہ نے کہا۔ "اندر آ جا پیر بخش۔"

"نا باجی سرکار۔ میں یہیں ٹھیک ہوں۔ آپ کو تکلیف دینے آیا ہوں۔"

منصب شاہ باہر نکل آئے۔ "تکلیف کیسی۔ میں نے کہا تھا، تو آدھی رات کو بھی آ جانا۔ پر تیرا بچہ کسی کو تکلیف دے گا بھلا۔ دیکھ تو، فجر کے وقت

آیا ہے۔ بیٹا ہے کہ بیٹی؟"

"اللہ پاک کی نعمت ہے باجی۔ بیٹا ہے۔"

منصب شاہ نے ہاتھ پھیلائے۔ "لا..... اس کے کان میں اذان دوں۔"

"ایک منٹ باجی۔ اس کے کانوں سے روئی نکال لوں۔"

منصب شاہ حیرت سے اسے کانوں سے روئی نکالتے دیکھتے رہے۔ "یہ کیا۔"

"تاکہ اذان سے پہلے کان میں کوئی آواز نہ پڑے۔"

منصب شاہ نے بچے کو اذان سنانے کے بعد پیر بخش کی طرف بڑھایا۔ "یہ ایک اور احسان ہے شاہ جی سرکار آپ کا۔" پیر بخش بولا۔

"تو کب کسی کا احسان لیتا ہے پیر بخش۔ تو تو کسی کو سعادت دلوائے تو اسے بھی خود پر احسان سمجھتا ہے۔ جا پگلے، اللہ خوش رکھے تجھے۔"

بوڑھے منصب شاہ اسے جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔ ان کے ہونٹوں پر بڑی محبت بھری مسکراہٹ تھی۔

کھیت کے پاس سے گزرتے ہوئے پیر بخش نے بچے کے کان سے ہونٹ ملا دیے۔ "کہتے ہیں، بچے کو کان میں پڑی پہلی بات کبھی نہیں بھولتی۔ اذان تو نے سن لی۔ اب میری بات بھی سن لے۔" وہ کہتے کہتے رکا اور توقف کے اس لمحے میں اس نے اپنے بیٹے کے نام کا فیصلہ بھی کر لیا۔ "دیکھ پتر الٰہی بخش، جو تیرے دادے نے مجھ سے کہا تھا، میں تجھ سے کہتا ہوں۔ ہم گناہ گار، اللہ اور اس کے پیارے رسولؐ سے محبت کے قابل تو نہیں۔ پر اللہ کے تمام بندوں سے اور خاص آل رسولؐ سے تو عشق کر سکتے ہیں نا۔ بس پتر عمر بھر اسی رسی کو پکڑے رہنا۔ کیا پتا، وہ خوش ہو کر اپنے قابل ہی بنا دے۔ دیکھ الٰہی بخش، میری یہ بات کبھی نہ بھولنا پتر۔"..... اب اس سے صبر نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے جلدی سے بچے کا چہرہ دیکھا اور اس کی پیشانی چوم لی۔

وہ بیٹے میں اتنا گم تھا کہ اسے درخت کے نیچے وہ ملنگ بھی نظر نہیں آیا۔ اسے اس سے پہلے کسی نے دیکھا بھی نہیں تھا۔ پیر بخش کو یہ احساس بھی نہیں ہوا کہ اسے دیکھ کر ملنگ احتراماً اٹھ کھڑا ہوا ہے۔ ملنگ نے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ لیے تھے۔ وہ اس وقت تک کھڑا پیر بخش کو احترام اور عقیدت سے دیکھتا رہا، جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہیں ہو گیا۔

-----☆-----

پیر بخش کو ایک بہت بڑی خوشی اس وقت ملی، جب الٰہی بخش نے پہلی بار اللہ کا نام لکھا۔ حالانکہ اس وقت اسے لکھنا بھی نہیں آتا تھا۔ وہ صرف تین سال کا تھا۔

پیر بخش کام سے واپس آنے کے بعد صحن میں پڑی چارپائی پر بیٹھا تھا کہ الٰہی بخش بھاگتا ہوا گھر میں داخل ہوا۔ اس کے ایک ہاتھ میں پنسل تھی اور دوسرے میں ایک کاپی، جسے اس نے سینے سے لگایا ہوا تھا۔ دوسری چارپائی پر بیٹھنے کے بعد اس نے کاپی کھولی اور تیزی سے اس پر پنسل چلانے لگا۔ وہ بار بار دروازے کی طرف بھی دیکھ رہا تھا۔

اسی وقت دروازے سے دس سالہ بشارت لپکتا ہوا آیا۔ اس کے پیچھے اس کا باپ، پیر بخش کا چچیرا بھائی کریم تھا۔ "او بشارت، میری بات تو سن۔ ہوا کیا ہے؟" کریم کہہ رہا تھا۔

پیر بخش اٹھ کھڑا ہوا۔ بشارت اسے دیکھ کر رکا اور پھر شکایت کرنے لگا۔ "چاچا، یہ الٰہی بخش روز میری اسکول کی کاپی خراب کرتا ہے۔ مجھے مار پڑتی ہے اسکول میں۔"

"تو کیا ہوا۔ بھائی ہے تیرا۔" کریم نے جلدی سے کہا۔

"بھائی ہے تو میں اسے مار بھی سکتا ہوں۔ اسی کی وجہ سے میری مار لگتی ہے۔" بشارت الٰہی بخش کی طرف بڑھا، جس کے پنسل والے ہاتھ میں اور تیزی آ گئی تھی۔

باورچی خانے سے زینب بھی نکل آئی تھی۔ "کیا ہوا بشارت۔ کیا بات ہے بھائی جی۔"

"او کچھ نہیں زینبے۔ تیرے بیٹے کو لکھنے پڑھنے کا بڑا شوق ہے۔" کریم نے کہا، پھر الٰہی بخش کی طرف مڑا۔ "دکھا تو پتر۔ کیا لکھتا ہے تو۔"

"لکھتا کیا ہے۔ آڑی ترچھی لکیریں ڈالتا ہے کاغذ پر۔"

"اوئے تو چپ کر جا بشارت۔" کریم نے بیٹے کو ڈانٹا۔ پھر اس نے الٰہی بخش سے کاپی لے کر اس کا معائنہ کیا۔ پھر وہ پیر بخش کو دیکھ کر مسکرایا۔

"لے پیرو، مٹھائی کھلا بھئی، تیرے بیٹے کو لکھنا پڑھنا نہیں آتا، پھر بھی اس نے کچھ لکھ دیا ہے۔

"لے...... خود پڑھ لے۔" کریم نے کاپی اس کی طرف بڑھائی۔

"مجھے پڑھنا کہاں آتا ہے بھائی کریم۔"

"نہیں آتا۔ پر اس کا لکھا تو پڑھ لے گا۔"

پیر بخش نے کاپی لے کر دیکھا۔ پہلے تو اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ صفحے پر بے شمار آڑی ترچھی بے معنی لکیریں تھیں۔ پھر اچانک اسے نظر آیا اور صاف نظر آیا۔ درمیان میں چند لکیروں نے جڑ کر لفظ اللہ کی شکل اختیار کر لی تھی۔ اس کا دل شکر سے بھر گیا۔ اس کے چہرے پر خوشی اور آنکھوں میں آنسو تھے۔ یہ دو ہی نام ایسے تھے، جنہیں وہ پڑھ سکتا تھا...... اللہ اور محمدؐ۔

☆

گزرے وقت نے الٰہی بخش کو چار سال کی عمر کی چوکھٹ سے پار کرا دیا تھا۔ اس روز زینب صحن میں ٹنکی کے پاس بیٹھ کر برتن دھو رہی تھی کہ پیر بخش گھر میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں مٹھائی کا ڈبہ تھا اور چہرہ تمتما رہا تھا۔ اندر گھستے ہی اس نے مسرت بھرے لہجے پکارا۔ "زینب...... او زینبے......"

زینب نے سر اٹھا کر اسے دیکھا "کیا ہے بخشے کے ابا۔ یہ مٹھائی کیسی۔"

"برتن چھوڑ۔ ادھر آ پھر بتاتا ہوں۔"

زینب برتن چھوڑ کے ہاتھ دھونے لگی۔ پیر بخش نے پکارا۔ "بخشے...... او پتر بخشے جلدی سے آ۔"

"بتا دو نا۔ یہ مٹھائی کیسی ہے؟" زینب چارپائی کے پاس آ کھڑی ہوئی تھی۔

"صبر کر۔ ابھی بتاتا ہوں۔"

الٰہی بخش آیا تو پیر بخش نے زینب سے کہا "جا...... بیٹے کو وضو کرا جلدی سے۔ آج اس کی بسم اللہ ہے۔"

"پر آج ہی کیوں۔ بسم اللہ تو کسی دن بھی ہو سکتی ہے۔"

"کیسے ہو سکتی ہے۔ جاہل نری۔ اللہ پاک نے بچے کی تعلیم شروع کرنے کے لئے ایک عمر مقرر کی ہے۔ چار سال، چار مہینے، چار دن۔" پیر بخش نے جھنجلا کر کہا۔

زینب الٰہی بخش کا وضو کرا کے لائی اور اسے پیر بخش کے سامنے بٹھا دیا۔ الٰہی بخش کے سر پر ٹوپی بھی رکھ دی۔ الٰہی بخش حیران نظر آ رہا تھا۔

"بول پتر، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔" پیر بخش نے کہا۔

الٰہی بخش نے صاف آواز میں بلا اٹکے دہرا دیا۔

''اس کا مطلب بھی سمجھ۔'' پیر بخش نے کہا ''شروع اللہ کے نام سے جو بہت مہربان اور نہایت رحم والا ہے۔''

الٰہی بخش نے یہ بھی دہرا دیا۔

پیر بخش نے ڈبہ کھول کر مٹھائی کا ایک ٹکڑا بیٹے کے منہ میں رکھا۔ ''اللہ مبارک کرے پتر۔ یہ کھا اور ماں کا منہ میٹھا کرا۔''

یوں بسم اللہ ہو گئی۔ اس کے بعد پیر بخش نے کہا ''۔ اب بول پتر۔ الف سے اللہ۔''

''الف سے اللہ''۔

''اب بول م سے حضور پاکؐ......''

''م سے حضور پاکؐ......''

''اور یاد رکھنا۔ خالی حضور پاک کبھی نہیں کہتے۔ آگے بول صلی اللہ علیہ وسلم۔''

پیر بخش ٹکڑوں میں یہ سبق یاد کراتا رہا۔ پھر اس نے کہا ''۔ اب خود سے سنا پتر۔''

''الف سے اللہ۔ م سے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم۔'' الٰہی بخش نے اٹکے بغیر دہرا دیا۔

''شاباش پتر۔'' پیر بخش نے خوش ہو کر کہا۔ ''ہمیشہ یاد رکھنا۔ یہ پہلا سبق بھی ہے اور آخری بھی۔ نہ اس سے پیچھے کچھ ہے، نہ آگے کچھ۔ بیچ میں جو ہے، سو ہے، پر بیچ ہے۔ صبح اٹھ کر یہ سبق پڑھنا، رات کو یہ سبق پڑھ کر سونا۔''

''ٹھیک ہے ابا۔''

''اسکول میں داخلے تک یہی سبق یاد کرتا رہ۔ روز سنانا مجھے۔''

اور الٰہی بخش وہ سبق کبھی نہیں بھولا!

☆......☆......☆

اس روز گھر آتے ہوئے پیر بخش کو راستے میں کرم دین مل گیا۔ دونوں بڑے تپاک سے ملے۔ کرم دین نے کہا ''میں گھر ہی آ رہا تھا پیرو۔''

''کراچی سے کب آیا؟''

''کل ہی آیا ہوں۔''

دونوں ادھر ادھر کی باتیں کرتے ہوئے چلتے رہے۔ درخت کے پاس سے گزرتے ہوئے کرم دین ٹھٹکا۔ ''یہ کون ہے پیرو؟'' اس نے ملنگ کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''دیوانہ ہے کوئی۔'' پیر بخش نے کہا۔ ''چار سال سے اوپر ہو گئے۔ آیا اور یہاں جم کر بیٹھ گیا۔''

ملنگ نے اسی لمحے سر اٹھایا اور آسمان کو دیکھ کر کچھ بڑبڑانے لگا۔

''سلام علیکم باباجی۔'' کرم دین نے بلند آواز میں کہا۔

ملنگ اب سر جھکا کر بیٹھ گیا تھا۔ پیر بخش نے کہا ''آج تک کسی نے اس کی آواز نہیں سنی۔ سلام کا جواب بھی نہیں دیتا۔''

''جلالی معلوم ہوتا ہے۔''

''ایسا بھی نہیں ہے۔ شروع میں بچوں نے پتھر مارے پر اس نے اُف بھی نہیں کی۔ لوگوں نے کھانا بھی رکھا۔ پر اس نے ہاتھ بھی نہیں لگایا، کبھی کسی سے بات نہیں کی، کسی کو نظر اٹھا کر نہیں دیکھا۔ بس پھر لوگوں نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ آندھی ہو، یا بارش ہو، سردی ہو، یہ یہیں رہا۔ کبھی اس درخت کے نیچے سے نہیں ہٹا۔''

وہ دونوں آگے بڑھ گئے تھے۔ انہوں نے نہیں دیکھا کہ ملنگ اٹھ کر کھڑا ہوا۔ اس کے چہرے پر اضطراب تھا۔ اس نے آسمان کی طرف چہرہ اٹھایا اور مضطربانہ لہجے میں بڑبڑایا۔ ''پھر میں کیا کروں؟ تو جان۔ تیرے کام میں کون دخل دے سکتا ہے۔'' پھر وہ پرسکون ہو کر بیٹھ گیا۔

☆

الٰہی بخش باپ کا دیا ہوا سبق دہراتا رہا۔ پیر بخش سنتا اور خوش ہو کر اسے دعا دیتا۔ ''اللہ تجھے علم سے نوازے۔ خوش رہ پتر۔''

ایک دن الٰہی بخش نے کہا ''ابا آگے بھی پڑھاؤ نا۔ کتنے دن ہو گئے یہی پڑھتے۔ روز یہی سنتے ہو۔''

''یہ تو ساری حیاتی پڑھنا ہے پتر۔'' پیر بخش نے جواب دیا۔ ''بولا تھا نا، یہی پہلا سبق ہے اور یہی آخری ہے۔ اسے کبھی بھولنا نہیں۔''

''نہیں بھولوں گا ابا۔ پر......''

''کل سے تو اسکول جائے گا پتر۔'' پیر بخش نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''آگے وہ پڑھا دیں گے۔ پر میں کہتا ہوں، آگے کچھ ہے ہی نہیں۔''

سو الٰہی بخش اسکول چلا گیا۔ وہاں اسے ماسٹر جی ملے۔ یہ تو اس نے بعد میں جانا کہ ابا عشق کے معلم تھے اور ماسٹر جی علم کے۔

ماسٹر جی نے بچوں کو قاعدہ کھولنے کا حکم دیا اور کہا۔ ''بولو الف۔ ''

الٰہی بخش تیزی سے کھڑا ہوا۔ ''میں بتاؤں ماسٹر جی۔''

''بتاؤ۔'' ماسٹر جی نے شفقت سے کہا۔

''الف سے اللہ۔''

''بالکل ٹھیک۔'' ماسٹر جی بولے۔

''لیکن ماسٹر جی، کتاب میں تو انار بنا ہے۔'' ایک بچے نے اعتراض کیا۔

''ہاں اس لئے کہ اللہ کو کسی نے دیکھا نہیں ہے۔'' ماسٹر جی نے نہایت سکون سے کہا ''الف سے آم بھی ہوتا ہے، انار بھی اور انگور بھی۔ لیکن سب سے پہلے اللہ ہے۔ پڑھو الف سے اللہ۔ ''

وہ بچہ ضدی تھا، بولا ''میں تو کتاب سے ہی پڑھوں گا ماسٹر جی۔''

''تو پڑھ لو بیٹے۔ یہ تو اپنا اپنا نصیب ہے۔ ہاں بچو، پڑھو الف سے اللہ، الف سے انار۔''

اسکول کا سلسلہ چلتا رہا۔ اسکول میں ماسٹر جی پڑھاتے مگر الٰہی بخش باپ کا پڑھایا ہوا سبق دہرانا کبھی نہیں بھولا۔ اسکول جاتے اور گھر آتے ہوئے وہ اس درخت کے پاس سے گزرتا، جس کے نیچے ملنگ بیٹھا ہوتا تھا۔ الٰہی بخش کو کبھی پتا نہیں چلا کہ ملنگ اسے دیکھ کر ہمیشہ کھڑا ہو جاتا ہے اور اس وقت تک کھڑا رہتا ہے، جب تک وہ اس کی نظروں سے اوجھل نہیں ہو جاتا۔

اسکول میں ماسٹر جی حروف تہجی پڑھاتے رہے۔ کلاس ل سے لوتک پہنچ گئی۔ اس رات الٰہی بخش کو بخار ہو گیا۔ پیر بخش نے بیوی سے کہا ''آج اسے اسکول نہ بھیج زینب۔ کل تک ٹھیک ہو جائے گا۔''

اس دن گاؤں کے لوگوں نے ملنگ کو پہلی بار مضطرب دیکھا۔

درخت کے سامنے سے گزرتے ہوئے بچے اسکول جاتے رہے۔ لیکن ان میں الٰہی بخش نہیں تھا۔ معمول کا وقت بھی گزر گیا تو ملنگ اضطراب کے عالم میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ''کیا بات ہے، سرکار آئے نہیں؟'' اس نے سرگوشی میں خود کلامی کی۔ پھر خود ہی جواب دیا۔ ''آجائیں گے۔ آجائیں گے۔''

سورج نصف النہار پر آ گیا۔ بچے اسکول سے واپس آنے لگے۔ ملنگ اسی طرح کھڑا تھا۔ وہ پہلا موقع تھا کہ لوگوں نے اسے کھڑے دیکھا۔ وہ

بڑبڑا بھی رہا تھا لیکن آواز اتنی دھیمی تھی کہ کچھ سنائی نہیں دیتا تھا۔

شام ہوئی، سورج ڈھلا، رات ہو گئی، مگر ملنگ اسی طرح سینے پر ہاتھ باندھے کھڑا رہا۔ دیکھنے والوں نے بس یہیں تک دیکھا۔ یہ کسی کو معلوم نہیں ہوا کہ ملنگ نے پوری رات اسی طرح گزاری ہے۔

صبح کے وقت الٰہی بخش کے جانے کے بعد وہ اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ اب وہ پرسکون تھا۔

اسکول میں ماسٹر جی نے الٰہی بخش سے پوچھا "کل تم اسکول کیوں نہیں آئے؟"

"مجھے بخار تھا ماسٹر جی۔" الٰہی بخش نے جواب دیا۔ "اماں نے روک لیا۔"

خیر ہے۔ میں تمہیں پہلے کل کا سبق پڑھا دوں۔"

"وہ تو میں گھر پر پڑھ چکا ہوں ماسٹر جی۔" الٰہی بخش نے کہا۔

"تو سناؤ۔"

الٰہی بخش نے دونوں ہاتھ سینے پر باندھے اور بے حد خشوع و خضوع سے باپ کا پڑھایا ہوا سبق دہرایا۔ "م سے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم۔"

ماسٹر جی حیران رہ گئے۔ مگر پوری کلاس ہنسنے لگی۔ الٰہی بخش حیرت اور پریشانی سے چاروں طرف دیکھتا رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ہنسنے کی کیا بات ہے۔

ایک لڑکے نے الٰہی بخش سے کہا "بڑا قابل بنتا ہے۔ پر ہے جاہل۔"

"م سے حضور پاک نہیں ہوتا۔ مور ہوتا ہے پاگل۔" دوسرے نے کہا۔

سب بچے ہنسے جا رہے تھے۔ الٰہی بخش بے بسی سے ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

الف سے اللہ کی بات اور تھی۔ اس م کے معاملے میں ماسٹر جی بھی چکرا گئے۔ چند لمحے تو وہ کچھ سمجھ ہی نہیں سکے۔ پھر کلاس کی ہنسی نے انہیں اور کنفیوز کر دیا۔ مگر بات سمجھ میں آ گئی تو ان کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ انہوں نے بلند آواز میں کہا "خاموش ہو جاؤ۔"

کلاس میں سناٹا چھا گیا۔

"الٰہی بخش، تم چھٹی کے بعد میرے پاس آنا۔" انہوں نے الٰہی بخش سے کہا۔ پھر کلاس سے مخاطب ہوئے۔ "پڑھو، ن سے نارنگی، و سے ورق۔"

بچے بلند آواز میں دہرانے لگے۔ مگر الٰہی بخش بے آواز روئے جا رہا تھا۔

ہاف ٹائم میں بھی وہ اداس سا ایک طرف بیٹھا رہا۔ ایوب شاہ اور نواز شاہ اس کی طرف چلے آئے۔ ایوب شاہ نے استہزائیہ لہجے میں پوچھا "بخشو، گھر میں کون پڑھاتا ہے تجھے؟"

مگر الٰہی بخش سے پہلے نواز شاہ بول اٹھا۔ "او یہ جھوٹ بولتا ہے ایوب شاہ۔ اسے کون پڑھائے گا۔ بس اسے ماسٹر جی سے زیادہ قابل بننے کا شوق ہے۔"

"میرا ابو پڑھاتا ہے مجھے۔" الٰہی بخش کے لہجے میں بے بسی تھی۔

وہ دونوں ہنسنے لگے۔ "سن لیا نواز شاہ!" ایوب شاہ نے اپنے ساتھی سے کہا۔

"او بخشو جھوٹے۔" نواز شاہ بولا "تیرا ابا تو جاہل ہے۔ وہ کیا پڑھائے گا۔"

الٰہی بخش کی برداشت جواب دینے لگی۔ اس نے جھک کر پتھر اٹھایا تو وہ دونوں بھاگ گئے۔

☆

چھٹی کے بعد الٰہی بخش ماسٹر جی کے کمرے میں گیا۔ ماسٹر جی نے اسے بڑی محبت سے بٹھایا۔ چند لمحے وہ خاموش رہے۔ پھر بولے "بیٹا الٰہی بخش، جو تم نے آج کلاس میں پڑھا، آئندہ سب کے سامنے نہ پڑھنا"۔

"کیا وہ غلط تھا ماسٹر جی۔"

ماسٹر جی سوچ میں پڑ گئے۔ "توبہ توبہ یہ کون کہہ سکتا ہے۔" بالآخر انہوں نے کہا "تم شام کو میرے گھر آیا کرو۔ وہاں میں تمہیں پڑھاؤں گا بھی اور تمہارے سوال کا جواب بھی دوں گا۔"

"لیکن ماسٹر جی۔۔۔"

"اب تم جاؤ۔ کل شام سے میرے گھر پر آنا۔ میرا گھر معلوم ہے نا۔"

"جی ماسٹر جی۔" الٰہی بخش کمرے سے نکل آیا لیکن وہ بہت ناخوش تھا۔ اس کی تشفی نہیں ہوئی تھی۔

اس روز اسکول سے واپس آتے وقت الٰہی بخش مضمحل تھا۔ ہمیشہ کی طرح اچھلتا کودتا نہیں چل رہا تھا۔ وہ ملنگ والے درخت کے پاس سے گزرا تو ملنگ ہمیشہ کی طرح اٹھا اور سینے پر ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ ایسے موقع پر اس کے چہرے پر احترام کا تاثر ہوتا تھا۔

اچانک ملنگ خود کلامی کرنے لگا "ہار گئے سرکار انہیں پڑھاتے ہیں جو عشق کے عین سے بھی اتنا دور ہیں جتنا عرش سے زمین۔ دل چھوٹا نہیں کرتے سرکار۔ جو لکھا ہے، وہ تو ہو گا نا۔" لیکن اس وقت تک الٰہی بخش دور جا چکا تھا۔

☆

اس شام کام سے واپسی کے بعد چائے پیتے ہوئے پیر بخش نے بیوی سے پوچھا۔ "نیک بخت ۔۔۔ اپنا بخشو کدھر ہے؟"

"کمرے میں ہے۔ پتا نہیں کیوں، روئے جا رہا ہے۔ کچھ بتاتا ہی نہیں۔"

پیر بخش نے پیار سے اس کا سر تھپتھپایا "کیوں پتر۔ کیا بات ہے؟"

الٰہی بخش اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ "کچھ نہیں ابا۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"کچھ تو ہے۔ مجھے بتا۔"

پیر بخش اصرار کرتا رہا۔ الٰہی بخش اب اسے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اچانک بولا "ایک بات بتاؤ ابا۔ تم جاہل ہو۔"

پیر بخش کو صدمہ ہوا لیکن اس نے خود کو تیزی سے سنبھال کر کہا "ہاں پتر، جاہل تو میں ہوں"۔

"تو پھر تم نے مجھے وہ سبق کیوں پڑھایا؟"

"کون سا سبق؟" پیر بخش نے حیرت سے پوچھا۔

"وہی پہلا اور آخری سبق۔"

پیر بخش مسکرا دیا۔ "لو پتر، وہی ایک سبق تو مجھے آتا ہے۔"

"وہ غلط ہے ابا۔" الٰہی بخش نے غصے سے کہا۔

پیر بخش کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ "نا پتر، ایسا نہیں کہتے۔ وہ سب سے سچا سبق ہے۔" اس نے بڑے تحمل سے کہا "وہ ایمان کا سبق ہے"۔

"پر اسے ماسٹر جی نے بھی ٹھیک نہیں کہا۔"

پیر بخش چند لمحے سوچتا رہا۔ پھر گہری سانس لے کر بولا "یہ میرا حکم ہے پتر کہ وہ سبق کبھی نہیں بھولنا ہے۔ وہ تیرے دادے پردادے کا سبق ہے۔ تیرے لئے ہے۔ دوسروں کا مجھے نہیں پتا۔"

الٰہی بخش نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''آج سب بچوں نے میرا مذاق اڑایا ہے۔''

''تو پروانہ کر پتر۔ بس اسے ہمیشہ یاد رکھنا۔ حرف کتنے ہیں، مجھے نہیں پتا، پر میں نے تجھے سب سے میٹھے حرف، سب سے پاک نام پڑھائے ہیں اور میں نے کہا تھا نا کہ ان سے پہلے کچھ ہے، نہ بعد میں۔ ۔ ۔ ۔ اور بیچ میں جو ہے، سو ہے، پر بیچ ہے۔'' پیر بخش کے لہجے میں تحکم تھا، مضبوطی تھی۔

باپ بیٹے ایک دوسرے کو تولنے والی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ اسی وقت زینب کی پکار سنائی دی۔ ''سنو جی، ماسٹر جی آئے ہیں۔''

دونوں نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ زینب اب سامنے آگئی تھی۔ ''انہیں اندر بلایا؟'' پیر بخش نے پوچھا۔

''ہاں، چارپائی پر بٹھا دیا ہے۔ چائے بنا رہی ہوں۔ روٹی کا بھی پوچھ لینا۔''

''تو بیٹ، میں ماسٹر جی سے بات کرتا ہوں۔'' پیر بخش نے بیٹے سے کہا اور کمرے سے نکل آیا۔ ماسٹر جی پیر بخش کو دیکھ کر کھڑے ہونے لگے۔ پیر بخش نے جھپٹ کر انہیں بٹھا دیا ''کیوں گناہ گار کرتے ہیں ماسٹر جی اور آپ نے تکلیف کیوں کی۔ حکم کیا ہوتا، میں آپ ہی حاضر ہو جاتا۔''

''نا پیر بخش۔ بات یہ ہے کہ۔ ۔ ۔''

''غلطی میری ہے ماسٹر جی۔'' پیر بخش نے جلدی سے کہا ''میں نے اسے پڑھایا تھا۔ ۔ ۔''

''غلطی کیسی پیر بخش۔ تم نے تو اسے وہ پڑھایا، جو پڑھانا چاہیے۔''

پیر بخش نے حیرت سے انہیں دیکھا۔ ''آپ۔ ۔ ۔ آپ بچے کی شکایت لے کر نہیں آئے؟''

''نہیں بھئی۔ میں تو یہ کہنے آیا ہوں کہ الٰہی بخش کو ہر شام میرے گھر بھیج دیا کرو۔ بڑا ہونہار بچہ ہے۔ تم اس کی تعلیم مجھ پر چھوڑ دو۔ میں سمجھ گیا ہوں کہ تم کیا چاہتے ہو۔''

پیر بخش کا حوصلہ بڑھا۔ ''میں نہیں چاہتا ماسٹر جی کہ وہ بیچ کے حرفوں میں الجھے۔''

''تم بے فکر ہو جاؤ پیر بخش۔''

اگلے روز سے الٰہی بخش ماسٹر جی کے گھر پڑھنے لگا۔ ان کا گھر اسے بہت اچھا لگا۔ خاص کر ماسٹر جی کا کمرہ۔ وہاں الماری میں بہت ساری کتابیں تھیں۔ ماسٹر جی کی بیوی کو وہ خالہ کہتا تھا۔ وہ بھی اس پر بڑی شفقت کرتی تھیں۔

الٰہی بخش کو معلوم نہیں تھا کہ یہ بھی ایک کبھی نہ ٹوٹنے والا تعلق ہے۔

☆

الٰہی بخش ہمیشہ ماسٹر جی سے اصرار کرتا کہ اسے سبق کے بارے میں بتائیں مگر وہ اسے ٹال دیتے۔ ''وقت آنے پر سب سمجھا دوں گا۔'' وہ کہتے۔

''پر ماسٹر جی، یہ تو بتا دیں کہ ابا ٹھیک ہے یا غلط ہے۔'' وہ اصرار کرتا۔

''تمہارا ابا ٹھیک کہتا ہے۔ پر اس نے تمہیں وہ بات سمجھائی ہے جو ابھی تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی۔ اتنا آسان ہوتا تو میں سب بچوں کو نہ سمجھا دیتا۔ وقت آنے دو۔''

اور جب الٰہی بخش سات سال کا ہوا تو وہ وقت آگیا۔ اس شام ماسٹر جی نے اسے وضو کرنا سکھایا۔ پھر انہوں نے اسے ادب سے دو زانو بٹھایا اور بولے ''اب میں تمہیں تمہارے ابا کا سبق پڑھاتا ہوں۔ تمہاری سمجھ میں خود آجائے گا کہ وہ درست ہے۔''

الٰہی بخش کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ بھید کھلنے والا تھا۔

''بولو الٰہی بخش، ہم سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔''

اور الٰہی بخش کو یوں لگا جیسے اس کا سینہ، اس کا دماغ روشن ہو گیا ہے۔ بات یک لخت سمجھ میں آگئی۔ مگر پھر ایک اعتراض نے سر ابھارا۔ ''ابا نے یہ

پڑھایا ہوتا تو لڑکے میرا مذاق تو نہ اڑاتے۔" اس کے لہجے میں شکایت تھی۔

"تمہارا ابا عاشق ہے۔ احترام کے اصولوں سے واقف ہے۔" ماسٹر جی نے اسے سمجھایا۔ "یہ وہ نام مبارک ہے کہ اسے بے وضو زبان پر لانا گستاخی ہے اور جب یہ نام سنو تو درود شریف پڑھو۔ احترام سے کھڑے ہو جاؤ۔ احترام کی حد کر دو۔ کچھ سمجھے؟"

الٰہی بخش کچھ سمجھا اور کچھ نہیں سمجھا۔

ماسٹر جی بہت سمجھدار تھے۔ "یہ سبق ضروری تھا۔ اور تم بے وضو تھے۔ اس لئے تمہارے باپ نے نام لئے بغیر حضور پاک ﷺ کہہ کر تمہیں سکھایا۔"

الٰہی بخش کو پتا بھی نہیں چلا کہ وہ احترام اس کی بے خبری میں اس کے وجود کی گہرائیوں میں بیٹھ گیا ہے۔ ہاں اس کی سمجھ میں یہ ضرور آ گیا کہ باپ اور ماسٹر جی اس کی تعلیم کے دو ضلعے ہیں۔ باپ جو کچھ تھوپتا ہے، ماسٹر جی اسے آسان کر کے کھتے ہیں۔ وہ ترجمان ہیں۔

اس وقت الٰہی بخش کو معلوم نہیں تھا کہ تعلیم عشق کا ایک تیسرا ضلع بھی ہے!

☆

پیر بخش کو فرمان شاہ نے کہا تھا کہ آ کر ان کی بھینس کے لئے چارہ کاٹ دے۔ اس شام پیر بخش ان کے ہاں کترا کرنے چلا گیا۔ وہاں بانڈی کے باہر لوگ جمع تھے۔ وہ صالح محمد کے متعلق باتیں کر رہے تھے۔ دو دن پہلے اس کے مکان کی چھت گر گئی تھی۔ پیر بخش سر جھکائے کترا کر رہا تھا۔

دینو نے کہا۔ "یہ سب ملنگ کی وجہ سے ہوا ہے۔"

"وہ کیسے؟" کسی نے پوچھا۔

"صالح محمد نے ملنگ سے کہا تھا، سردی آ رہی ہے بابا، اس کی فکر بھی کر لے۔ تو ملنگ بولا... تو اپنے گھر کی فکر کر، مرمت کرا لے، اور اسی رات صالح محمد کی چھت گر گئی۔"

"مجذوبوں سے تو الجھنا ہی نہیں چاہئے۔" فرمان شاہ بولے۔ "ان کے منہ سے نکلی بات ٹلتی نہیں۔"

"ہاں جی، وہ تو اللہ نے کرم کیا، سب بچ گئے۔"

"سب اللہ کے بھید ہیں۔ صالح محمد کو اس سے کہنا ہی نہیں چاہئے تھا۔ سب کو معلوم ہے کہ ملنگ نے اس پیڑ کے نیچے سات سردیاں اور بارشیں گزاری ہیں۔ وہ تو اللہ لوک ہے، اسے کیا پروا موسم کی۔"

"اور کیا۔" خیر دین بولا۔ "اب یہی دیکھیں کہ کسی کو معلوم نہیں کہ وہ کھاتا کیا ہے اور کھانا کہاں سے ملتا ہے اسے۔"

"یہی دیکھو بابا جی۔ برسوں سے وہیں بیٹھا ہے۔" مختار نے کہا۔ "ہلتا بھی نہیں کبھی۔ ایسے تو آدمی کا جسم ہی بے کار ہو جائے۔ چلنے پھرنے کے قابل بھی نہ رہے۔"

"ایک بات بتاؤں بابا جی۔" دینو نے کہا۔ "یہ اپنے پیر بخش کا پتر ہے نا... الٰہی بخش..."

اس پر پیر بخش کے کان کھڑے ہوئے مگر وہ پہیہ گھماتا رہا۔

"کیا ہوا اسے؟" فرمان شاہ نے پیر بخش کو کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"وہ جب بھی درخت کے پاس سے گزرتا ہے، ملنگ کھڑا ہو کر سینے پر ہاتھ باندھ لیتا ہے اور جب تک الٰہی بخش دور نہ چلا جائے، ایسے ہی کھڑا رہتا ہے۔" دینو نے بتایا۔

"او یار، اتفاق ہو گا۔" فرمان شاہ نے کہا۔

"نہیں بابا جی۔ میں نے بہت دفعہ دیکھا ہے۔"

"چھوڑو اس بات کو" فرمان شاہ نے ناگواری سے کہا۔

موضوع بدل گیا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ کترا کرتے ہوئے پیر بخش نے چند لمحے اس پر غور کیا۔ پھر فضول جان کر اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔

☆

ملنگ نے پہلی بار الٰہی بخش سے براہِ راست رابطہ کیا تو اس وقت الٰہی بخش بارہ سال کا تھا۔

ایوب شاہ اور نواز شاہ کو الٰہی بخش سے ابتدا ہی سے بیر تھا اللہ واسطے کا بیر۔ اس روز الٰہی بخش اسکول سے واپس آ رہا تھا۔ ایوب شاہ اور نواز شاہ اس کے پیچھے پیچھے تھے۔ انکے ہاتھوں میں درختوں سے ٹوٹی ہوئی ٹہنیاں تھیں اور وہ سازشی انداز میں ایک دوسرے سے سرگوشیاں کر رہے تھے۔

الٰہی بخش ملنگ والے درخت کے پاس سے گزرا۔ ملنگ ہمیشہ کی طرح اپنے مخصوص انداز میں سینے پر ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ اسی وقت ایوب اور نواز شاہ پیچھے سے دوڑتے ہوئے آئے اور الٰہی بخش کو سوٹی مارتے ہوئے تیزی سے آگے نکل گئے۔

الٰہی بخش کا چہرہ غصے سے تمتما اٹھا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور جھپٹ کر ایک پتھر اٹھا لیا۔ اس نے انہیں مارنے کے لیے پتھر والا ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ کانوں میں باپ کی آواز کی بازگشت ابھری۔ "نا پتر — پھینک دے۔" لہجے میں تحکم تھا۔

الٰہی بخش زور لگاتا رہا لیکن اس کا پتھر والا ہاتھ جیسے پتھر کا بن گیا۔ وہ دانتوں سے ہونٹ چبانے لگا۔ بے بسی اور جھنجلاہٹ سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ اسی طرح بے بس کھڑا رہا اور جب ایوب اور نواز شاہ دور نکل گئے تو اس کا ہاتھ آزاد ہوا۔ مگر وہ اب بھی غضب ناک ہو رہا تھا۔ اس نے قریب کی کچی دیوار پر پتھر مارا کہ اچھی خاصی مٹی جھڑ گئی۔

اسی وقت کسی نے بے حد میٹھی سے اسے پکارا۔ "غصہ نہ کریں سرکار۔"

اس نے چونک کر دیکھا۔ ملنگ ہاتھ باندھے نظریں جھکائے کھڑا تھا۔ الٰہی بخش کو یقین نہیں آیا کہ ملنگ نے اسے پکارا ہے۔ وہ تو کسی سے بولتا ہی نہیں تھا۔

مگر اسی لمحے ملنگ کے ہونٹ پھر ہلے۔ "آئیں سرکار، کبھی غریب خانے پر بھی عنایت کر دیں۔ میرے پاس بیٹھیں نا پل دو پل۔"

الٰہی بخش سحر زدہ سا اس کی طرف بڑھ گیا۔ ملنگ نے اس کا ہاتھ چوما اور بولا۔ "تشریف رکھیں سرکار۔ غصہ نہ کیا کریں۔"

الٰہی بخش کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "یہ دونوں بہت ستاتے ہیں مجھے۔"

"مراتبہ کھوٹا کرنے کی کوشش کرتے ہیں سرکار جی۔ پر نہیں کر سکیں گے۔"

"تم تو کسی سے بات نہیں کرتے بابا جی۔" الٰہی بخش کو اچانک خیال آیا۔

"سرکار، آپ کی بات اور ہے۔"

اب کے الٰہی بخش کو احساس ہو گیا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ اس نے غصے سے کہا۔ "مذاق اڑاتے ہو میرا۔ یہ کیسے بات کر رہے ہو مجھ سے؟"

ملنگ اپنے رخسار پیٹنے لگا۔ "توبہ سرکار۔ میری مجال ہے۔"

"تو پھر یہ آپ ... یہ سرکار..."

"آپ کا مرتبہ جانتا ہوں نا۔"

"میرا مرتبہ ..." "سرکار، آپ عاشق ہیں، میں بھی ہوں، پر دل کی زبان گھس گئی نام جپتے جپتے۔ قبولیت نہیں ہوئی۔ آپ تو سرکار نصیب والے ہیں۔"

الٰہی بخش پھر کر کھڑا ہو گیا۔ باپ تلقین کرتا تھا عشق کی اور اب ملنگ اعلان کر رہا تھا۔ "میں عاشق نہیں بنوں گا۔ مجھے نہیں کرنا عشق۔ مجھے نفرت ہے عشق سے... محبت سے۔"

"اس کا حکم کہاں ٹلتا ہے سرکار۔" ملنگ نے آسمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

الٰہی بخش پر دہشت طاری ہو گئی۔ وہ وہاں سے بھاگا۔ اس کی زبان پر بس یہی تھا۔ نہیں کرنا مجھے عشق۔ وہ یہ دہراتا ہوا اندھا دھند بھاگتا رہا۔

"وہ جن کے پیروں میں بھنور باندھ دے، وہ نہیں بھاگ سکتے سرکار جی۔" ملنگ نے سرگوشی میں کہا اور بیٹھ گیا۔

☆

یہ عشق سے نفرت اور باپ کی... نہ پتھر، پتھر پھینک دے... کی پکار ایک حوالے سے تھی۔ اس سلسلے میں الٰہی بخش کی پہلی یاد وہی ایسی تھی، جو اس کے ذہن سے کبھی محو نہیں ہوئی۔ وہ اس وقت پانچ ساڑھے پانچ سال کا ہو گا۔ وہ گندم کے کھیت کے سامنے کچھ بچوں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ ان میں تین بچے سادات کے بھی تھے۔ کھیل کھیل میں ایوب شاہ اور نواز شاہ نے بے ایمانی شروع کر دی۔ اس نے اس پر احتجاج کیا تو دونوں نے مل کر اس کی پٹائی کر دی۔ ایک تھپڑ ایسا لگا کہ اس کی نکسیر پھوٹ گئی۔ تکلیف کا احساس تو نہیں ہوا لیکن اس کی نظر دھار کی شکل میں گرتے ہوئے خون پر پڑ گئی۔ اس نے آستین سے ناک صاف کرنے کی کوشش کی تو آستین خون میں تربتر ہو گئی۔ بس پھر کیا تھا، اس پر جنون طاری ہو گیا۔ اس نے نظریں جھکا کر زمین پر ادھر اُدھر دیکھا۔ پھر وہ زمین پر پڑے ایک پتھر کی طرف جھپٹا۔

ادھر وہ دونوں بھی بہتا ہوا خون دیکھ کر دم بخود رہ گئے تھے۔ وہ خوف زدہ نظروں سے خون کو دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے اسے پتھر اٹھاتے دیکھا... لیکن درحقیقت نہیں دیکھا۔ وہ یوں بت بنے کھڑے تھے کہ پتھر لگنے تک تو ان کی سحر زدگی ٹوٹنے والی نہیں تھی۔

مگر پتھر لگنے کی نوبت ہی نہیں آئی!

الٰہی بخش کا پتھر والا ہاتھ بلند ہوا، نیم قوس کی شکل میں پیچھے کی طرف گیا اور آخری مرحلے میں آگے کی سمت لپک ہی رہا تھا کہ جیسے پتھر کا سا ہو گیا۔ اس کے پورے جسم کی قوت اس وقت تک استعمال میں آ چکی تھی، چنانچہ شدید جھٹکا لگا۔ اس کا پورا جسم ہل کر رہ گیا۔ سوائے پتھر والے ہاتھ کے، کہ وہ بڑی مضبوط گرفت میں تھا۔ اس کا جسم آگے کی طرف گیا اور پھر ردعمل کے طور پر پیچھے ہٹا۔ ذرا سنبھلنے کے بعد اس نے سر گھما کر دیکھا۔ اس کا پتھر والا ہاتھ ابا کی گرفت میں تھا۔

وہ ہاتھ چھڑانے کے لئے زور لگاتا رہا۔ لیکن ابا کی نگاہوں میں جتنی نرمی تھی، گرفت میں اس سے زیادہ سختی تھی۔

"ابا... چھوڑ دو مجھے۔" وہ چلایا۔ "میں ان کا سر پھاڑ دوں گا۔"

"نا بالکے۔ پتھر پھینک دے۔" ابا نے بہت شیریں لہجے میں کہا۔

"ابا، انہوں نے مجھے مارا ہے۔ یہ خون دیکھو۔" اس نے فریاد کی۔ پتھر اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔

"میں دیکھ رہا ہوں۔ تو پتھر تو چھوڑ۔ پھر میں کچھ کرتا ہوں۔"

کچھ کرتا ہوں، سے الٰہی بخش کو آس تو بندھی لیکن وہ ہچکچا رہا تھا۔ پتھر اس نے اب بھی نہیں چھوڑا۔

"تو میری بات نہیں مانے گا؟" باپ نے اس پر آنکھیں نکالیں۔

اس بار ننھے الٰہی بخش نے پتھر ہاتھ سے چھوڑ دیا۔ باپ نے فوراً ہی اسے گود میں اٹھایا اور گھر کی طرف دوڑ لگا دی۔ گھر میں گھستے ہی وہ صحن میں لگے ہینڈ پمپ کی طرف لپکا۔ اس نے الٰہی بخش کو بٹھایا اور خود ہینڈ پمپ چلانے لگا۔ ٹھنڈا پانی الٰہی بخش کے سر پر گرا تو وہ اچھلا۔ وہ بھاگنے ہی والا تھا کہ باپ نے ڈپٹ کر کہا "بیٹھا رہ۔ ابھی خون رک جائے گا۔"

ماں آوازیں سن کر کمرے سے نکلی تو یہ منظر دیکھ کر ان کی طرف جھپٹی۔ ''کیا ہوا..... یہ کیا ہوا؟؟''

''کچھ نہیں۔ کھیل میں چوٹ لگ گئی ہے۔ نکسیر پھوٹی ہے۔ تم جلدی میں پانی لے کر اس کی ناک میں ڈالو۔''

ذرا دیر میں خون رک گیا مگر اس وقت تک الٰہی بخش کے کپڑے بھیگ چکے تھے اور اسے سردی لگ رہی تھی ''چل..... اندر چل۔'' باپ نے اس کا ہاتھ تھاما اور کمرے کی طرف چلا ''تم اس کے کپڑے نکالو۔'' اس نے بیوی کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

الٰہی بخش کو کپڑے بدلوانے کے بعد ماں نے اس سے پوچھا ''اب یہ تو بتا، ہوا کیا تھا؟؟''

''اماں، وہ کھیل میں بے ایمانی کر رہے تھے۔ میں نے منع کیا تو دونوں نے مل کر مجھے مارا۔'' الٰہی بخش نے بسورتے ہوئے کہا۔ وہ دکھ اور شرمندگی سے نڈھال ہو رہا تھا۔ دکھ اس بات کا نہیں تھا کہ اسے چوٹ لگی۔ دکھ یہ تھا کہ وہ بدلہ نہیں لے سکا۔ اس کی آنکھوں میں پھر آنسو آ گئے۔

''وہ کون تھے وہ دونوں تو مجھے بتا۔ میں ان کی خبر لوں گی۔'' ماں بپھر گئی۔

''ایوب شاہ اور نواز شاہ۔'' اس نے بتایا۔

نام سنتے ہی ماں کو بھی سانپ سونگھ گیا۔ پھر وہ سنبھل کر بولی ''تو بیٹھ۔ میں تیرے لئے دودھ لاتی ہوں۔''

ننھے الٰہی بخش کی مایوسی کی کوئی حد نہیں تھی۔ باپ نے تو اسے مایوس کیا ہی تھا لیکن ماں تو ان کی خبر لینے جا رہی تھی۔ پھر اسے کیا ہو گیا؟ ان کے نام سنتے ہی اس کا رویہ کیوں بدل گیا۔ اس سوچ کے ساتھ ہی اسے غصہ آنے لگا۔ اس نے سوچا کہ اسے ہی کچھ کرنا ہو گا اور یہ مشکل بھی نہیں تھا۔ موقع تو ضرور ملے گا۔ بس پھر وہ پتھر اٹھائے گا اور.....

''بیٹے، یہ خیال دل سے نکال دے۔'' باپ کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ وہ جیسے اس کی سوچیں پڑھ رہا تھا۔

''کیا ابا.....؟''

''وہی جو تو سوچ رہا ہے۔''

اتنی دیر میں ماں دودھ کا پیالہ لے آئی تھی۔ ''لے..... یہ پی لے۔''

الٰہی بخش نے پیالہ لینے کے لئے ہاتھ نہیں بڑھایا ''میں دودھ نہیں پیوں گا اماں۔'' اس نے جواب دیا۔ وہ اس وقت کچھ پینا چاہتا تھا تو صرف ان دونوں لڑکوں کا خون، جنہوں نے اس کے ساتھ زیادتی کی تھی۔

''پی لے بیٹا۔'' ماں کے لہجے میں اصرار تھا۔

الٰہی بخش نے جیسے ماں کی بات سنی ہی نہیں۔ ''میں انہیں نہیں چھوڑوں گا اماں۔ میں بدلہ ضرور لوں گا۔''

''بالکے، میں نے کہا نا، یہ خیال دل سے نکال دے۔'' اس بار باپ کا لہجہ بہت سخت تھا۔

''نہیں ابا۔ میں نہیں چھوڑوں گا انہیں۔ آج تو تم نے مجھے روک دیا لیکن میں.....''

باپ کا ہاتھ اٹھا لیکن ماں نے اسے روک دیا۔ وہ اسے مستفسرانہ نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

''یہ پتھر اٹھا کر انہیں مارنے والا تھا۔ وہ تو میں پہنچ گیا، ورنہ غضب ہو جاتا۔''

الٰہی بخش کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا غضب ہو جاتا۔ انہیں نے اس کا خون نکالا تھا۔ وہ پتھر مارتا تو ان کا بھی خون بہتا۔ اس میں غضب کی کون سی بات تھی!

''تم اسے پیار سے سمجھاؤ نا۔'' ماں نے بہت دھیرے سے کہا۔

پیر بخش کی سمجھ میں بیوی کی بات آ گئی۔ سختی سے تو نفرت پیدا ہوتی تھی اور پھر وہ ہر وقت، ہر پل تو اس کی چوکیداری نہیں کر سکتا تھا۔ پیار سے سمجھانے ہی میں بہتری تھی۔ اس نے الٰہی بخش کو کھینچ کر سینے سے لگایا، خوب پیار کیا اور پھر اسے گود میں بٹھا لیا ''دیکھ میرا بیٹا، تو پہلے دودھ پی

لے۔ پھر میں تجھے سمجھاؤں گا۔"

بپھرے ہوئے شیر جیسا الٰہی بخش باپ کے بوسوں سے بھیگ کر ایک دم بکری بن گیا۔ دودھ پینے کو اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن باپ کے اصرار پر اس نے پی لیا۔ ماں خالی پیالہ واپس لے گئی تو باپ نے بات شروع کی "دیکھ بیٹے، یہ باجی لوگ ہیں نا یہ ہمارے پیارے نبی کی اولاد ہیں اور پیارے نبیؐ پر جان، مال اور اپنا سب کچھ قربان کر دینا ہم پر فرض ہے۔ ہماری زندگی کا مقصد ان سے محبت کرنا ہے۔ تو سمجھ رہا ہے نا؟"

الٰہی بخش نے سر کو تفہیمی جنبش دی۔ یہ تو وہ اب تک سمجھ چکا تھا، باپ اسے یہ باتیں بہت پہلے سے سمجھاتا رہا تھا۔

"تو باجی لوگوں کی اور ان کی اولاد کی عزت کرنا، ان سے محبت کرنا ہمارا فرض ہے۔"

"چاہے وہ ہمارے ساتھ زیادتی کریں؟" الٰہی بخش نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں!" باپ نے مستحکم لہجے میں کہا "یوں ہم عزت کریں تو کون سا کمال ہوگا۔ ہاں زیادتی سہہ کر بھی ان کی عزت کریں تو اللہ بھی خوش ہوگا اور اس کا رسول بھی اور اللہ خوش ہو تو انعام بھی دے گا۔"

"ابا باجی لوگوں کو پولیس بھی نہیں پکڑ سکتی۔" الٰہی بخش کے معصوم ذہن نے ایک اور سوال اٹھایا۔

"تو ان چکروں میں نہ پڑ بیٹے۔ ہمیں تو صرف اپنی دیکھنی چاہیے۔ دنیا کی باتیں دنیا جانے ہم تو بس نبی کی اولاد کے خادم ہیں۔ اب تو سوچ کہ ان پر ہاتھ اٹھائیں گے تو گستاخی ہوگی نا۔ اسی لئے میں نے تیرا ہاتھ پکڑا تھا۔ دیکھ بیٹے، اللہ اور اس کے رسول کو کبھی ناراض نہ کرنا۔"

الٰہی بخش خاموش بیٹھا رہا۔ بات اب بھی اس کے حلق سے نہیں اتری تھی۔

"وعدہ کر کہ اب کبھی ایسا نہیں کرے گا۔ بدلہ لینے کا خیال بھی دل میں نہیں لائے گا۔"

الٰہی بخش ہچکچاتا رہا۔ وہ اپنے دل کو ٹٹول رہا تھا جس میں تلخی ہی تلخی تھی۔ پھر اچانک ایک حیرت انگیز تبدیلی آئی۔ اس کے ننھے سے دل میں درگزر کی نمی پھوٹی اور لمحوں میں جیسے پتھر موم ہو گیا۔ "ٹھیک ہے ابا! پھر میں انہیں معاف کر دیتا ہوں۔"

باپ کے چہرے کی رنگت متغیر ہو گئی "یہ بھی گستاخی ہے باؤلے۔ ایسی بات زبان پر نہیں لاتے۔ دل میں بھی نہیں سوچتے۔ بس بات ختم کر دیتے ہیں۔"

باپ کے لہجے کی سختی نے اسے ڈرا دیا۔ "ٹھیک ہے ابا!" اس نے آہستہ سے کہا۔

☆

اس وقت وہ چھوٹا تھا۔ اسے بحث کرنی نہیں آتی تھی۔ بڑا ہوا تو وہ بحث کرنے لگا۔ اس کا باپ پڑھا لکھا تو نہیں تھا لیکن جواب دینے اسے خوب آتے تھے۔ اس کے پاس وہ دانش تھی جو صرف عشق سے آتی ہے۔

ایسی ہی ایک بحث کے دوران الٰہی بخش نے کہا "ابا، یہ سادات کچھ کرتے ہوئے اپنے نام و نسب کا لحاظ کیوں نہیں کرتے؟"

باپ نے نظریں اٹھا کر اسے گھورا "کیا مطلب ہے تیرا؟"

"میں یہ کہہ رہا ہوں ابا کہ زیادہ تر ان کا عمل لائق احترام نہیں ہوتا۔ وہ برے کام کیوں کرتے ہیں۔ برائی میں کیوں ملوث ہوتے ہیں؟"

"دیکھ بیٹے! آدمی اپنے اعمال پر نظر رکھے تو اسے کبھی دوسروں کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنے کی ہمت بھی نہیں ہوتی۔ تو اپنے اعمال پر نظر رکھا کر بیٹے۔ قیامت کے دن کیا اللہ سے یہ کہے گا کہ مجھ سے زیادہ گناہ تو فلاں شخص نے کیے تھے۔ دیکھ، حساب تو آدمی کو صرف اپنا دینا پڑے گا۔" ایک اور موقع پر الٰہی بخش نے کہا "ابا، تم عشق کی بات بہت کرتے ہو، کہتے ہو زندگی کا مقصد عشق ہونا چاہئے عشق اللہ سے اور اس کے رسولؐ سے۔ یہ تو بتاؤ، یہ عشق کیا چیز ہے۔ مشکل ہے کہ آسان ہے۔ مجھے محبت بہت آسان لگتی ہے۔ کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی، ہو جاتی ہے تو ہو جاتی ہے۔ نہیں ہوتی تو نہیں ہوتی۔ مگر اتنا بڑا مسئلہ تو نہیں لگتا یہ، جتنا تم اسے بتاتے ہو۔"

باپ کے چہرے پر نرمی ہی نرمی بکھر گئی۔ آنکھوں میں جیسے گہری سوچ اتر آئی۔ "میں تو جاہل آدمی ہوں بیٹے، پر آپ ہی آپ یہ باتیں سمجھنے کی کوشش کرتا رہتا ہوں۔ اس کو سمجھنے کے لئے کتابیں پڑھنے کی ضرورت بھی نہیں ہوتی۔ یہ عشق تو آدمی کے اندر ہوتا ہے نا۔ بس اس کے لئے خود کو سمجھنا اور تبدیل کرتے رہنا ہوتا ہے۔" وہ کہتے کہتے رکا اور بظاہر سامنے والی دیوار پر کچھ دیکھنے لگا لیکن لگتا تھا کہ وہ بہت دور دیکھ رہا ہے "عشق تو بیٹے آسان ہے بہت ہی آسان۔ یہ تو ہو جاتا ہے۔ پر عشق کرتے رہنا عشق کیے جانا بہت مشکل ہے۔ عشق کے تقاضے پورے کرنا بالکل آسان نہیں۔ اس کیلئے تو اپنا آپ مارنا پڑتا ہے۔"

"تم ہمیشہ مجھے اللہ اور رسولؐ سے عشق کی نصیحت کرتے ہو ابا۔ تم خود بھی تو کرتے ہونا؟"

"ہاں، کرتا ہوں۔" باپ نے گہری سرد آہ بھرتے ہوئے کہا "لیکن جیسے کرنا چاہئے، ویسے نہیں کر پاتا۔ بس خلوص سے، سچے دل سے کوشش کیے جاتا ہوں۔"

"پر یہ کیسے ہوتا ہے ابا۔ اس سے عشق کیسے ہو سکتا ہے جسے دیکھا ہی نہ ہو۔"

"بیٹے اپنے وجود سے غور کرنا شروع کر۔ پیدا ہوا تو تو کیڑے جیسا تھا۔ اپنے لئے کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ نہ اپنی حفاظت، نہ زندگی کا اہتمام رب نے تیرے حفاظت کی، تجھے پالا، تجھے دو ہاتھ دیئے، دو ٹانگیں دیں کام کرتی ہوئی دو آنکھیں دیں، بینائی دی، عقل دی، تجھے ایک مکمل انسان بنایا کوئی کمی، کوئی محرومی تیرے لئے نہیں چھوڑی، سب سے بڑھ کر یہ کہ تجھے مسلمان کے گھر پیدا کیا تا کہ تجھے حق کی تلاش میں بھٹکنا نہ پڑے۔ یہ سب احسان تجھ پر اس نے کیے، جو بے نیاز ہے جسے کسی سے غرض نہیں، اسے کسی سے کچھ نہیں چاہئے اور اتنے احسانوں کے بعد اس نے بھلائی کا راستہ دکھا کر تجھ پر احسان کیا۔ اب یہ بتا کہ جواب میں تو کیا کرے گا؟"

الٰہی بخش کچھ دیر سوچتا رہا۔ سوال مشکل تھا۔ سوچتے سوچتے ذہن منتشر ہوا جا رہا تھا۔ وہ اپنی سوچوں کو یکجا کرنے کی کوشش کر رہا تھا "میں اللہ کے احکامات پر عمل کرنے کی کوشش کروں گا۔ نماز پڑھوں گا، عبادت کروں گا، اس کے بتائے ہوئے سیدھے راستے پر چلوں گا۔ اس کا شکر ادا کروں گا۔"

"یہ بھی تو اللہ کا احسان ہوگا تجھ پر۔" باپ نے کہا "اس لئے کہ یہ سب کچھ کرنا تیرے ہی لئے فائدہ مند ہوگا۔ پھر بتا کہ تو نے کیا کیا۔ کچھ بھی تو نہیں، یاد رکھ، توفیق بھی اللہ ہی دیتا ہے۔"

"تو اور میں کیا کر سکتا ہوں؟" الٰہی بخش نے بے بسی سے کہا۔

"محبت کر۔ محبت کے سوا کیا کر سکتا ہے۔ اللہ کی غلامی تو فرض ہے۔ اس کا حکم بجا لانے میں تو اپنی ہی فلاح ہے۔ ہاں، محبت اس کے لئے

ہے..... سمجھا کچھ؟"

"سمجھ تو گیا ابا، پر محبت کی تو نہیں جاتی، ہو جاتی ہے۔"

"ٹھیک کہتا ہے، لیکن محبت بھی بے سبب کبھی نہیں ہوتی۔ کبھی یہ ہمدردی کی وجہ سے ہوتی ہے، کبھی اس کا سبب کوئی خواہش ہوتی ہے، کبھی آدمی محبت کی طلب میں محبت کرتا ہے، یہ سوچ کر کہ اسے جواب میں محبت ملے گی اور کبھی آدمی کسی کے احسانات کی وجہ سے محبت کرتا ہے۔ تیرے پاس محبت کا سبب تو موجود ہے۔ محبت کا سامان تو کر۔"

"کیسے کروں ابا؟"

"ہر وقت خدا کے احسانات یاد کیا کر۔ غور کیا کر کہ ہر سانس خدا کی عنایت ہے۔ یوں دل میں شکر گزاری پیدا ہوگی۔ پھر تو بے بسی محسوس کرے گا کہ اتنے احسانات کا شکر کیسے ادا کیا جا سکتا ہے۔ وہ بے بسی تیرے دل میں محبت پیدا کرے گی۔ تو سوچے گا کہ مالک نے بغیر کسی غرض کے تجھے اتنا نوازا، تجھ سے محبت کی۔ تو غور کر کہ اتنی بڑی دنیا میں کروڑوں انسانوں کے بیچ تو کتنا حقیر ہے۔ سینکڑوں کے مجمع میں بھی تیری کوئی پہچان نہیں۔ کوئی تجھ پر دوسری نظر بھی نہیں ڈالے گا۔ کسی کو پروا نہیں ہوگی کہ کوئی الٰہی بخش بھی ہے لیکن تیرا رب کروڑوں انسانوں کے بیچ بھی تجھے یاد رکھتا ہے، تیری ضروریات پوری کرتا ہے، تیری بہتری سوچتا ہے اور تجھے اہمیت دیتا ہے۔ ان سب باتوں پر غور کرتا رہے گا تو تیرے دل میں خدا کی محبت پیدا ہو گی۔ اس محبت کے ساتھ بھی یہ کچھ سوچتا رہے گا تو محبت میں گہرائی پیدا ہوگی اور تجھے خدا سے عشق ہو جائے گا۔"

"لیکن ابا، اللہ سے محبت کا طریقہ کیا ہے؟" الٰہی بخش نے پوچھا "کیا اس سے یہ کہتا رہوں کہ مجھے تجھ سے محبت ہے۔"

"یہ تو انسانوں سے کہنا پڑتا ہے ... کیونکہ وہ کچھ نہیں جانتے لیکن وہ تو سب کچھ جانتا ہے۔ اس سے دل کا حال چھپا نہیں۔ صرف محبت کرتے رہو، وہ جان لے گا۔ جہاں تک طریقے کا تعلق ہے تو ہم جیسے حقیر بندوں کے لئے اس نے فرمایا ہے کہ مجھ سے محبت کرنی ہے تو میرے بندوں سے محبت کرو۔ یعنی بغیر کسی غرض کے ہر انسان سے صرف اس لئے محبت کرو کہ وہ بھی اللہ کا بندہ ہے۔" باپ کہتے کہتے رکا اور مسکرایا "اب تو سمجھ رہا ہے نا۔ اللہ کو اپنے آخری رسول خاتم الانبیاء سے خاص محبت ہے۔ بے پناہ محبت ہے۔ ہم اللہ سے محبت کرتے ہیں تو ہم پر عشق رسول بھی لازم ہوا نا۔ عشق نہ کہیں رکتا ہے، نہ کبھی ختم ہوتا ہے۔"

"اور رسولؐ سے عشق ہم کیسے کریں گے؟"

"ہم نے اللہ سے محبت کی تو ہمیں اس سے عشق تو کرنا پڑے گا، جو اللہ کو سب سے پیارا ہے۔ اور اس سے عشق کرنے کے لئے ہمیں اس کا احترام کرنا ہوگا۔ اسے درود بھیجتے رہو، اس کے اسم مبارک پر احتراماً کھڑے ہو جاؤ۔ اس کی سنت طیبہ کی پیروی کی کوشش کرو اور آخری بات یہ اصول کہ جو بھی اسے پیارا ہو، اسے اپنی جان سے پیارا سمجھو، اسی بنیاد پر تو ہم اللہ کے عشق سے رسولؐ کے عشق تک پہنچتے ہیں۔"

الٰہی بخش نے سر کو تفہیمی جنبش دی۔ بات اب اس کی سمجھ میں آ رہی تھی۔

"اب یہ بتا کہ انسان کو سب سے پیارا کون ہوتا ہے؟" باپ نے سوال اٹھایا۔

"اپنے ماں باپ" الٰہی بخش نے بلا جھجک کہا۔

"ٹھیک کہا تو نے۔" باپ مسکرایا "لیکن جس چیز کا تجربہ نہیں ہے، وہ تو کیسے کہہ سکتا ہے۔ وہ میں تجھے بتاتا ہوں۔ ماں باپ کے علاوہ انسان کو اولاد سب سے پیاری ہوتی ہے۔ یہ تو خود اللہ نے ہمیں بتایا ہے۔"

"کیسے ابا؟"

"حضرت ابراہیمؑ اللہ کے بہت عظیم عاشق تھے۔ آپ سے اللہ تعالیٰ نے عزیز ترین چیز کی قربانی طلب فرمائی اور آخر میں ثابت ہوا کہ وہ آپ کے فرزند حضرت اسماعیلؑ تھے۔"

"ٹھیک ہے ابا۔"

"تو ہم پیارے رسولؐ سے عشق کرنا چاہیں تو ضروری ہوا نا کہ ان کی اولاد کو اپنی جان سے زیادہ چاہیں اور یہ باجی لوگ رسول کی اولاد ہیں بیٹے۔"

الٰہی بخش حیران رہ گیا۔ اس کا باپ زیادہ بولنے والا نہیں تھا۔ وہ تو بہت کم بات کرتا تھا۔ پڑھا لکھا بھی نہیں تھا مگر کہاں سے گھما پھرا کر اسے اپنے مطلب کی بات پر لے آیا تھا۔ بات مدلل تھی لیکن الٰہی بخش کے دل اور ذہن نے قبول نہیں کی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ وہ اللہ اور رسول سے بلاواسطہ عشق بھی تو کر سکتا ہے لیکن یہ بات اس نے ابا سے نہیں کہی۔ وہ اور لیکچر سننے کے موڈ میں نہیں تھا۔

"میں جانتا ہوں کہ میں اولادِ نبیؐ پر اپنی جان بڑی آسانی سے قربان کر سکتا ہوں۔" باپ نے کچھ توقف کے بعد کہا۔ "لیکن میری دعا ہے کہ کبھی وقت آئے تو میں اولادِ رسولؐ پر اپنی اولاد بھی قربان کر سکوں۔ مگر جانتا ہوں کہ اس کے لئے بڑا دل چاہئے اور وہ اللہ ہی دے سکتا ہے۔" اس آخری جملے نے الٰہی بخش کو اور باغی بنا دیا۔ اسے احساس ہونے لگا کہ باپ اس سے محبت نہیں کرتا اور قربانی کے جانور سے زیادہ اس کی وقعت بھی نہیں ہے۔ اسے لفظ عشق سے ہی چڑ ہو گئی۔ وہ سادات سے بچنے لگا۔ ان کے بچوں کے ساتھ کھیلنا تو اس نے بچپن میں ہی چھوڑ دیا تھا۔

لیکن ایوب شاہ اور نواز شاہ نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا۔

☆

ماسٹر جی کی بیٹی حاجرہ الٰہی بخش سے چار سال چھوٹی تھی۔ وہ ابتدا ہی سے عجیب طبیعت کی تھی۔ چپ چپ، گم صم رہنے والی مگر آنکھوں سے لگتا کہ اندر روشنی بہت ہے۔ لطف یہ کہ وہ روشنی آگ کا تاثر نہیں دیتی تھی، بلکہ ٹھنڈک کا احساس دلاتی تھی۔

اور حاجرہ الٰہی بخش کو بہت کثرت سے تکتی تھی۔ اس کی نگاہوں میں وارفتگی ہوتی مگر وہ بولتی بہت کم تھی۔ اور بولتی تو لہجے میں احترام ہوتا۔ الٰہی بخش اس وقت سے اس کی نگاہوں کا عادی تھا، جب وہ بچی تھی، اسی لئے اسے حاجرہ کے انداز میں بھی کبھی کوئی غیر معمولی پن محسوس نہیں ہوا۔

الٰہی بخش، ماسٹر جی کے گھر میں گھر کے فرد کی طرح آتا تھا۔ ماسٹر جی کا کمرہ اسے بہت پسند تھا۔ اس کا بڑا سبب کتابیں تھیں۔ اسے قدرتی طور پر کتابوں سے بڑی محبت تھی۔ جب پڑھنے کے قابل نہیں تھا تو وہ بیٹھا الماری میں سلیقے سے رکھی کتابوں کو محبت اور عقیدت سے تکتا (۔بعد میں تو خیر اس نے تمام کتابیں چاٹ ڈالی تھیں۔)

ایسے ہی ایک دن وہ سحر زدہ سا بیٹھا کتابوں کو دیکھے جا رہا تھا، اسے پتا بھی نہیں تھا کہ سات سالہ حاجرہ کمرے میں آتے آتے دروازے پر ہی رک گئی ہے اور اسے اپنے مخصوص والہانہ انداز میں تکے جا رہی ہے۔

مگر نگاہوں کی اپنی ایک تپش ہوتی ہے، جو احساس دلا کر رہتی ہے۔ الٰہی بخش کو بھی احساس ہو گیا۔ اس نے سر گھما کر حاجرہ کو دیکھا اندر آ جاؤ نا حاجرہ۔" اس نے کہا۔

حاجرہ کی نظریں جھک گئیں "۔جی۔۔۔ جی۔۔۔ بس ٹھیک ہے۔"

"کیسی ہو تم؟"

جی ٹھیک ہوں۔"

اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ الٰہی بخش پھر کتابوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ مگر چند لمحے بعد ہی حاجرہ کی آواز نے اسے چونکا دیا "آپ کو کتابیں بہت اچھی لگتی ہیں؟"

"ہاں ۔۔۔ بہت زیادہ۔" الٰہی بخش نے دھیرے سے کہا۔

"مجھے بھی۔" حاجرہ نے شرمیلے لہجے میں کہا "میں الماری ہر روز صاف کرتی ہوں۔ کتابیں جھاڑتی ہوں خاص طور پر۔"

الٰہی بخش کو اس پر پیار آ گیا۔ واقعی اس نے الماری پر اور کتابوں پر کبھی گرد کا ایک ذرہ بھی نہیں دیکھا تھا۔

ماسٹر جی بیٹی کو پڑھانا چاہتے تھے لیکن حاجرہ نے صاف انکار کر دیا۔ ''ابا جی مجھے قرآن پاک اور دینیات کے سوا کچھ نہیں پڑھنا۔''

ماسٹر جی متاسف ہو گئے۔ ان کی بیٹی اور پڑھنے سے انکار۔ ''کتابوں سے اتنی محبت کرتی ہو اور پڑھنے سے انکار؟''

''ابا جی۔ میں بس ان سے محبت، ان کی عزت کرنا چاہتی ہوں۔ ان کا خیال رکھتی ہوں۔ ان پر گرد نہیں جمنے دیتی۔ بس۔''

ماسٹر جی کی سمجھ میں یہ تو نہیں آیا کہ بیٹی اس انداز میں اپنی الٰہی الٰہی بخش سے محبت کی نوعیت بیان کر رہی ہے لیکن وہ اتنا سمجھ گئے کہ یہ کوئی اہم بات ہے۔ پھر انہوں نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔

الٰہی بخش حاجرہ کو گائے جیسا بے زبان اور سادہ سمجھتا تھا۔ مگر ایک دن اس کی غلط فہمی دور ہو گئی۔ حاجرہ تیز و طرار اور غصہ ور بھی تھی اور اس کی زبان کی کاٹ بھی بہت گہری تھی۔

ان دنوں وہ میٹرک کرنے کے بعد نوکری کی تلاش میں تھا، جس کا ملنا ناممکن ہی تھا۔ اس روز وہ ایک درخواست جمع کرانے کے بعد واپس آ رہا تھا کہ اس کی نظر حاجرہ پر پڑی۔ وہ نلکے پر بیٹھی گھڑا بھر رہی تھی۔ کچھ دور ایوب شاہ اور نواز شاہ بیٹھے تھے۔

نواز شاہ نے ہنستے ہوئے پانی میں شرارت سے کنکر اچھالا۔ چھینٹیں اڑ کر حاجرہ کے چہرے تک گئیں۔ اس نے غضب ناک نظروں سے انہیں دیکھتے ہوئے چہرے کو پونچھا۔

پرانے حریفوں نے شاید الٰہی بخش کو آتے دیکھ لیا تھا، اسی لئے وہ بلند آواز میں زبانی چھینٹے بازی کرنے لگے ''لے بھئی، نواز شاہ۔ قسمت جاگ گئی اپنی۔''

''ہاں بھئی... آج تو پیار سے دیکھ رہی ہے۔'' نواز شاہ بولا۔

حاجرہ نے بڑی نفرت سے انہیں دیکھا اور بولی ''میں کنکر کے جواب میں پتھر مارتی ہوں۔ اور پانی میں نہیں، سر پر مارتی ہوں۔''

''ہمیں تو وہ بھی پھول بن کر لگے گا۔'' ایوب شاہ نے کہا۔

''لو، کمشنر صاحب بھی آ گئے۔'' نواز شاہ نے الٰہی بخش کی طرف اشارہ کیا۔

اس پر حاجرہ نے بھی سر گھما کر الٰہی بخش کو دیکھا۔ پھر نلکا بند کر دیا۔ گھڑا بھر چکا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے گھڑا اٹھایا مگر اسے سر پر نہیں رکھا۔ ایسے ہی اٹھائے ہوئے ایوب اور نواز شاہ کی طرف بڑھی۔ وہ دونوں اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ''سر پر رکھوا دوں؟''

ایوب شاہ نے پیشکش کی۔

''ضرور۔'' حاجرہ نے کہا۔

''گھڑا اٹھتا نہیں، بات پتھر کی کرتی ہے۔'' نواز شاہ نے اسے چھیڑا۔

''گھڑا ہی تو نہیں اٹھتا، پتھر کا تم خود دیکھ لینا کسی دن۔'' حاجرہ نے سنجیدگی سے کہا اور پانی سے بالب بھرا گھڑا ہاتھ سے چھوڑ دیا۔ گھڑا دونوں لڑکوں کے پیروں پر گرا اور ٹوٹ گیا۔ دونوں لڑکے چیخنے اور ناچنے لگے۔ پیروں پر بہت زور کی چوٹ لگی تھی۔

الٰہی بخش اس وقت ان تک پہنچ گیا تھا۔ دونوں لڑکے اچھل رہے تھے اور حاجرہ انہیں ملامت بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ پھر وہ کاٹ دار لہجے میں بولی ''چلو بھر پانی میں کیسے ڈوبو گے۔ گھڑے بھر پانی سے تو پاؤں بھیگتے ہیں تمہارے۔ تمہیں تو کنواں چاہئے ... اندھا کنواں۔'' یہ کہہ کر وہ پلٹی اور چل دی۔

دونوں لڑکے اب بھی اچھلے جا رہے تھے۔

حاجرہ جاتے ہوئے پلٹی۔ ''کچا گھڑا تھا، ٹوٹ گیا۔ کل سے گھڑیا لاؤں گی تانبے کی۔ کاش لوہے کی گھڑیا بھی ہوا کرتی!'' پھر وہ چلی گئی۔

الٰہی بخش گھر جانے کے بجائے ماسٹر جی کے گھر چلا گیا۔ دروازے پر حاجرہ آئی۔ ماسٹر جی بھی کہیں گئے ہوئے تھے اور خالہ بھی۔ "ماسٹر جی سے ضروری بات کرنا تھی۔ چلو پھر آ جاؤں گا۔"

الٰہی بخش نے کہا۔

"آج پڑھیں گے نہیں، آ جائیں نا۔" حاجرہ کے لہجے میں التجا تھی۔

الٰہی بخش ہچکچایا۔

حاجرہ نے اور لجاجت سے اصرار کیا "آ جائیں نا، باہر دھوپ بہت ہے۔"

اس کے لہجے کی التجا نے الٰہی بخش کا دل چھو لیا "ہاں۔ اندر کتابوں کی چھاؤں بھی ہے" اس نے کہا اور اندر چلا گیا۔

وہ ماسٹر جی کے کمرے میں جا بیٹھا۔ حاجرہ بھی دروازے پر آ کھڑی ہوئی "چائے لاؤں آپ کے لئے؟" اس نے پوچھا۔

"رہنے دو۔ جی نہیں چاہ رہا ہے۔" الٰہی بخش نے کہا۔

حاجرہ نے ہچکچاتے ہوئے کہا "ایک بات پوچھوں۔"

"ضروری ہو تو پوچھ لو۔" الٰہی بخش نے خشک لہجے میں کہا۔

"ابا سے کیا ضروری بات کرنی ہے آپ کو؟"

"ہے ایک بات۔"

"مجھ سے نہیں کر سکتے؟"

"کر سکتا ہوں۔ کرنی بھی چاہئے۔" الٰہی بخش نے کہا پھر تند لہجے میں بولا "تم پانی بھرنے مت جایا کرو۔"

"کیوں؟"

"میں ان بے جی لوگوں سے الجھنا نہیں چاہتا۔ ابا کو دکھ ہوگا۔"

حاجرہ مسکرانے لگی "آپ کو تنی فکر ہے میری؟"

الٰہی بخش گھبرا گیا "صرف تمہاری نہیں، مجھے گاؤں کی ہر لڑکی کی فکر ہے۔"

"تو سارے گاؤں کی لڑکیوں کو پانی بھرنے سے منع کرو۔" اب کے حاجرہ کے لہجے میں بے تکلفی تھی۔

"وہ کسی کے ساتھ ایسا کریں گے تو ضرور کروں گا۔ میرے لئے سب برابر ہیں"۔ الٰہی بخش نے کہا پھر آہ بھر کر بولا "پر وہ صرف تمہارے ساتھ ایسا کرتے ہیں۔ کسی اور کو تنگ نہیں کرتے۔"

"کیوں۔ کبھی یہ بھی سوچا" حاجرہ نے تیز لہجے میں کہا۔

"کیوں!" الٰہی بخش نے حیرت سے دہرایا۔

"وہ جانتے ہیں کہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو۔"

الٰہی بخش کو غصہ آ گیا۔ وہ اور محبت کا قیاس۔ اسے تو نفرت تھی محبت سے۔ اس کا لہجہ درشت ہو گیا "جو بھی یہ سوچے، وہ پاگل ہے۔ مجھے تو نفرت ہے عشق اور محبت سے۔" وہ بولا "اور یہ بھی بتا دو کہ تمہارا کیا خیال ہے۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔"

"تم غلطی پر ہو۔" الٰہی بخش نے نرم لہجے میں کہا "دیکھو حاجرہ، میں تمہیں دکھ نہیں دینا چاہتا۔ مگر جو اپنے رب سے، اس کے پیارے رسولؐ سے محبت نہ کر پائے، وہ کسی اور سے کیا محبت کرے گا۔ تم دکھ کے راستے پر نہ چلو۔"

حاجرہ کے ہونٹوں پر بجھی بجھی مسکراہٹ ابھری ''میں ابا جی کی بیٹی ہوں۔ کوئی آرزو نہیں کرتی۔ میں محبت کرتی ہوں۔ یہ میرے لئے بہت کافی ہے۔'' یہ کہتے کہتے اس کی نظریں جھک گئی تھیں مگر پھر ایک ثانیے میں جیسے اس کے اندر کوئی کیمیاوی تبدیلی پیدا ہوئی۔ اس نے نظریں اٹھائیں اور مضبوط لہجے میں بولی ''تم میری فکر نہ کرو۔ میں جو سمجھوں، سمجھنے دو۔ تم سے کچھ نہیں مانگوں گی کبھی۔ دینے والی بس اللہ کی ذات ہے اور جو وہ دے، وہ کوئی چھین بھی نہیں سکتا۔''

''میں چاہتا ہوں کہ تم پانی بھرنے نہ جایا کرو۔'' الٰہی بخش نے اپنی بات دہرائی۔

''تم میری فکر نہ کرو۔ میں تمہاری طرح ان کے احترام پر مجبور نہیں ہوں۔ اس سے اچھی طرح نمٹ سکتی ہوں۔''

''تمہاری مرضی۔''

الٰہی بخش کچھ دیر بعد وہاں سے نکل آیا۔ اسے حاجرہ سے چڑ محسوس ہو رہی تھی۔ محبت سے نفرت کرنے والے پر محبت کا قیاس کرنے کی جرأت اس نے کی کیسے!

☆

باپ کی یہ بات الٰہی بخش کے دل میں پھانس بن کر چبھی تھی کہ وہ اسے آلِ نبیؐ پر قربان کرنا چاہتا ہے اور اس کے لئے دعا کرتا ہے۔ وہ باپ کے جذبے کو نہ سمجھ سکا اور اسے اپنی بے وقعتی پر محمول کیا۔ اس نے سمجھا کہ ابا کو اس سے ذرا بھی محبت نہیں ہے جبکہ وہ ابا سے بہت محبت کرتا ہے۔ حالانکہ محبت سے اسے نفرت ہے۔ لیکن اماں اور ابا سے محبت اس کی مجبوری ہے۔

یہ باپ سے اس کی محبت ہی تھی جس نے اس کے دل میں موت کی خواہش پیدا کر دی۔ اس کا جی چاہتا کہ وہ سادات میں سے کسی کے ہاتھ سے مارا جائے تاکہ ابا خوش بھی ہو اور اللہ کے حضور سرخرو بھی۔ ماہر نفسیات یہی کہہ سکتے ہیں کہ اس کے اندر خودکشی کا رجحان پیدا ہو گیا تھا۔

دوسری طرف وہ میٹرک کرنے کے بعد پریشان تھا۔ ملازمت اسے مل نہیں رہی تھی۔ ابا کا کہنا تھا کہ رنگ کا کام شروع کر دے مگر اس میں اسے تعلیم کی توہین محسوس ہوتی تھی۔ ابھی دو دن پہلے ماسٹر جی نے اس سلسلے میں اسے سمجھایا تھا اور قائل بھی کر لیا تھا۔ یہ ماسٹر جی کا کمال تھا۔ ابا کی بات اس کی سمجھ میں نہ آتی لیکن ماسٹر جی اس بات کو اس طرح سمجھاتے کہ اس کی عقل اسے درست تسلیم کر لیتی۔

عشق کے معاملے میں بھی یہی ہوا تھا۔ جو تلقین ابا کرتا، ماسٹر جی اسے درست ثابت کر دیتے چنانچہ اس کی عقل نے ابا کے فلسفۂ عشق کو تسلیم کر لیا لیکن دل نہ مانا اور عشق اور محبت سے نفرت ختم نہ ہوئی۔ ہاں، کم ضرور ہو گئی۔

اس شام اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب ابا کے ساتھ رنگ کے کام پر جائے گا۔ اس فیصلے کے بعد وہ پرسکون ہو گیا تھا۔ مگر عشق کے خلاف مزاحمت کا اضطراب بدستور موجود تھا۔ ایسی کیفیت میں اسے تنہائی اچھی لگتی تھی چنانچہ وہ پہاڑی پر چلا گیا اور چیڑ کے گھنے درخت کے نیچے جا بیٹھا۔ اپنی سوچوں میں گم وہ اپنے پیروں کے پاس سے گھاس کی پتیاں نوچ نوچ کر نیچے پھینکتا رہا۔ وہ ایسا گم تھا کہ اسے ایوب اور نواز شاہ کی آمد کا پتا بھی نہیں چلا۔ وہ آئے اور پتلی پگڈنڈی سے ذرا اوپر بیٹھ گئے۔ الٰہی بخش اوپر بیٹھا تھا۔ دونوں نے عادتاً چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔

''او بھائی ایوب، یہ کمشنر ہر وقت پریشان کیوں رہتا ہے؟'' نواز شاہ نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔

''پریشان تو رہے گا۔'' ایوب شاہ نے کہا۔ ''آخر فرسٹ ڈویژن میں میٹرک کیا ہے اس نے۔''

''ہونا تو یہ تھا کہ گورنر گھر پر آتا اور ہاتھ جوڑ کر اس سے کہتا... سر، اب کمشنر کا عہدہ آپ سنبھال لیں۔ پر ایسا ہوا نہیں۔''

''او یار، اسے کوئی چپراسی بھی نہیں بنائے گا۔'' نواز شاہ نے کہا ''پر ہے بندہ قابل۔''

''ہاں۔ عرضیاں اچھی لکھ لیتا ہے۔''

''رائٹنگ بھی اچھی ہے۔ پر یار، کچھ بولتا نہیں۔''

"اونچا سنتا ہے۔ نہیں نیچا سنتا ہے" ایوب شاہ نے زہریلے لہجے میں کہا۔ "عزت کی بات نہیں سنائی دیتی۔ ہاں، ڈانٹ سن لیتا ہے۔"

"ابھی تجربہ کر لیتے ہیں۔" نواز شاہ نے کہا اور سر اٹھا کر الٰہی بخش کی طرف رخ کر کے چلایا "او کشنر، پھینکتا ہے تو ہم پر پھول پھینک۔ گھاس کیوں پھینکتا ہے۔"

الٰہی بخش نے چونک کر دیکھا۔ پہلی بار اسے ان کی موجودگی کا احساس ہوا تھا۔ لیکن اس نے جواب نہیں دیا۔ اسی لمحے دور سے پیر بخش کی پکار سنائی دی "الٰہی بخش... او بخشو۔"

الٰہی بخش اٹھا۔ پگڈنڈی پر چل کر نیچے آیا۔ نچلی پگڈنڈی بہت پتلی تھی۔ اسکے نیچے کم از کم ہزار فٹ گہری کھائی تھی۔ اسکے عین اوپر ایوب شاہ اور نواز شاہ بیٹھے تھے۔ الٰہی بخش کو انکے پاس سے گزر کر جانا تھا۔ ان تک پہنچنے سے پہلے الٰہی بخش نے ایک کنکر کو ٹھوکر ماری۔ کنکر نیچے لڑھکتا گیا۔ اگر میں بھی ایسے ہی لڑھکوں تو نیچے پہنچنے تک زندہ بچوں گا؟ الٰہی بخش نے دل میں سوچا۔ پھر اس نے ہزار فٹ نیچے کھڑے ابا کو دیکھا، جو تنکا سا نظر آ رہا تھا۔

الٰہی بخش پتلی پگڈنڈی پر چلتے ہوئے ایوب شاہ اور نواز شاہ کے لٹکے ہوئے پیروں کے پاس سے گزرا۔ اچانک وہ رکا اور اس نے سر اٹھا کر ان دونوں کو دیکھا "کیا بات ہے پیرو۔ ٹانگ نہیں اڑائی تھی تو ہلکا سا دھکا دے دیتے۔ قصہ نمٹ جاتا" اس نے انہیں چیلنج کیا "خیر، اب بھی موقع ہے۔"

"پر تیرا باپ تو دیکھ رہا ہے۔" نواز شاہ نے کہا۔

الٰہی بخش تمسخرانہ انداز میں ہنسنے لگا "مجھے نہیں جانتے۔ میرے باپ کو بھی نہیں جانتے۔ ارے تم پر الزام آتا تو ابا خود تمہارے حق میں گواہی دیتا۔ کہتا کہ میں اس کے سامنے گرا ہوں پھسل کر اور تم بے قصور ہو۔"

"کیوں بے کشنر، مرنا چاہتا ہے؟" ایوب شاہ نے پوچھا۔

"ہاں، تمہارے ہاتھوں مرنا چاہتا ہوں۔ جانتا ہوں کہ یہ حرام موت ہوگی۔ پر ابا خوش ہو جائے گا کہ بیٹا قربان ہو گیا!"

"کیا بک رہا ہے؟" نواز شاہ نے گھبرا کر کہا۔

"تم نہیں سمجھو گے۔ یہ دل کے معاملے ہیں۔" الٰہی بخش نے ہنس کر کہا۔

اسی وقت پیر بخش کی پکار پھر ابھری "الٰہی بخش... او بخشو... جلدی سے آ۔"

"چلتا ہوں، پر تمہاری بزدلی سے مایوسی ہوئی۔" الٰہی بخش نے کہا اور پتلی پگڈنڈی پر دوڑنے لگا۔

ایوب شاہ اور نواز شاہ اس کی بے پروائی کا مظاہرہ دیکھتے رہے۔ پھر نواز شاہ نے فکر مندی سے کہا "بھائی ایوب، میری بات مان، اب اس کا پیچھا چھوڑ دے۔"

ایوب شاہ کے لہجے میں گھبراہٹ تھی "ٹھیک کہتا ہے تو نواز۔ یہ تو دیوانہ ہوتا جا رہا ہے۔"

"احتیاط نہیں کی تو یہ کسی دن خود مر کے ہمیں مروا دے گا۔"

"ہاں بھائی۔ دیوانے تو خطرناک ہی ہوتے ہیں۔"

نیچے پیر بخش نے الٰہی بخش سے پوچھا "اتنی دیر کیوں لگائی۔ اور باتیں کس سے کر رہا تھا؟"

"ابا، میں پلک جھپکتے میں تمہارے پاس پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا پر قسمت اور سادات نے ساتھ نہیں دیا۔"

پیر بخش کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا "جلدی سے گھر چل۔ دیکھ، میں تیرے لئے نئے برش لے کر آیا ہوں۔"

الٰہی بخش باپ کے ساتھ چل دیا۔ اسے پتا نہیں تھا کہ اب ایوب شاہ اور نواز شاہ ہمیشہ اس سے خوفزدہ رہیں گے۔ موت کی آرزو کرنے والوں سے سب ڈرتے ہیں!

☆......

آنے والے چند برسوں میں الٰہی بخش رنگ کا بہت اچھا کاریگر بن گیا مگر اس کے ذہن سے یہ خیال نہیں نکلا کہ ابا کے نزدیک اس کی حیثیت بس قربانی کے جانور جتنی ہے۔ یہاں تک کہ وہ واقعہ پیش آ گیا۔ پہلے تو اسے ایسا لگا کہ ابا کی دعا قبول ہو گئی ہے لیکن بہر حال وہ بچ گیا۔ زندہ رہا، البتہ سر سے پیشانی کے وسط تک زخم کا وہ بدنما نشان اسے ہمیشہ اس واقعے کی یاد دلاتا اور بے وقعتی کا احساس جگاتا رہا۔

اس واقعے کے بعد اس نے باپ سے کہا" ابا میں کراچی جانا چاہتا ہوں۔"

"تیری مرضی بیٹے۔" پیر بخش نے مختصراً کہا۔ وہ جانتا تھا کہ بیٹا ٹھیک کہہ رہا ہے۔ ہزارے میں روزگار کی بڑی قلت تھی کیونکہ روزگار تھا ہی نہیں۔ زیادہ تر لوگ اس سلسلے میں باہر جاتے تھے۔ کچھ ملک کے بڑے شہروں میں اور کچھ ملک سے باہر۔ اجازت دینے کے سوا وہ کیا کر سکتا تھا۔

مگر الٰہی بخش کا مسئلہ روزگار نہیں تھا۔ وہ تو باپ کے عشق سے گھبرا کر بھاگ رہا تھا۔ وہ رنگ و روغن کا بہت اچھا کاریگر بن چکا تھا۔ کام بھی ٹھیک ٹھاک مل جاتا تھا، اس لئے کہ وہ ایماندار بھی تھا۔ یہ الگ بات کہ ایبٹ آباد میں وہ ایمان داری ہی اس کے لئے جان لیوا ثابت ہوتے ہوتے رہ گئی لیکن اس دن کے بعد سے وہ باپ کے عشق سے خوف زدہ ہو گیا۔ موت کو جس کی وہ آرزو کرنے لگا تھا، اس نے بہت قریب سے دیکھ لیا تھا اور وہ اسے اچھی نہیں لگی تھی۔ اس کے لئے فرار ہونے ہی میں عافیت تھی۔

کراچی کے لئے روانہ ہوتے وقت، الٰہی بخش ملنگ والے درخت کے پاس سے گزرا تو اس نے سر گھما کر اسے دیکھا۔ ملنگ سر جھکائے، سینے پر ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ اس سے پہلے کہ الٰہی بخش سلام کرتا، ملنگ نے خود اسے سلام کیا۔

یہ پہلا موقع تھا کہ الٰہی بخش خود ملنگ کی طرف متوجہ ہوا تھا۔ اس سے پہلے تین چار بار ملنگ نے خود اسے بلایا اور اس سے باتیں کی تھیں اور ہر بار الٰہی بخش کسی آزمائش یا جذباتی خلفشار میں تھا۔ ملنگ نے ہمیشہ اس کی تسلی، اس کی دلجوئی کی تھی۔ الٰہی بخش کو اس کی باتیں اچھی لگتی تھیں دلچسپ پیرائے اور اشاریت کی وجہ سے، مگر اسے غصہ بھی آتا تھا۔ ملنگ ابا جیسی باتیں کرتا تھا، بلکہ وہ اور آگے کی چیز تھا۔

الٰہی بخش نے سلام کا جواب دیا۔ ملنگ نے کہا" آخری بار غریب خانے پر نہیں آئیں گے سرکار؟"

الٰہی بخش درخت کے نیچے جا کر بیٹھ گیا۔ ملنگ اسی طرح کھڑا رہا۔"ہاں بابا، میں کراچی جا رہا ہوں" الٰہی بخش نے کہا۔

"سب اوپر سے ہے سرکار۔" ملنگ نے آسمان کی طرف اشارہ کیا۔"سوہنے رب کی عنایت ہے سرکار، دیکھیں، ایک منزل کے دو راستے ہوتے ہیں۔ ایک چھوٹا، دوسرا لمبا۔ چھوٹے راستے پر کانٹے ہوتے ہیں، دشواریاں ہوتی ہیں، بڑی کٹھنائیاں آتی ہیں۔ دوسرا راستہ لمبا پر آسان ہوتا ہے۔ اس میں سایہ دار درخت ہوتے ہیں، آپ خوش نصیب ہیں۔ رب نے آپ کا راستہ آسان کر دیا۔ پر یاد رکھئے گا، منزل وہی ہے، آپ کو سفر مبارک ہو۔"

"گھر سے دور جانے کی مبارک باد دے رہے ہو" الٰہی بخش نے شکایت کی۔

"نہیں سرکار۔ یہ ترقی کی مبارکباد ہے۔ اسکول سے کالج میں جانے کی مبارک باد ہے۔"

"تم مجھے بہت یاد آؤ گے بابا۔"

"نہیں سرکار۔ آپ مجھے بھول جائیں گے۔ میں اسکول ماسٹر تھا۔ میری ڈیوٹی ختم۔ اب آپ کو کالج کا پروفیسر ملے گا۔ تعلیم نہیں چھوٹے گی۔ اب آپ جائیں۔ الوداع سرکار۔" ملنگ کا کمال یہ تھا کہ اس کی باتیں سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔ پھر بھی الٰہی بخش کے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا تھا۔ اس وقت بھی یہی ہوا۔ وہ تازہ دم ہو گیا۔

الٰہی بخش باپ کے عشق سے خوفزدہ ہو کر بھاگا تھا لیکن عشق نے کراچی میں بھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ کراچی آئے ہوئے ایک سال بھی نہیں ہوا تھا کہ وہ خود عشق میں مبتلا ہو گیا۔ مگر وہ عشق باپ کے عشق سے بالکل مختلف تھا۔

الٰہی بخش کو کراچی بہت پسند آیا، اس لئے کہ وہاں نام و نسب سے کسی کا کام نہیں چلتا تھا۔ وہاں آدمی کی شناخت اس کے کام، اس کے ہنر سے

ہوتی تھی۔ زندگی میں پہلی بار اسے یہ خوش گوار احساس ہوا کہ اس کی اپنی بھی ایک شناخت ہے اور وہ اس شناخت سے بالکل مختلف ہے جو اس پر تھوپ دی گئی تھی۔ کراچی میں وہ جلاہوں کی اولاد ہونے کی وجہ سے جلاہا نہیں تھا، وہ الٰہی بخش تھا رنگ ساز الٰہی بخش!

کراچی میں اسے دو مقام بہت زیادہ پسند آئے۔ ایک فیڈرل بی ایریا کے واٹر پمپ کی چورنگی اور دوسرا طارق روڈ پر کیفے لبرٹی کی چورنگی۔ اس کا بس چلتا تو وہ دونوں مقامات اپنا لیتا لیکن یہ ممکن نہیں تھا۔ اسے دونوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا تھا۔ بہت سوچ بچار کے بعد اس نے کیفے لبرٹی کی چورنگی کے حق میں فیصلہ کیا۔ ایک وجہ یہ تھی کہ وہ بڑے لوگوں کا علاقہ تھا۔ دوسری یہ کہ وہاں رونق بہت ہوتی تھی۔ وہ علاقہ اسے بھا گیا تھا۔

بعد میں زندگی بھر وہ یہی سوچتا رہا کہ اگر وہ کیفے لبرٹی کے بجائے واٹر پمپ پر بیٹھتا تو اس کی زندگی کتنی مختلف ہوتی۔ نہ وہ جلائے عشق ہوتا اور نہ اسکی زندگی نذر عشق ہوتی۔ اس کی سمجھ میں یہ بات بھی آ گئی کہ معمولی سے، غیر اہم سے فیصلے زندگی پر کتنے بھرپور طریقے سے اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس نے یہ بھی سمجھ لیا کہ فیصلے کا اختیار تو آدمی کو ہوتا ہے لیکن وہ فیصلہ اپنی تقدیر کے مطابق ہی کرتا ہے۔ فیصلہ وہ کرتا ہے لیکن مرضی اوپر والے کی ہوتی ہے۔

کراچی میں محنت کے بازار جابجا لگتے ہیں۔ ہر علاقے کا اپنا ایک بازار محنت ہے۔ کیفے لبرٹی کے آگے کی سمت بالکل مقابل جیولرز کی ایک دکان ہے، اس کے سامنے والے فٹ پاتھ پر بھی ایسا ہی ایک بازار ہے۔ علاقے میں کسی کو کسی بھی نوع کی کسی خدمت کی ضرورت ہو تو وہ اس بازار کا رخ کرتا ہے۔ اس بازار میں ہر طرح کی محنت انسانی دکانوں میں، انسانی شوکیس میں یوں سجی ہوتی ہے کہ تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بس جاؤ اور خرید لو۔ فٹ پاتھ پر سجی ہوئی یہ انسانی دکانیں اپنے شوکیس سمیت بمشکل دو فٹ جگہ گھیرتی ہیں۔ کہیں کوئی بیلچہ، کدال یا پھاوڑا نظر آئے تو سمجھ لیں کہ وہاں مزدور دستیاب ہے۔ پینٹ کے ڈبے پر برش اور رنگوں کا کارڈ نظر آئے تو وہ رنگ و روغن والا ہے۔ خالی کنستر پر کوچی رکھی ہو تو چونا کرنے والا ہے۔ چھینی کے اوزار پلمبر کا پتا دیتے ہیں۔ کوئی شخص کرنی اور فرش بنانے والا تختہ لئے بیٹھا ہو تو وہ راج مستری ہے اور جس کے پاس کچھ بھی نہ ہو، بس ایک لمبا سا میلا سا کپڑا کندھے پر ہو تو سمجھ لیں کہ وہ بوجھ ڈھونے والا مزدور ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں انسان کی شناخت اس کے شجرۂ نسب سے نہیں، اس کے اوزاروں سے، اس کے ہنر سے ہوتی ہے۔

الٰہی بخش کو یہی بات پسند آئی تھی۔ اس نے پینٹ کا ایک خالی ڈبہ، کلر کارڈ اور اپنے برش لئے اور اس فٹ پاتھ پر محنت کا انسانی شوکیس بن گیا۔ ڈیڑھ دو فٹ جگہ میں وہ بھی سج بن کر بیٹھ گیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ زندگی سے خوش تھا۔

جلد ہی زندگی معمولات کی ڈگری پر چل پڑی۔ ایبٹ آباد سے وہ سات لڑکوں کے ساتھ آیا تھا۔ ان آٹھوں نے مل کر اعظم بستی میں ایک مکان کرائے پر لے لیا تھا۔ کرایہ سو روپے تھا۔ بجلی کا بل ملا کر ہر ایک کو زیادہ سے زیادہ بیس روپے دینے ہوتے تھے۔ گھر سے وہ لوگ زیادہ پیسے نہیں لائے تھے۔ انہوں نے چارپائیاں خریدیں۔ موسم ایسا تھا کہ فی الحال بستر کی ضرورت نہیں تھی۔ کھانا وہ باہر کھاتے تھے۔ لہٰذا برتنوں کا جھمیلا بھی نہیں تھا۔ زندگی آسانی سے شروع ہو گئی۔ پھر سب سے اچھی بات یہ تھی کہ سب کو فوراً ہی روزگار بھی مل گیا۔

الٰہی بخش کے لئے یہ تجربہ بھی انوکھا تھا کہ وہ پردیس میں تھا لیکن ایک منٹ کے لئے بھی اسے کوئی پریشانی نہیں ہوئی تھی۔ یہاں تک کہ وہ فٹ پاتھ پر آ کر بیٹھا تو پہلے ہی دن اسے کام مل گیا۔ کام بھی ایسا کہ چار دن اسے کام کے سوا کسی بات کا ہوش نہیں رہا۔ وہ تو اسے بعد میں معلوم ہوا کہ بعض اوقات کئی کئی دن خالی بیٹھے بھی گزر جاتے ہیں۔ پہلی بار اس نے جس کے ہاں کام کیا تھا وہ اس کے کام سے اتنا خوش ہوا کہ اسے دس روپے انعام بھی دیا۔ اس آغاز کے بعد کبھی یہ نوبت نہ آئی کہ اس کی جیب خالی رہی ہو۔

ابتدا میں الٰہی بخش کو اپنا شہر بہت یاد آیا۔ وہ ہمیشہ سوچتا کہ ایبٹ آباد جیسا خوب صورت اور سرسبز علاقہ دنیا میں کہیں نہیں ہوگا۔ ایسے سادہ اور پُرامن لوگ کہیں ہو ہی نہیں سکتے اور ایسا موسم اور آب و ہوا کہیں نہیں ملے گی۔ بات ٹھیک ہی تھی لیکن اسے اندازہ نہیں ہوا کہ کراچی کس طرح اس کے دل میں گھر کر رہا ہے۔ وہ تو ایک دن اچانک اسے احساس ہوا کہ اسے کراچی سے محبت ہو گئی ہے۔ اس نے دل ٹٹولا تو پتا چلا کہ اس محبت نے اس کے

دل کی گہرائی میں جڑیں پکڑی ہیں۔ غور کیا تو ثابت ہوا کہ کراچی اس محبت کا مستحق ہے۔

الٰہی بخش کراچی سے متعلق سوچتا تو اس کا وجود احساس شکر گزاری سے سرشار ہو جاتا۔ اس کے ذہن میں غریب پرور شہر، برکتوں کا شہر، خدا کی رحمتوں کا مرکز جیسے عنوان گونجنے لگتے۔ کراچی کے لوگ بہت اچھے تھے۔ فراخ دل، محبت کرنے والے اور پُرسکون۔ الٰہی بخش ایسے کتنے ہی لوگوں سے مل چکا تھا، جو بغیر ٹکٹ کے ریل میں چھپتے چھپاتے سفر کرتے کراچی پہنچے تھے اور ان کی جیبیں خالی تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ اس کے باوجود انہیں کبھی بھوکا نہیں سونا پڑا تھا۔ کسی کو ریل سے باہر آتے ہی روزگار مل گیا تھا اور کسی کو شہر پہنچ کر۔ روزگار کی فراوانی تھی۔ کھانے پینے کا بھی یہ تھا کہ ایک روپے میں بھی پیٹ کی آگ بجھائی جا سکتی تھی۔ سونے کا ٹھکانہ میسر نہ ہوتا تو لوگ پارکوں، باغیچوں میں بھی سو لیتے تھے۔ کھلا آسمان انہیں تحفظ فراہم کرتا تھا۔ اب ایسے شہر سے کوئی محبت کیے بغیر رہ سکتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ کراچی سے چلے جانے کے بعد بھی کراچی کے مہمان اس شہر سے محبت کرتے تھے، اسے یاد رکھتے تھے۔ آج بھی دیکھ لیں، ملک کے ہر بڑے چھوٹے شہر میں، بلکہ چھوٹے چھوٹے قصبوں تک میں کراچی کے نام کی کوئی دکان، کوئی ہوٹل ضرور ملے گا۔ جو ایک بار کراچی رہ گیا، اس نے اس شہر کے نام کو اپنی خوش بختی کی علامت ضرور سمجھا۔

سو کراچی آتے ہی الٰہی بخش محبت سے آشنا ہو گیا، ورنہ وہ تو عشق اور محبت سے خوف زدہ تھا۔

الٰہی بخش نے انگریزی زبان کا یہ مقولہ سنا بھی نہیں تھا کہ صبح سویرے رزق کی تلاش میں نکلنے والے پرندے کو کھانے کے لئے سب سے زیادہ کیڑے ملتے ہیں مگر وہ تھا بہت سویرے اٹھنے والا پرندہ اور سویرے اٹھ کر گھر میں وقت ضائع کرنے کا قائل نہیں تھا۔ گھر میں دل لگانے کا کوئی سامان تھا بھی نہیں، چنانچہ وہ تیار ہو کر باہر نکلتا، ہوٹل میں ناشتہ کرتا، اور محنت کا بازار لگنے سے پہلے ہی بازار پہنچ جاتا۔ وہاں اس کے لیے طمانیت ہی طمانیت تھی۔ ڈیڑھ دو فٹ کی جگہ اسے ملکیت کا احساس دلاتی تھی۔ یہ احساس ہوتا تھا کہ وہ صاحب جائیداد ہے۔ وہ اکیلا اپنے ٹھکانے پر آ بیٹھتا۔ پینٹ کے خالی ڈبے پر رکھ کر وہ اپنی دکان سجاتا۔ پھر پاؤں پھیلا کر بیٹھ وہ گرد و پیش کی ویرانی دیکھا رہتا۔

سچ پوچھو تو وہ وہاں اتنی صبح صرف اداس ہونے کے لئے آتا تھا، البتہ اسے اس بات کا کبھی احساس نہیں ہوا۔ سنسان سڑکیں، بند دکانیں اور سوئے ہوئے فلیٹ دیکھ کر وہ اداس ہو جاتا۔ اسے یقین ہی نہیں آتا کہ شام اسی جگہ اتنی چہل پہل ہوتی تھی کہ فٹ پاتھ پر کسی سے ٹکرائے بغیر چلنا ہی ممکن نہیں تھا۔ اتنی گاڑیاں سڑک پر ہوتی تھیں کہ بعض اوقات ٹریفک آدھا آدھ گھنٹا جام رہتا تھا۔ ہارنوں کا، لوگوں کا ایسا شور تھا کہ خاموشی کی طلب ہونے لگتی تھی۔ دکانوں پر اتنی بھیڑ تھی کہ لگتا تھا، ہر چیز مفت بانٹی جا رہی ہے اور اب اب اتنا سناٹا کہ کوئی بھولی بھٹکی گاڑی سامنے سے گزر جاتی تو لگتا کہ سناٹے کا شیشہ چھن سے ٹوٹ گیا۔

یہ منظر دیکھ کر الٰہی بخش کو ایبٹ آباد یاد آنے لگتا۔ ایبٹ آباد نہیں، وہاں کا موسم خزاں۔ جب ٹنڈ منڈ درختوں کو دیکھ کر وہ اداس ہو جاتا تھا اسے لگتا تھا کہ درخت مر گئے ہیں۔ وہ جانتا تھا لیکن پھر بھی اسے یقین نہیں آتا تھا کہ یہ درخت پھر ہرے ہوں گے۔ نئی کونپلیں پھوٹیں گی۔ شاخوں پر نئے پتے نکلیں گے۔ ہر سال وہ یہ عمل دیکھتا۔ مگر درختوں کو خزاں رسیدہ دیکھتا تو یقین نہ آتا کہ یہ موت عارضی ہے۔ اس کا فائدہ یہ تھا کہ وہ بدترین اور انتہائی مایوس کن صورت حال میں بھی پُرامید رہتا تھا کیونکہ ہر خزاں کے بعد اس نے بہار آتے دیکھی تھی۔

کراچی میں موسم کی وہ کرشمہ کاریاں تو نہیں تھیں لیکن اس کا متبادل صبح کی ویرانی کی شکل میں مل گیا تھا۔ یہاں لوگ دیر تک سوتے تھے۔ صبح نو بجے تک ہر طرف سناٹا رہتا۔ پھر جیسے زندگی انگڑائی لے کر بیدار ہوتی۔ دس بجے سے چہل پہل شروع ہو جاتی۔ شام کو رونق اپنے شباب پر ہوتی۔ ایسی رونق ہوتی کہ وہ کوشش کے باوجود صبح کی ویرانی کا تصور بھی نہ کر پاتا۔ لگتا جادو کے زور سے سب بدل گیا ہے۔

اس کے نزدیک یہ کراچی کے بہار و خزاں تھے۔ ایبٹ آباد میں خزاں تین مہینے رہتی تھی اور سال میں ایک بار آتی تھی۔ یہاں خزاں ہر روز آتی تھی اور دس گھنٹے کے لئے آتی تھی۔ وہاں خزاں سچ مچ کے درختوں پر آتی تھی جبکہ یہاں رونقوں کے درخت خزاں میں ٹنڈ منڈ ہو جاتے تھے۔ یہاں کی خزاں کے تین گھنٹے وہاں کے تین ماہ سے زیادہ کرب ناک تھے۔ وہاں تو وہ خزاں رسیدہ درختوں کے دکھ میں شریک رہتا تھا۔ تنہائی کا احساس تک

نہیں ہوتا تھا، مگر یہاں اسے لگتا کہ کسی نے جادو کے زور پر انسانوں کو، ہر چیز کو پتھر کا بنا دیا ہے اور پتھر کی عمارتوں میں مجسمے قید ہیں۔ اسے تنہائی کا بہت شدید احساس ہوتا تھا۔ لگتا تھا کہ پوری کائنات میں خدا کے اور اس کے سوا کوئی موجود نہیں، البتہ یہ ضرور تھا کہ وہ تنہائی اسے خوف زدہ نہیں کرتی تھی، بلکہ سوچنے پر اکساتی تھی۔ دنیا کی بے ثباتی اس پر بالکل واضح ہو جاتی تھی۔ زندگی میں پہلی بار اس کی سمجھ میں یہ بات آئی تھی کہ نیند عارضی موت ہوتی ہے۔

تو یوں ہر صبح الٰہی بخش اداسی سے اپنے دن کا آغاز کرتا۔ وہ بیٹھ کر زندگی، موت اور موسموں کے بارے میں سوچتا رہتا اور، چونکہ اسے احساس ہوتا کہ اس استغراق کے عالم میں اسے پتا ہی نہیں چلا کہ کسی نے جادو کی چھڑی گھمائی ہے اور دنیا پھر سے زندہ ہو گئی ہے۔

دن گزرے تو ساتھ بیٹھنے والے مزدوروں سے دوستی بھی ہو گئی۔ وہ سب ایک فیملی کی طرح تھے۔ کبھی جھگڑے بھی ہوتے لیکن سب ایک دوسرے کا خیال رکھتے۔ اس طرح ساتھ رہنے میں ایک اچھی بات پیدا ہو گئی تھی۔ ان کا عقیدہ درست ہو گیا تھا۔ اس بات پر ایمان پختہ ہو گیا تھا کہ جس کو جتنا رزق ملنا ہے، اتنا ہی ملے گا اور کوئی کسی کا حق نہیں مار سکتا۔ یہی وجہ تھی کہ کسی پینٹ والے کو کام ملتا تو دوسرے کاریگر اس سے حسد نہ کرتے۔ یہ نہ سوچتے کہ وہ نہ ہوتا تو شاید کام انہیں مل جاتا۔

الٰہی بخش کو بوجھ ڈھونے والے مزدوروں میں خاص دلچسپی تھی۔ وہ چیونٹیوں کی سی فطرت رکھنے والے تھے۔ مل کر گروہ کی صورت میں کام کرتے۔ وہاں چھ مزدوروں کا ایک گروپ تھا۔ الٰہی بخش جانتا تھا کہ ان لوگوں کا کام بہت سخت ہے۔ فرنیچر کی دکان سے بھاری فرنیچر ٹرک پر لادنا۔ پھر اس سامان کو منزل تک پہنچا کر مرضی کی جگہ پر رکھنا۔ بعض اوقات انہیں سامان چوتھے، پانچویں مالے تک پہنچانا پڑتا۔ کوئی شخص مکان تبدیل کرتا تو اسے ان مزدوروں کی ضرورت پڑتی۔ کام دو گھنٹے میں نمٹے یا دس گھنٹے میں دہاڑی وہ پورے دن کی لیتے۔ کام ایسا تھا کہ وہ تھکن سے چور ہو جاتے۔ انہیں دیکھ کر الٰہی بخش کو یا تو چیونٹیوں کا خیال آتا تھا یا شہد کی مکھیوں کا۔ کم از کم اس گروپ میں، جس سے وہ واقف تھا، تنظیم بھی تھی اور ڈسپلن بھی تھا۔ گروہ کا سردار وہ ہوتا تھا جس کی عمر سب سے زیادہ ہوتی تھی۔ اس کی بوجھ اٹھانے کی صلاحیت بھی سب سے کم ہوتی تھی۔ وہ ہاتھ ضرور بٹاتا تھا لیکن اس کے ساتھی اسے زیادہ بھاری سامان اٹھانے نہیں دیتے تھے۔

وہیں الٰہی بخش کو یہ علم ہوا کہ بوجھ اٹھانے کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ اسی لئے زیادہ عمر والے کو سردار بنایا جاتا تھا لیکن اصل سردار سب کم عمر لڑکا ہوتا تھا جو سب سے زیادہ بوجھ اٹھانے کی اہلیت رکھتا تھا۔ وہ لڑکا اپنے ساتھیوں کو تحفظ فراہم کرتا تھا۔ سب سے بھاری سامان وہ اٹھاتا تھا۔ چار پانچ سال میں وہ عام مزدوروں کی طرح ہو جاتا تھا اور گروپ کو اس کا متبادل تلاش کرنا ہوتا تھا۔ سردار سے لیکر تمام عام مزدور اس مرحلے سے گزر چکے ہوتے تھے۔

اس سے الٰہی بخش کو ان کی تنظیم کا اندازہ ہو گیا۔ وہ تو باقاعدہ ایک ادارہ سا تھا۔ مزدور جیسے جیسے جسمانی تنزلی کی طرف بڑھتا تھا، اس کا مرتبہ بھی بڑھتا رہتا تھا اور اس سے کام کم لیا جاتا تھا۔ اس کا احترام زیادہ ہوتا تھا۔ اس کے تجربے سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جاتی تھی۔ وہ بوجھ اٹھانے کا پیچیدہ سے پیچیدہ مسئلہ لمحوں میں حل کر دیتا تھا۔ پھر ایک وقت آتا تھا کہ سینئر مزدور کو ریٹائر ہو جانا پڑتا تھا۔ قدرت کا نظام ایسا تھا کہ اس وقت تک اس کا بیٹا بڑا ہو چکا ہوتا تھا۔ وہ ذمے داری سنبھال لیتا تھا۔ کچھ اور نہ کر پاتا تو اپنے باپ کے ہی گروپ میں کام سنبھال لیتا اور کوئی مزدور بیٹے کا باپ نہ ہوتا یا اس کا بیٹا بہت چھوٹا ہوتا تو ساتھی مزدور اس کے لئے اتنا بندوبست کر دیتے کہ وہ وہیں بیٹھ کر پھل سبزی یا کوئی اور چیز بیچنے لگتا۔ اس کے بجائے گروپ میں نیا خون شامل کر لیا جاتا۔

الٰہی بخش کو یہ سب جلد ہی معلوم ہو گیا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ گروپ کا سردار قاسم اس پر بڑا مہربان تھا۔ وہ اس پر غیر معمولی شفقت کرتا تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ گروپ ان دنوں بحران کی زد میں تھا۔ انہیں گروپ میں شامل کرنے کے لئے نیا خون، نو عمر مزدور درکار تھا۔ قاسم بوڑھا ہو گیا تھا۔ اب وہ بوجھ اٹھانے کے قابل نہیں رہا تھا۔

ایک دن الٰہی بخش نے قاسم سے پوچھا "چاچا... تمہاری عمر کتنی ہے؟"

"میں تمہیں اشارے دے سکتا ہوں۔" قاسم نے مسکراتے ہوئے کہا "حساب تمہیں ہی لگانا ہوگا۔ میں مزدوری کے سوا کوئی حساب نہیں لگا سکتا۔"

"چلو اشارے ہی دے دو۔"

قاسم چند لمحے سوچتا رہا۔ پھر بولا "پاکستان بنا تو میں چھبیس سال کا تھا۔"

الٰہی بخش حیران رہ گیا "ارے... تم صرف چھیالیس سال کے ہو۔" اس کی حیرت بجا تھی۔ قاسم دیکھنے میں ساٹھ سال کا لگتا تھا۔

"بیٹا، یہ کام ہی ایسا ہے کہ آدمی کو اندر سے چاٹ لیتا ہے۔ کھوکھلا کر دیتا ہے۔ اب تو مجھ سے بوجھ اٹھایا بھی نہیں جاتا۔ جیسے ہی کوئی نیا لڑکا ملے گا، میں یہ کام چھوڑ دوں گا۔ زیادہ دیر ساتھیوں پر بوجھ نہیں بن سکتا۔"

"الٰہی بخش جانتا تھا کہ وہ لوگ کسی جوان لڑکے کی تلاش میں ہیں" بچے تمہارے کتنے ہیں چاچا؟" اس نے پوچھا۔

"منزل ابھی دور ہے۔" قاسم نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "میرا بڑا بیٹا ابھی صرف دس سال کا ہے۔"

الٰہی بخش کو دکھ ہوا۔ مزدور کے لئے بچوں میں صرف بیٹے کی اہمیت تھی اور وہ بھی بڑے بیٹے کی۔ یقینی طور پر اس بڑے بیٹے سے بڑی قاسم کی کوئی بیٹی... بھی ہوگی بلکہ ممکن ہے، بیٹیاں ہوں لیکن وہ بتانا نہیں چاہتا تھا تو کریدنا بھی مناسب نہیں تھا۔ "آگے کیا کرنے کا ارادہ ہے؟" اس نے پوچھا۔

"کچھ بھی کرلوں گا۔ پھیری والا بن کر گھر گھر جاؤں گا۔ لوگوں کی خدمت اب بھی کرتا ہوں، جب بھی کروں گا۔"

اس گفتگو کے ایک ہفتے بعد بوجھ ڈھونے والے مزدوروں کو مطلب کا ایک لڑکا مل گیا۔ اس روز جشن کا سا سماں تھا۔ وہ سب بہت خوش تھے لیکن سب سے زیادہ خوش عباس تھا۔ عباس وہ لڑکا تھا جو اب تک گروپ میں سب سے کم عمر تھا۔ الٰہی بخش اس کی خوشی کو سمجھ سکتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ عباس پچھلے پانچ سال سے سب سے زیادہ بوجھ اٹھاتا رہا ہے۔ وہ اب بھی جوان تھا لیکن اپنی عمر سے بہت بڑا لگنے لگا تھا اور اب اسے ان پانچ برسوں کا صلہ ملنے والا تھا۔ اب بہت بھاری بوجھ اسکے لئے نہیں تھا۔ اس کی جگہ کسی اور نے لے لی تھی۔ اب آنے والے وقت میں اس کے لئے سختی کم سے کم ہوتی جاتی تھی۔

نئے مزدور کا نام زردادخان تھا۔ اس کی عمر مشکل سے انیس سال ہوگی۔ دیکھنے میں وہ بالکل جان دار نہیں لگتا تھا۔ الٰہی بخش نے یہ بات قاسم سے بھی کہہ دی۔ قاسم باچھیں پھیلاتے ہوئے مسکرایا۔ "ارے بیٹا، وہ بہت شاندار لڑکا ہے۔" وہ بولا "لیکن تمہارے پاس مزدور کی آنکھ تو نہیں ہے نا، کام ملنے دو، پھر اس کے جوہر دیکھنا۔"

جاندار ہوتا ہو، نیا لڑکا مبارک بہر حال تھا۔ پہلے ہی دن انہیں کام مل گیا۔ ایک بڑی فیملی حارق روڈ سے ناظم آباد شفٹ ہو رہی تھی۔ سامان دوسری منزل سے اتارنا اور چوتھی منزل پر چڑھانا تھا۔ مزدور بہت خوش تھے۔

مزدور تیاریوں میں لگے ہوئے تھے کہ قاسم الٰہی بخش کے پاس آیا "کیا خیال ہے بیٹے، آج چھٹی کر سکتے ہو؟" اس نے مشفقانہ لہجے میں پوچھا۔

"کیا بات ہے چاچا، کوئی کام ہے؟" الٰہی بخش نے پوچھا۔

"کام تو نہیں، جی چاہتا ہے آج کا دن ہمارے ساتھ گزارو۔"

"ٹھیک ہے چاچا۔ میرے لئے تو یہ خوشی کی بات ہے۔ میں چلوں گا تم لوگوں کے ساتھ۔"

"بات صرف کام کی نہیں۔ رات کا کھانا بھی میرے گھر پر کھاؤ گے... سب کے ساتھ۔"

"یہ بھی ہو جائے گا۔ اپنا کوئی گھر پر انتظار کرنے والا تھوڑا ہی ہے۔" الٰہی بخش نے بے فکری سے کہا۔

ٹرک آیا تو الٰہی بخش بھی سب مزدوروں کے ساتھ بیٹھ گیا۔ صاحب خانہ انہیں دوسری منزل پر اپنے فلیٹ میں لے گئے۔ فلیٹ میں ابتری پھیلی ہوئی تھی۔ سامان کاٹھ کباڑ کی طرح بکھرا ہوا تھا لیکن الٰہی بخش اندازہ کر سکتا تھا کہ گھر بدلنے کے ارادے سے پہلے اس سامان کے ساتھ یہ فلیٹ کیسا لگتا

ہوگا۔ سچ یہ ہے کہ اس نے ایسا سامان پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ قالین، صوفے، بیڈ، الماریاں، ٹی وی اور نہ جانے کیا کیا۔ تو گھر ایسے بھی ہوتے ہیں! اس نے حیرت سے سوچا اور گھروں میں سامان ایسا بھی ہوتا ہے!

صاحب خانہ قاسم کو سامان دکھا رہا تھا "یہ ان ڈبوں میں کانچ کے برتن ہیں۔" وہ اشارہ کرتے ہوئے کہہ رہا تھا "انہیں احتیاط سے اتارنا ہوگا۔"

"آپ بے فکر رہیں صاحب!" قاسم نے کہا۔ "ایک پیالی بھی نہیں ٹوٹے گی اللہ کے حکم سے۔"

صاحب اس بات سے ذرا بھی متاثر نہیں ہوا۔ "اور یہ فرنیچر بالکل نیا ہے۔" اس نے کہا "خراش بھی نہیں پڑنی چاہیے کسی چیز پر۔"

"آپ فکر نہ کریں صاحب، جیسے آپ کا سامان ہے، ایسا ہی اترے گا اور ایسا ہی چڑھے گا دوسرے مکان میں۔" قاسم نے کہا۔

مزدوروں کے درمیان مشاورت نہیں ہوئی لیکن انہوں نے کام اس انداز میں شروع کیا، جیسے سب کچھ پہلے ہی سے طے رہا ہو۔ بھاری فرنیچر نئے لڑکے کی ذمے داری تھا۔ لکڑی کی ایک الماری بہت بھاری تھی۔ اس کے لئے قاسم نے صاحب کو آواز دی، وہ آیا تو اس نے پوچھا "صاحب یہ الماری کھلنے والی ہے؟"

"نہیں۔"

قاسم کو مایوسی ہوئی "کھلنے والی ہوتی تو آسانی رہتی۔" اس نے کہا۔

"تم لوگوں کے لئے یہ بڑا مسئلہ تو نہیں۔" صاحب نے بے نیازی سے کہا۔

"وزن کی بات نہیں صاحب" قاسم نے بے حد اعتماد سے کہا "لیکن زینے بہت تنگ ہیں، خراش لگ سکتی ہے۔ خیر اللہ مالک ہے۔" وہ نئے لڑکے زرداد کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"بیٹے پہلے کبھی اتاری ہے۔ عباس تیرا ساتھ دے گا۔"

"اس کی ضرورت نہیں استاد۔" زرداد بولا "بس اسے میری پیٹھ پر لادو۔"

قاسم جواب میں کچھ کہنے والا تھا مگر کچھ سوچ کر رک گیا۔ الٰہی بخش نے ایسے انداز میں کہ کسی کو محسوس نہ ہو، الماری کو کھسکانے کی کوشش کی۔ لیکن الماری بہت بھاری تھی، یہ بات سمجھ میں آنے والی نہیں تھی کہ اکیلا زرداد خان اسے کمر پر اٹھا کر نیچے اتار دے گا۔

مزدوروں نے مل کر الماری زرداد خان کی کمر پر رکھ دی۔ ایک چادر کو بل دے کر الماری کے درمیانی حصے سے گزار کر زرداد خان نے اپنے پیٹ پر چادر کو گرہ لگا دی۔ پھر وہ چل پڑا۔ تمام مزدوروں کے چہروں پر خوشی سنسنا رہی تھی۔ ان میں سے دو زرداد کے آگے تھے اور باقی اس کے پیچھے چل رہے تھے۔ کسی کے ہاتھ میں کوئی سامان نہیں تھا۔ شاید اس لئے کہ انہیں یقین نہیں تھا کہ زرداد الماری کو نیچے پہنچا سکے گا۔ کسی بھی وقت اسے ہنگامی طور پر مدد کی ضرورت پڑ سکتی تھی اور وہ سب اس کے لئے تیار تھے۔ الٰہی بخش کو قاسم کی مزدور کی نظر کا قائل ہونا پڑا۔

زرداد خان کو کسی کی مدد کی ضرورت نہیں پڑی۔ درمیان میں وہ کہیں ایک سانس کے لئے بھی نہیں رکا۔ الماری اس نے نیچے اتار دی اور پیشانی سے پسینہ پونچھنے کے بعد بغیر کسی توقف کے زینوں کی طرف چل دیا۔ اب مزدوروں کے چہروں پر خوشی کے ساتھ اعتماد بھی تھا۔ وہ صحیح معنوں میں کھل اٹھے تھے۔

اس کے ساتھ ہی کام کی گہما گہمی شروع ہو گئی۔ جسموں میں جیسے بجلیاں بھر گئیں۔ الٰہی بخش کو اپنی بے مصرفی کا احساس ستا رہا تھا۔ تمام مزدور خاموشی سے کام میں لگ گئے تھے۔ کوئی سستی نہیں دکھا رہا تھا۔ کانچ کے برتنوں والے ڈبوں کی طرف کسی نے دھیان نہیں دیا تھا۔ وہ شاید قاسم کی ذمے داری تھی۔ قاسم ایک کارٹن لے کر چلا گیا تو الٰہی بخش نے ادھر ادھر دیکھا اور ایک نشست والے ایک صوفے کو ہلا جلا کر دیکھا۔ وہ زیادہ بھاری نہیں تھا۔ اس نے اسے اٹھا کر کندھے پر رکھا اور چل دیا۔

الٰہی بخش ایک جان دار پہاڑی جوان تھا لیکن صوفے کو اٹھا کر نیچے لے جانے میں اس کی سانس اکھڑ گئی۔ جسم سے پسینہ جیسے ابل پڑا تھا۔ پہلی

بار اس کی سمجھ میں آیا کہ قاسم ٹھیک کہہ رہا تھا۔ یہ کام واقعی آدمی کو اندر سے چاٹ لیتا ہوگا۔
نیچے قاسم نے اسے صوفے کے ساتھ لڑکھڑاتے دیکھا تو صوفہ اتارنے میں اس کی مدد کی اور بولا "بیٹا، میں تمہیں بوجھ اٹھانے کے لئے تو نہیں لایا ہوں، خبردار جو کسی چیز کو ہاتھ لگایا۔"
"لیکن چاچا، خالی رہنا مجھے برا لگ رہا ہے۔" الٰہی بخش نے ہانپتے ہوئے کہا۔
"کوئی ضرورت نہیں۔ تُو تو مہمان ہے ہمارا۔"
"نہیں چاچا۔ کچھ نہیں کرنے سے اچھا ہے کہ میں چلا جاؤں۔"
قاسم کچھ دیر سوچتا رہا پھر سر ہلاتے ہوئے بولا "تو ٹھیک ہے، تُو میرے ساتھ برتنوں والے ڈبے اتروا دے۔ یہ نازک کام ہے، احتیاط سے کرنا ہوگا۔"
پورا سامان نیچے اتارنے میں دو گھنٹے لگے۔ پہلے صوفے کے بعد الٰہی بخش نے کسی بھاری چیز کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ بھاری بوجھ بھی اٹھا سکتا ہے لیکن بھاری سامان ان کے ساتھ سیڑھیاں چڑھنا اور اترنا کسی اور ہی دنیا کا کام لگتا تھا۔
سامان کو ٹرک میں لدوانے میں قاسم کی مہارت سامنے آئی۔ جتنا سامان اس نے ٹرک پر لدوایا، الٰہی بخش کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ ممکن ہے۔ یہ سردار کا تجربہ تھا کہ کون سی چیز پہلے رکھی جائے اور کون سی چیز بعد میں۔ ٹرک میں موجود جگہ کو کیسے بہتر سے بہتر طور پر استعمال کیا جائے۔
وہ ٹرک میں بیٹھ کر ناظم آباد چلے۔ الٰہی بخش اس وقت تک بری طرح تھک چکا تھا۔ یعنی وہ بوجھ اٹھانے کا کام نہیں کر سکتا تھا۔ مزدور تھکے ضرور تھے لیکن ٹرک میں بیٹھ کر ایک دوسرے کو چھیڑتے ستاتے، تھکن ان کے چہرے سے وحشت لگ رہی تھی۔ ایسا نہ ہوتا تو وہ مزدور بھی نہ ہوتے شاید۔ کیونکہ اب انہیں زیادہ سخت مرحلہ درپیش تھا۔ انہیں سامان چوتھی منزل پر چڑھانا تھا۔
ٹرک کے سفر کے دوران الٰہی بخش زرداد خان کو غور سے دیکھتا رہا۔ وہ ابھی تک اپنی ٹولی میں گھلا ملا نہیں تھا، الگ تھلگ بیٹھا تھا مگر عباس اس کام کو آسان کرنے میں لگا ہوا تھا۔ وہ زرداد خان کے پاس بیٹھا اس سے باتیں کر رہا تھا۔ زرداد خان کے چہرے پر اور آنکھوں میں صرف طمانیت تھی۔
وہ ایک عجیب اور بھرپور دن تھا۔ اس روز الٰہی بخش نے جو دیکھا، سیکھا، سمجھا اور جانا، وہ عمر بھر اس کے ساتھ رہا۔ یہ بات اس پر واضح ہو گئی کہ طبقاتی تقسیم ایک بہت بڑی حقیقت ہے۔ کہیں خاندان، برادری اور نام و نسب کی اونچ نیچ ہے تو کہیں حیثیت کا تفاوت ہے۔ وہاں ایبٹ آباد میں وہ چکر تھا، اور یہاں کراچی میں ایک صاحب طبقہ تھا، جو بڑے آراستہ گھروں میں رہتا تھا۔ روپیہ پیسہ اس طبقے کے لئے مسئلہ نہیں تھا، جبکہ دوسرا طبقہ دس روپے کمانے کے لئے ہر روز ایسا بوجھ ڈھوتا جس سے بوجھ ڈھونے والے جانور بھی گھبرا جائیں اور کچھ عرصے کے بعد وہ خون تھوکتا زندگی کی پھسلنی سے موت کی طرف پھسل جاتا۔
یہ سب سوچ کر الٰہی بخش پر تھرتھری چڑھنے لگی۔ یہ زندگی ہے۔ اتنے لوگوں کے لئے اتنی مختلف!
زرداد الماری اس بار بھی بغیر رکے اوپر چوتھی منزل کے فلیٹ تک لے گیا تھا۔ ایک اچھی بات یہ تھی کہ اس بلڈنگ کے زینے کشادہ تھے۔ اس سے کام آسان ہو گیا، ورنہ طارق روڈ والی بلڈنگ میں زینے کے موڑ پر سامان اتارنے کے لئے ترکیبیں لڑانی پڑی تھیں۔ انہیں کام سے فارغ ہوتے ہوتے چھ بج گئے۔ صاحب بہت خوش تھا۔ کسی چیز کو معمولی سی خراش بھی نہیں آئی تھی۔ کوئی برتن نہیں ٹوٹا تھا "آپ سب چیک کر لیں صاحب!" قاسم نے اس سے کہا "ہمارا کام ختم ہو گیا ہے۔"
"چیک کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں بہت خوش ہوں تم لوگوں سے۔" صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا "میں بھی تمہیں خوش کر دوں گا۔"
تھوڑی دیر بعد چائے اور بسکٹوں اور سموسوں سے ان کی تواضع کی۔ پھر اس نے دس روپے کے آٹھ نوٹ قاسم کی طرف بڑھائے "یہ ہے تم لوگوں کی مزدوری۔" اس نے کہا، پھر اس نے سو کا ایک نوٹ دیتے ہوئے کہا "یہ ہے مجھے خوش کرنے کا انعام تم آٹھوں کے لئے۔"

وہ صاحب کا شکریہ ادا کر کے، اسے سلام کر کے نیچے آ گئے۔ سب بہت خوش تھے۔ ان کے حساب سے انہیں ڈھائی دن کی دہاڑی ایک ہی دن میں مل گئی تھی۔ اچانک رحمو کو خیال آیا کہ کھانا نہیں کھایا گیا ہے اور بھوک لگ رہی ہے عاقل نے بھی تائید کی۔

''نہیں بھئی، یہ کھانے کا تو وقت نہیں۔'' قاسم نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا ''اس وقت کھا لو گے تو رات کو میرے گھر پر کیا کھاؤ گے۔''

بات معقول تھی۔ ''استاد، کھانا کس وقت ملے گا؟''

''آٹھ بجے تیار ہو گا کھانا، میں کہہ کر آیا ہوں۔'' قاسم نے کہا۔ ''چلو کسی ہوٹل میں چلتے ہیں، جسے زیادہ بھوک لگی ہو، وہ کچھ بسکٹ سموسے کھالے۔''

وہ سب ایک ریسٹورنٹ میں چلے گئے۔ رحمو اور عاقل کے سوا کسی نے سموسے نہیں کھائے۔ وہاں قاسم نے مزدوری کی رقم تقسیم کی۔ اس نے بیس روپے الٰہی بخش کی طرف بڑھائے تو وہ حیران رہ گیا۔ ''یہ کیا چاچا؟''

''یہ تمہارا حصہ ہے۔''

''لیکن چاچا، میں تو مہمان ہوں۔ تمہارے ساتھ ایک دن گزارنے کے لئے آیا تھا'' الٰہی بخش نے احتجاج کیا۔

''یہ تو تمہیں لینا پڑے گا۔ صاحب نے آٹھ آدمیوں کی مزدوری دی ہے۔''

''سوال ہی نہیں پیدا ہوتا..... بیکار بات مت کرو۔''

قاسم نے اس کی بات کاٹ دی ''تمہارا حصہ رکھ کر ہم گناہ گار بنیں گے کیا۔''

اس پر سب پیچھے پڑ گئے۔ یوں الٰہی بخش کو وہ پیسے لینے ہی پڑے۔ لیکن اسے بہت شرمندگی ہو رہی تھی۔

ہوٹل سے باہر آ کے قاسم نے کہا ''یہ الٰہی بخش اور زرداد میرے ساتھ جا رہے ہیں۔ تم لوگ آٹھ بجے تک میرے گھر پہنچ جانا۔''

باقی سب لوگ چلے گئے۔ قاسم الٰہی بخش اور زرداد کو لے کر بس اسٹاپ کی طرف چل پڑا۔ اس وقت صدر جانے والی بسوں میں رش نہیں تھا۔ انہوں نے مزے سے بیٹھ کر سفر کیا۔ نمائش کے اسٹاپ پر وہ اتر گئے۔ ''میں جیکب لائن میں رہتا ہوں۔ یہاں سے زیادہ قریب پڑتا ہے میرا گھر۔'' قاسم نے وضاحت کی۔

سڑک پر کوئی پانچ منٹ چلنے کے بعد وہ کچے پکے مکانوں کے علاقے میں پہنچ گئے۔ اب وہ تنگ گلیوں میں چل رہے تھے جہاں دونوں طرف مکان ہی مکان تھے۔ زیادہ تر مکان ایسے تھے کہ ان میں ٹاٹ کے پردے ہی دروازے کا کام کرتے تھے۔ ایسے ہی ایک دروازے پر انہیں ٹھہرا کر قاسم ٹاٹ کا پردہ ہٹا کے اندر چلا گیا۔ چند لمحوں بعد اس نے انہیں آواز دی ''آ جاؤ'' وہ پردہ ہٹا کے اندر چلے گئے۔

دروازے سے داخل ہوتے ہی چھوٹا سا صحن تھا۔ صحن کے پار دو کمرے تھے۔ ایک کچا کمرا تھا اور دوسرا پکا۔ پکے کمرے کی چھت ٹین کی چادروں کی تھی۔ سائیڈ میں باورچی خانہ اور غسل خانہ تھا۔ صحن کے اس طرف والے حصے میں بیت الخلا تھا۔ درمیان میں ایک ٹنکی رکھی تھی۔

قاسم نے درمیان میں پڑا پردہ کھینچ کر گویا پردے کا اہتمام کر دیا۔ اس طرف تین چار چارپائیاں پڑی تھیں۔ تکیے بھی رکھے تھے۔ قاسم نے اشارہ کرتے ہوئے کہا ''بیٹھ جاؤ اور تھکن ہو رہی ہو تو پاؤں پھیلا لو۔ یہ تمہارا اپنا گھر ہے۔''

الٰہی بخش اور زرداد بیٹھ گئے۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں، پھر قاسم زرداد کو بوجھ اٹھانے کے رموز سمجھانے لگا۔ الٰہی بخش توجہ سے سنتا رہا۔ وہ سوچ رہا تھا، کون جانے، یہ باتیں بھی کام آ ہی جائیں۔

وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ وہ لوگ تو اس وقت چونکے جب باہر سے کسی نے قاسم کو آواز دی ''استاد''

''لو، یہ لوگ بھی آ گئے۔'' قاسم نے کہا پھر دروازے کی طرف منہ کر کے پکارا۔ ''آ جاؤ یارو!''

ٹاٹ کا پردہ اٹھا اور سب سے پہلے مشتاق اندر آیا۔ وہ کسی چیز کو کھینچ رہا تھا دوسری طرف سے رحمو اس چیز کو دھکیل رہا تھا۔ قاسم اور وہ دونوں

اٹھ کھڑے ہوئے۔ اتنی دیر میں وہ لوگ اندر آ گئے تھے۔

قاسم، الٰہی بخش اور زرداد کی آنکھیں پھیل گئیں۔ وہ لوگ ایک ٹھیلا لئے تھے اور وہ بہت خوبصورت ٹھیلا تھا۔ ٹھیلے کو دیکھ کر قاسم کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ وہ آگے بڑھا اور ٹھیلے کو چھو کر دیکھنے لگا، جیسے وہ کوئی غیر حقیقی چیز ہو۔

''کیا دیکھ رہے ہو استاد، یہ تمہارا ہی ہے۔'' نثار نے کہا۔

''نئی زندگی مبارک ہو استاد!'' رحیمو بولا۔

قاسم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ ٹھیلے پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ پھر رندھی ہوئی آواز میں بولا ''میں تم لوگوں کی اس محبت کا شکریہ کیسے ادا کروں...''

''اس کی ضرورت نہیں استاد۔'' نثار نے اس کی بات کاٹ دی۔ قاسم کے بعد وہ سب سے سینئر تھا ''بس اللہ تمہیں اس ٹھیلے سے بہت رزق دے۔ یہ دعا قبول ہو گئی تو سمجھو، ہمیں محبت کا صلہ مل گیا۔''

دوسرے مزدوروں کی آنکھیں بھی چمکنے لگیں ''اتنی محبت کا تو حق دار تو نہیں تھا یارو۔'' قاسم منمنایا۔

''تم تو اس سے زیادہ محبت کے قابل ہو استاد۔ پر ہم سب غریب لوگ ہیں۔'' نثار بولا ''بس اب یہ ڈراما ختم کرو اور کھانا کھلواؤ۔'' عباس نے ماحول کو بدلنے کی کوشش کی لیکن قاسم تو کسی اور ہی دنیا میں کھویا ہوا تھا۔ وہ ٹھیلے پر ہاتھ پھیر رہا تھا لیکن اس کی آنکھیں دیوار کے پار، دور، کہیں بہت دور دیکھتی محسوس ہو رہی تھیں۔ پھر اس نے سحر زدگی کی سی کیفیت میں ٹھیلے کو دھکیل کر آگے بڑھایا اور بے ساختہ آواز لگائی ''آلو، بھنڈی، بینگن، توری لے لو، سبزی والا...'' اپنی آواز نے خود اسے بھی چونکا دیا۔ وہ خجالت سے ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اس کے ہونٹوں پر بے حد معصوم مسکراہٹ تھی۔

''لاؤ استاد، ایک سیر آلو بینگن!'' عباس نے شوخی سے کہا ''لیکن پکے ہوئے چاہئیں... روٹی کے ساتھ۔''

قاسم کو احساس ہو گیا کہ ان لوگوں کو بہت بھوک لگ رہی ہو گی۔ ''آج آلو گوشت ملے گا بیٹے!'' اسنے شرمندگی سے کہا ''ارے تم لوگ بیٹھو نا۔''

وہ سب بیٹھ گئے۔ قاسم پردہ ہٹا کر اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ہاتھ کی بنی ہوئی دو میزیں اٹھا لایا۔ وہ اس نے چارپائیوں کے درمیان رکھ دیں۔ ''تم لوگ ہاتھ دھو لو۔ میں کھانا لا رہا ہوں۔''

کھانے میں آلو گوشت تھا اور چنے کی بریانی تھی۔ وہ سب کھانے پر ٹوٹ پڑے۔ الٰہی بخش کو پردے کی اوٹ سے جھانکتی ہوئی آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔ وہ ٹھیلے کو دیکھ رہی تھیں اور آوازوں سے ان کی خوشی کا اندازہ ہو رہا تھا۔ الٰہی بخش کو اس لمحے ان مزدوروں پر ٹوٹ کر پیار آیا۔ انہوں نے اس گھرانے کو کتنی بڑی خوشی دی تھی۔ برتن اٹھانے کے لئے قاسم کا وہ بیٹا آیا جس کا اس نے الٰہی بخش سے تذکرہ کیا تھا۔ دیکھنے میں وہ دس سال کا بھی نہیں لگتا تھا۔ کھانے کے بعد گپ شپ ہوتی رہی۔ اس دوران ان لوگوں نے چائے پی۔ پھر قاسم نے ان سے پوچھا ''اب کیا ارادہ ہے؟''

''یہ تو ہمیں تم سے پوچھنا ہے استاد۔'' نثار نے کہا ''یہ تو معلوم ہو گیا کہ تم سبزی فروشی کا کام کرو گے۔''

''ہاں، تو اب پوچھنا کیا ہے۔''

''صبح منڈی جاؤ گے؟''

''ہاں۔'' قاسم نے اثبات میں سر ہلایا۔

''کس وقت جاؤ گے؟''

''صبح چار بجے جانا ہو گا۔''

''تو پھر استاد ہم بھی یہاں سے ٹلنے والے تو نہیں۔'' نثار نے کہا۔ اس پر قاسم نے حیرت سے دیکھا۔ اور پھر دوسروں کو جو سر تائید میں ہلا رہے تھے ''ہم تمہارے ساتھ منڈی چلیں گے۔'' نثار نے مزید کہا ''ہمارا رکنا مسئلہ ہو تو اور بات ہے۔ ہم چلے جائیں گے اور صبح چار بجے آ جائیں گے۔''

"ایسی کوئی بات نہیں۔ بس تم لوگوں کو تکلیف ہوگی۔" قاسم نے شرمندگی سے کہا۔ "اور پھر اس کی ضرورت کیا ہے۔"

"ضرورت تو ہے۔" مشتاق بولا۔

"اور ہم لوگوں کی تکلیف کی فکر مت کرو۔" رحمو نے کہا "ہم تو رات جگا کریں گے۔ چار بجے تک تاش کی پارٹی جمے گی یہاں۔"

"پر تم لوگوں کو صبح کام پر..."

"صبح اتوار ہے استاد!" نثار بولا "یہ بتاؤ، تاش کی دو گڈیاں ہیں تمہارے پاس۔"

"ہاں، ہیں تو... لیکن یہ رومنڈی چپنے کی ضرورت نہیں۔"

"تم اس بات کو چھوڑو استاد، تاش لے آؤ۔" رحمو نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

قاسم اندر گیا اور تاش کی دو گڈیاں لے آیا۔ وہ دو پارٹیوں میں تقسیم ہوئے اور ترپ چال کھیلنے لگے۔ الٰہی بخش قاسم، نثار اور رحمو کے ساتھ تھا۔ وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا۔ اندر بچے تو شاید سو گئے تھے لیکن قاسم کی بیوی نہیں سوئی تھی۔ اسی کی بدولت ان لوگوں کو چائے ملتی رہی۔

پھر اچانک عاقل کو خیال آیا "اب بس کریں استاد۔ میرا خیال ہے، وقت ہو گیا ہے۔" قاسم اور نثار نے آسمان کی طرف دیکھا۔ وہاں ابھی رات کا اندھیرا تھا۔ "ہاں وقت ہو گیا ہے۔ نثار نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"تم لوگ ہاتھ منہ دھو لو۔ پھر چلتے ہیں۔" قاسم نے کہا۔

پندرہ منٹ بعد وہ سب باہر نکل آئے۔ باہر لگتا تھا، پوری کائنات سو رہی ہے۔ وہ سنسان سڑک پر بے فکری سے دندناتے ہوئے چلتے رہے۔ الٰہی بخش، نثار کے ساتھ قدم ملا کر چلنے لگا۔ قاسم سب سے آگے تھا۔ اس کے ساتھ زرداد چل رہا تھا۔

"نثار بھائی!" اچانک الٰہی بخش نے سرگوشی میں کہا "اب تم لوگ قاسم چاچا کو سبزی فروٹ دلا دو گے نا؟"

نثار نے سر گھما کر اسے دیکھا "ہاں بخشے!" اس نے آہستہ سے جواب دیا۔

الٰہی بخش نے جیب سے تیس روپے نکال کر ہاتھ میں رکھ لئے تھے۔ وہ اس نے نثار کی طرف بڑھائے "میں بھی تمہارے ساتھ شامل ہونا چاہتا ہوں نثار بھائی!"

نثار نے اس کے ہاتھ کو دیکھا لیکن پیسے لینے کے لئے ہاتھ نہیں بڑھایا "اس کی ضرورت نہیں بخشے۔ ہمارے پاس ضرورت سے زیادہ پیسے ہیں۔ ہم سب بہت عرصے سے اس موقع کے لئے رقم بچا رہے تھے۔"

یہ بات نہیں نثار بھائی! میں تمہارے ساتھ شریک ہونا چاہتا ہوں۔ قاسم چاچا سے میرا بھی تعلق ہے۔"

"نہیں بخشے، ضرورت ہوتی تو میں ضرور لے لیتا۔"

"تم میرا دل توڑ رہے ہو۔ صرف اس لئے کہ میں تم میں سے نہیں ہوں۔" الٰہی بخش نے دل گرفتگی سے کہا۔

"یہ بات نہیں بخشے۔" نثار نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا "پر تو بھی تو مزدور ہے اور مزدور کا ہاتھ عام طور پر تنگ ہی رہتا ہے۔"

"یہ تو وہی پیسے ہیں جو مجھے صرف تمہارے ساتھ ہونے کی وجہ سے ملے ہیں۔ ان پر تو میرا حق ہی نہیں تھا۔ تم لوگوں نے زبردستی مجھے دے دیے۔ اب تم انہیں قبول نہ کر کے مجھے احساس دلا رہے ہو کہ میں بدرنگ ہوں۔"

"تو پاگل ہو گیا ہے۔ دیکھ بھائی، تو بھی مزدور ہے اور ہم بھی۔ یہ بڑا رشتہ ہوتا ہے۔ ہمارے دکھ سکھ ایک سے ہیں۔ مگر میری جان، یہ معاملہ برادری کا..." نثار کہتے کہتے رکا "برادری کا بھی نہیں، ٹولی کا معاملہ ہے یہ۔"

"ٹھیک ہے نثار بھائی!" الٰہی بخش نے اداس لہجے میں کہا "آئندہ میں اپنی حد میں رہوں گا۔"

نثار چند لمحے اسے دیکھتا رہا، پھر اس نے ہاتھ بڑھا دیا "لا، پیسے دے اور اب منہ مت لٹکا۔" اس نے الٰہی بخش سے نوٹ لے کر گنے۔ وہ تیس

روپے تھے۔ نثار جانتا تھا کہ گزشتہ روز کی مزدوری میں حصہ بائیس روپے بنتا تھا۔ یعنی اس میں آٹھ روپے الٰہی بخش نے اپنی جیب سے ملائے تھے جبکہ پچھلے روز اس نے کام بھی نہیں کیا۔ پورا دن بلکہ اب تک انہی لوگوں کے ساتھ لگا رہا تھا۔

نثار کا دل دکھنے لگا لیکن اب وہ الٰہی بخش سے حجت بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے خاموشی سے پیسے جیب میں رکھ لئے۔

وہ سب سبزی منڈی کی طرف چلتے رہے۔

منڈی دیکھ کر الٰہی بخش حیران رہ گیا۔ وہاں ایسی گہما گہمی، ایسا ہجوم تھا جیسے دن نکل چکا ہو۔ قاسم اپنے تھوڑے کر کے بچائے ہوئے پیسے لایا تھا اور اسی حساب سے مال خریدنا چاہتا تھا۔ نثار نے جو اسے پھلوں کی کئی پیٹیاں سبزی کے علاوہ دلائیں تو وہ حیران رہ گیا۔ اس کی آنکھیں پھر بھیگ گئیں "اس سب کی ضرورت نہیں تھی یارو! او ٹھیلا ہی بہت تھا۔" وہ بڑبڑایا۔

"بے کار باتیں مت کرو استاد!" رحمو بولا۔

واپسی کے سفر میں وہ لدے پھندے تھے اور بہت خوش تھے، جیسے وہ سب ہی کوئی نیا کام شروع کر رہے ہوں۔ گھر پہنچ کر انہوں نے ٹھیلا لدوانے میں قاسم کی مدد کی۔ سب بہت خوش تھے۔ ہر شخص بساط بھر مشورے دے رہا تھا۔ سبزیاں اور پھل لگ گئے تو ٹھیلا اور خوبصورت لگنے لگا۔

اس دوران سورج نکل آیا تھا۔ قاسم نے انہیں ناشتہ کرایا۔ سب نے ڈٹ کر چائے میں پاپے بھگو کر کھائے۔ پھر چلنے کا وقت آ گیا۔ قاسم کو ٹھیلا لے کر نکلنا تھا۔ اس کی نئی زندگی کا آغاز ہو رہا تھا۔

"استاد ہمیں اجازت دو۔" نثار نے کہا "ہم اب چلتے ہیں۔ تم بھی بسم اللہ کرو۔ اللہ تمہیں کامیاب کرے۔"

قاسم ممنونیت بھری بھیگی آنکھوں سے ایک ایک کو تکتا رہا۔ اس کے ہونٹ لرز رہے تھے، اسے احساس تھا کہ شکریہ بہت چھوٹا لفظ ہے۔ عباس نے بھرے ہوئے ٹھیلے کو ہلکے سے دھکیلا "وہ استاد! یہ تو پھول ہو رہا ہے، تمہارے تو مزے آ گئے!" اس نے شوخ لہجے میں کہا۔

اس پر سب کھلکھلا کر ہنس دیئے۔

☆

وہ دن اور رات الٰہی بخش کبھی نہیں بھولا، جو اس نے مزدوروں کے ساتھ گزارا تھا۔ اس نے ان سے بہت کچھ سیکھا تھا۔ زندگی کو بہت قریب سے دیکھا اور سمجھا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اس نے ایک دوسرے کے لئے ان کی محبت دیکھی تھی۔

محبت! بس اسی بات پر وہ جھنجلانے لگتا۔ کیا مصیبت ہے۔ جس چیز سے بھاگ کر وہ کراچی آیا ہے۔ وہ یہاں بھی موجود ہے۔ اسے یاد آیا، ایک بار اس کے باپ نے کہا تھا۔ محبت تو سبھی کرتے ہیں بیٹے اور جو لوگ خود سے نہیں کرتے، انہیں محبت کرنی پڑ جاتی ہے، اچھا یہی ہے کہ محبت کی عادت ڈال لے۔ اس سے اللہ بھی خوش رہتا ہے اور اپنا آپ بھی۔ جو آدمی محبت کرنا نہیں چاہتا، وہ بہت نقصان میں رہتا ہے۔ جب وہ محبت پر مجبور ہوتا ہے تو بہت بے بس ہوتا ہے۔ بہت تکالیف اٹھاتا ہے وہ۔ مزدوروں نے اس پر ثابت کر دیا تھا کہ وہ سب ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ شاید وہ محبت ان کی ضرورت تھی۔ ان کا روزگار، ان کے مفادات، ان کے دکھ سکھ جو مشترک تھے۔ پھر بھی وہ تھی تو محبت ہی، ورنہ انہیں قاسم کے لئے اتنا کچھ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ وقت نکل گیا تھا۔ قاسم اب ان کے لئے بیکار تھا، انہیں ان کی کوئی ضرورت نہیں تھی، اس سے کوئی غرض نہیں تھی، پھر انہوں نے یہ سب کچھ کیوں کیا۔ محبت؟ ... ہاں وہ محبت ہی تھی۔ الٰہی بخش کو اعتراف کرنا پڑا۔

قاسم کے سبزی فروٹ کے لئے پیسے تو اس نے بھی ملائے تھے۔ تو کیا یہ محبت تھی۔ ہرگز نہیں۔ انسیت۔ یہ بھی نہیں۔ تو پھر کیوں؟ بہت غور کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ اس کی خودداری، اس کی انا کا معاملہ تھا۔ اسے مزدوری کئے بغیر اجرت دی گئی تھی۔ جو اصرار کی وجہ سے اسے لینی پڑی تھی۔ وہ اس کے سوا اور کیا کر سکتا تھا کہ کسی بھی بہانے سے اس میں مزید اپنی رقم ملا کر انہیں لوٹا دے اور بہانہ موجود تھا۔

الٰہی بخش کو مایوسی ہوئی، کیا وہ محبت کی اہلیت ہی نہیں رکھتا۔ اس نے یاد کرنے کی کوشش کی کہ کبھی اس نے کسی سے محبت کی ہو۔ لیکن نہیں۔ اسے تو شاید ماں باپ سے بھی محبت نہیں۔ کراچی آنے کے بعد اس نے ابا کو صرف ایک خط لکھا تھا اور گھر کے لوگ اسے کبھی یاد بھی نہیں آتے تھے۔ وہ یہاں خوش تھا۔

اس دن کے بعد سے محبت الٰہی بخش کے سر پر سوار ہو گئی۔ صبح سویرے اپنے ٹھکانے پر آ کر بیٹھتا تو گردوپیش کی ویرانی اور اپنی تنہائی میں وہ محبت اور عشق کے بارے میں سوچتا رہتا۔ اسے باپ کی باتیں یاد آتیں۔ گردوپیش میں زندگی بیدار ہوتی تو وہ چونکتا اور اس پر غور کرتا کہ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی محبت کے بارے میں کیوں سوچتا رہتا ہے۔ اس سے بہتر ہے کہ وہ محبت ہی کر لے۔

درحقیقت وہ خوف زدہ تھا۔ باپ کی بات کے حوالے سے اسے خوف آتا تھا۔ کیا محبت نہ کرنے کی سزا میں اسے ایسی محبت ہو گی کہ جو اسے مجبور اور بے بس کر کے رکھ دے گی۔ وہ یہ سوچتا اور لرز جاتا۔ وہ عشق اور محبت سے گھبرا کر ہی تو گھر چھوڑ کر بھاگا تھا۔

لیکن اسے اندازہ نہیں تھا کہ اسے پردیس میں محبت ہو گی، جس کے سامنے وہ بے بس ہو جائے گا اور یہ محبت کے خلاف مزاحمت کا ردِعمل ہو گا۔

وہ یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ اب وہ وقت آ پہنچا ہے!

☆

ملنگ نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ الٰہی بخش اسے بھول گیا تھا لیکن پھر ایک روز کالج کا پروفیسر آ گیا اور اس نے اسے ملنگ کی یاد دلا دی۔

صبح سویرے آ کر سنسان فٹ پاتھ پر بیٹھنے والا الٰہی بخش جو زندگی کے بارے میں سوچا کرتا تھا، اس صبح مضطرب تھا۔ اور اس کی سمجھ میں اضطراب کی وجہ بھی نہیں آ رہی تھی۔ وہ اٹھ کر ادھر اُدھر ٹہلتا رہا۔ گردوپیش میں زندگی سوئی ہوئی تھی۔ کہیں کوئی بھی نہیں تھا۔

ٹہلتے ہوئے واپس آنے کے لئے پلٹا تو وہ کسی سے ٹکرا گیا۔ پیوند لگا سفید کرتہ پاجامہ پہنے ہوئے وہ شخص پہلی نظر میں اسے بھکاری لگا۔ اس کے بال بہت بڑھے ہوئے تھے۔ کندھوں تک آ رہے تھے۔ بڑی بڑی سرخ آنکھیں تھیں۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اس کی عمر کا اندازہ لگانا ناممکن تھا، بلکہ وہ یہ بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ بوڑھا ہے یا نوجوان۔ جوان ہے یا ادھیڑ عمر۔ ایک پل میں اسے اس کی آنکھوں سے خوف آنے لگا۔

"دیکھ کے چل۔" اس شخص نے اسے ڈانٹا "آدمی کو اپنی راہ کا تو پتا ہونا چاہئے کہ چل کہاں رہا ہے۔"

الٰہی بخش نے سمجھ لیا کہ وہ شخص بھکاری نہیں ہے "معاف کیجئے بابا۔" اس نے معذرت کی۔

"بھگوڑوں کو معافی نہیں ملتی اندھے۔" اس شخص نے گرج کر کہا "بھوگنا تھا تو آنکھیں بھی کھلی رکھی ہوتیں۔ بھاگتے بھاگتے بیچ بازار میں آ بیٹھا۔ یہاں تو کوئی بھی جھولی میں وہ چیز ڈال دے گا، جس سے تو بھاگ رہا ہے۔"

الٰہی بخش سہم گیا۔ کچھ کچھ سمجھ میں آ رہا تھا کہ بات ٹھیک ہے۔ "پر میں تو بھگوڑا نہیں ہوں بابا۔" اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"بھاگتے بھاگتے پردیس آ گیا پھر بھی کہتا ہے، بھگوڑا نہیں ہوں۔"

اب الٰہی بخش کی سمجھ میں بات پوری طرح آنے لگی۔ وہ کوئی مجذوب تھا۔ "یہاں میں محفوظ ہوں بابا جی۔"

"جن کے پیروں سے بھنور باندھ دیئے گئے ہوں، وہ ڈوبنے سے نہیں بچتے۔ تجھے بھی ڈوبنا ہے۔ ڈوب کر رہے گا۔"

"پھر میں کیا کروں بابا؟" الٰہی بخش نے بے بسی سے پوچھا۔

"دیکھا کر کہ قدموں کے نیچے کون سا راستہ ہے۔" مجذوب نے نرم لہجے میں کہا۔ "دیکھے گا تو منہ کے بل نہیں گرے گا۔ راستہ بدلنے کا تجھے اختیار نہیں۔ نظر نیچی رکھنے میں عافیت ہے۔ نظر اٹھا نامت۔ اٹھ لے تو خاموشی سے ڈوب جانا۔ شکایت نہ کرنا۔" مجذوب اپنے راستے پر چل دیا، مگر دو قدم بڑھنے کے بعد پلٹا۔ "بس نظر جھکائے رکھ۔" اس نے کہا۔ "لیکن یہ تجھ سے ہو گا نہیں۔"

اب الٰہی بخش جیسے سحر زدہ ہو چکا تھا۔ اس نے پوچھا ''آپ کون ہیں بابا؟''

''عاشق ہوں، پروفیسر ہوں، ایکٹر ہوں، تجھے کیا۔'' مجذوب نے کچھ ایسی کیفیت میں کہا کہ ہر لفظ کی ضرب الٰہی بخش کو اپنے دل پر پڑتی محسوس ہوئی۔ خواہ مخواہ بے بات اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے'' تو اپنی دیکھ۔'' مجذوب اپنی کہے جا رہا تھا'' اور سوچ کہ تیری فکر اوروں کو کیوں ہے۔ اپچھلے کو بھول گیا نا!''

الٰہی بخش مجذوب کو جاتے دیکھتا رہا۔ وہ سوچ رہا تھا، یہ کون تھا اور وہ ملنگ ایبٹ آباد والا مجھ سے ان کا کیا تعلق ہے۔ یہ سوال ایبٹ آباد میں بھی اسے الجھاتا تھا۔ پھر وہ یہ سوچ کر پر سکون ہو جاتا تھا کہ وہ ابا کی باتیں سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا، اس لئے سزا کے طور پر زیادہ پیچیدہ باتیں کرنے والا اس پر تھوپ دیا گیا۔

مگر کہاں سے؟ کس نے تھوپا ہے؟ اس کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

☆......☆......☆

الٰہی بخش کو پہلی نظر میں عشق ہوا تو یہ کوئی حیرت کی بات نہیں۔ اس کا خمیر ہی عشق کی مٹی سے اٹھا تھا لیکن یہ عشق کہاں، کس جگہ، کس انداز میں ہوا، اس پر مزید حیرت کی جا سکتی ہے۔

الٰہی بخش کو ایک بڑا کام ملا تھا جو اس نے چار دن میں نمٹایا تھا، اجرت کے علاوہ انعام بھی ملا تھا لہٰذا جیب بھری تھی۔ وہ بے فکروں کی طرح مست بیٹھا تھا۔ صبح سے کام نہیں ملا تو اس کی اسے پروا بھی نہیں تھی۔ اس روز وہ کام کرنا چاہتا بھی نہیں تھا، البتہ کام مل جاتا تو وہ انکار بھی نہ کرتا۔ یہ مزدوری کے اصول کی بات ہے، ورنہ دل تو اس کا یہی چاہتا تھا کہ اس روز گھر بیٹھ کر آرام کرے، چار دن کی تھکن اتارے لیکن اپنے کام میں نوکری سے زیادہ پابندی کرنا پڑتی ہے۔ الٰہی بخش جانتا تھا کہ یہ آزادی کی قیمت ہے، اس لئے وہ معمول کے مطابق اپنا محنت کا شوکیس لگائے بیٹھا تھا۔

شام ہو گئی تھی۔ طارق روڈ کی رونق اپنے شباب پر تھی۔ الٰہی بخش کو یہ وقت بہت اچھا لگتا تھا۔ عام طور پر وہ اسی رونق کی خاطر دیر تک رکا رہتا تھا۔ کسی دن تھکن بہت زیادہ مجبور کرتی تو شام کو جلدی گھر چلا جاتا، ورنہ رات کا کھانا کھا کر ہی جاتا۔

وہ اپنے معمول کے مطابق نظریں جھکائے بیٹھا تھا۔ نظریں وہ کم ہی اٹھاتا تھا۔ اچانک اسی جگہ جہاں اس کی نظریں جمی تھیں، ایک شاپنگ بیگ گرا اور اس طرح گرا کہ اس کی تمام چیزیں بکھر گئیں۔ کچھ کپڑے تھے، کچھ بال پن اور کچھ ایسی چیزیں جو اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ ساتھ ہی ایک سریلی آواز سنائی دی ''او مائی گاڈ!''

الٰہی بخش نے سر اٹھا کر دیکھا...... اور دیکھتے کا دیکھتا رہ گیا۔ وہ بے حد حسین لڑکی تھی۔ عمر اٹھارہ انیس کے لگ بھگ ہو گی۔ اس کا چہرہ کندن کی طرح دمکتا ہوا تھا۔ آنکھیں کٹوروں سی تھیں۔ نقوش ایسے تھے جیسے بڑی نزاکت اور نفاست سے تراشے گئے ہوں۔ بالائی ہونٹ کے اوپر پسینے کے قطرے یوں چمک رہے تھے جیسے صبح کے وقت گلاب پر شبنم، اور جسم جیسے سانچے میں تیار کیا گیا تھا۔ لڑکی کے ہونٹ یوں کھلے ہوئے تھے جیسے وہ ابھی تک پکار رہی ہو...... او مائی گاڈ!

الٰہی بخش اسے ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ اسے اس لڑکی کے سوا کچھ بھی یاد نہیں تھا۔ اسے یہ احساس بھی نہیں تھا کہ وہ رنگ کے ڈبے اور برش لگائے ایک فٹ پاتھ پر بیٹھا ہے۔ وہ زمان و مکاں سے دور ہو گیا تھا۔

''اب دیکھ کیا رہی ہو، اٹھاؤ نا۔''

اس آواز نے الٰہی بخش کو چونکا دیا۔ پہلی بار اسے احساس ہوا کہ لڑکی کے ساتھ کوئی اور بھی ہے، وہ ایک معمر خاتون تھیں۔ ان کے چہرے پر اور آنکھوں میں برہمی تھی۔ الٰہی بخش کو احساس ہو گیا کہ وہ جس طرح لڑکی کو دیکھ رہا تھا، وہ لڑکی کی ماں نے دیکھ لیا ہے اور ظاہر ہے، اسے یہ بات اچھی نہیں لگی ہے۔

الٰہی بخش نے نظریں جھکا لیں۔ اب اس کے سامنے لڑکی کی بکھری ہوئی چیزیں تھیں۔ وہ شرمسار تھا کہ اس نے ایسی معیوب حرکت کی۔

"ابھی سیمیٹتی ہوں ممی!" اس نے لڑکی کی سریلی آواز سنی۔

اگلے ہی لمحے لڑکی جھکتے ہوئے خود اس کی نظروں کے فوکس میں آئی اور یوں آئی کہ اس کے دل کی دنیا زیروزبر ہوگئی۔ لڑکی کا آنچل ڈھلک گیا تھا۔ جیسے دہکتے ہوئے لفظوں کی کوئی کتاب کھل گئی تھی۔ وہ نظارہ الٰہی بخش کے لئے بالکل نیا تھا۔ وہ اسے اچھا بھی نہیں لگا لیکن دل چاہا کہ دیکھتا ہی رہے۔ اسے اپنے کانوں کی لویں انگارا ہوتی اور چہرہ تمتماتا محسوس ہوا۔ تپش سے گھبرا کر اس نے نظریں اٹھائیں تو سامنے لڑکی کی ماں کی شرربار نگاہیں تھیں۔ وہ گھبرا کر سامنے دیکھنے لگا۔ اس لمحے اسے اپنا آپ بہت چھوٹا، بہت حقیر محسوس ہو رہا تھا۔

جانے کب تک وہ یونہی سامنے دیکھتا رہا۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں سما جائے۔ نظریں ہٹیں تو اسے پتا چلا کہ وہ دونوں جانے کب کی جا چکی ہیں۔ اس نے اطمینان کی سانس لی اور نظریں جھکا دیں۔

لیکن اس کا اطمینان وقتی ثابت ہوا۔ اس کی جھکی ہوئی نظروں کے سامنے لڑکی کا چہرہ ابھر آیا، اور وہ جیسے تصور نہیں، جیتا جاگتا، سانس لیتا چہرہ تھا کہ وہ ہاتھ بڑھائے اور چھوئے۔ اس نے سر جھٹکا تو لڑکی کی ماں کی شرربار نگاہیں سامنے آگئیں۔ اس نے گھبرا کر سر گھمایا تو وہ نظارہ سامنے آگیا جس کی تپش وہ اب تک محسوس کر رہا تھا، اس نے اسے جھٹکنے کے لئے پلکیں جھپکیں تو لڑکی کا چہرہ پھر سامنے تھا۔

اب تو ان تینوں جھلکیوں کی آنکھ مچولی شروع ہوگئی۔ پھر ان میں سے شرربار نگاہوں والی جھلک جیسے کسی خودکار طریقے سے خارج ہوگئی اور کچھ دیر بعد صرف لڑکی کا چہرہ رہ گیا جو نظروں کے سامنے سے ہٹنے کے لئے تیار نہیں تھا۔

وہ اسی طرح بیٹھا رہا۔ پھر اس نے ایک راہ گیر سے وقت پوچھا۔ سن کر اسے یقین ہی نہیں آیا کہ سوا آٹھ بج چکے ہیں لیکن یہ سچ تھا کہ رات ہو چکی تھی۔ الٰہی بخش کو حیرت اس پر بھی تھی کہ اسے اب تک بھوک نہیں لگی۔ عام طور پر وہ آٹھ بجے کھانے سے فارغ ہو جاتا تھا اور یہ بات تو بالکل ہی ناقابل یقین تھی کہ اس نے اتنا وقت یونہی بیٹھے بیٹھے صرف وہ چہرہ دیکھتے گزار دیا ہے۔ ایسا تو پہلے کبھی نہیں ہوا تھا، اس کے تصور میں تو کبھی ابا اور اماں کے چہرے بھی نہیں آئے تھے۔

بہرحال وہ اٹھ گیا۔ یہ بات ابھی اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ اسے محبت ہوگئی ہے۔

بھوک نہیں تھی پھر بھی وہ ہوٹل میں چلا گیا۔ بھوک ہو نہ ہو، کھانا کھانا ضروری ہے، آدھی رات کو گھر میں بھوک لگی تو بڑا مسئلہ بن جائے گا۔ یہ سوچ کر وہ کھانا زہر مار کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن چند لقموں سے زیادہ اس سے کھایا نہیں گیا۔ یہ بھی غیر معمولی بات تھی، ورنہ بھوک اسے ہمیشہ بہت اچھی لگتی تھی اور وہ کھانا بھی طبیعت سے کھاتا تھا۔ پھر یہ بے رغبتی کیوں۔ جبکہ اسکی کوئی ظاہری وجہ بھی نہیں تھی۔ پورا دن اسنے معمول کے مطابق گزارا تھا۔ دوپہر کا کھانا ہمیشہ کی طرح ساڑھے بارہ بجے کھاتا تھا۔ ہر روز اسے شام سات بجے بھوک لگنے لگتی تھی اور آٹھ بجے وہ رات کا کھانا کھا لیتا تھا۔

اسی الجھن میں وہ گھر پہنچ گیا۔ اسے احساس تھا کہ اس کی زندگی میں کوئی بن بلایا انقلاب آچکا ہے۔ گھر میں رہنے والے ساتھیوں سے بھی اس نے اس روز کوئی گپ شپ نہیں کی۔ ان کے ساتھ تاش کے لئے بھی نہیں بیٹھا۔ بہانہ اس نے یہ کیا کہ تھکن کی وجہ سے نیند جلدی آرہی ہے لیکن درحقیقت اس کی آنکھوں میں نیند کا نام ونشان بھی نہیں تھا وہاں تو بس ایک ضدی چہرہ جم کر بیٹھ گیا تھا۔

وہ آنکھیں بند کئے لیٹا اس چہرے کو تکتا رہا۔

اسے نیند بھی ہمیشہ بہت اچھی آتی تھی۔ گہری اور پرسکون نیند۔ اب جب بھی اسے جگانے کی کوشش کرتے تو جھنجلا جاتے "یہ لڑکا کیسا بے خبر سوتا ہے۔" وہ اماں سے کہتے "کوئی آکر اسے کاٹ بھی ڈالے تو اسے پتا نہیں چلے گا۔"

"کیسی باتیں کرتے ہو!" اماں خفا ہو کر کہتیں "سوچ سمجھ کر منہ سے لفظ نکالا کرو۔"

"تو یہ اٹھتا کیوں نہیں۔"

"بچپن ہی سے مدہوش سوتا ہے یہ تو۔" اماں کہتیں۔ "اور یہ تو ایسا وقت پر سونے اور اٹھنے والا ہے کہ کانٹوں پر لیٹ کر بھی سو جائے۔"

اور اب وہ مدہوش سونے والا، اپنے وقت پر کانٹوں پر بھی سو جانے والا الٰہی بخش وقت گزر جانے کے بعد بھی جاگ رہا تھا۔ تاش کی محفل کب کی

اٹھ چکی تھی۔ سب لوگ کب کے سو چکے تھے۔ رات کا مخصوص سکوت طاری تھا اور وہ کروٹیں بدلے جا رہا تھا۔ آنکھیں بند کرتا تو وہ چہرہ سامنے آ جاتا آنکھیں کھولتا تو بے چینی ہونے لگتی۔ وہ جھنجلاتا اپنے بال نوچنے کو سر پیٹنے کو جی چاہتا۔ بس آنکھیں بند کرنے سے سکون ملتا تھا اور آنکھیں بند کرتے ہی وہی چہرہ اور وقت بہت آہستہ آہستہ گزر رہا تھا۔ رات کی سانسیں اکھڑتی گئیں۔ وہ مضمحل ہوتی گئی لیکن الٰہی بخش کو نیند نہیں آئی۔ وہ آنکھیں کھولتا تو جلتا، کڑھتا اور جھنجلاتا آنکھیں بند کرتا تو وہ چہرہ اسے پرسکون کر دیتا مگر پھر بے بسی کا احساس ستانے لگتا۔ اپنی خوشی سے جاگنے کی اور بات ہے لیکن یوں وہ کبھی نہیں جاگا تھا۔

''یہ کیسی بے بسی ہے؟'' وہ بڑبڑایا۔

اسی لمحے فجر کی اذان شروع ہو گئی۔ یہ اس کے معمول کے مطابق اٹھنے کا وقت تھا لیکن وہ اٹھا نہیں ''یہ کیسی بے بسی ہے۔'' اس نے دہرایا۔

''اللہ بہت بڑا ہے۔'' موذن پکار رہا تھا۔

''یہ کیسی بے بسی ہے؟'' الٰہی بخش بڑبڑا رہا تھا۔

''میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔''

''میں سو کیوں نہیں سکتا۔ یہ کیسی بے بسی ہے؟''

''آؤ نماز کی طرف! آؤ بھلائی کی طرف۔''

''یہ سب کیا ہے۔ میں اتنا بے بس کیوں ہو گیا ہوں؟''

''نماز نیند سے بہتر ہے۔''

''یہ کیسی بے بسی ہے؟''

موذن نے آخری بار اللہ کی کبریائی کا اور اس کے سوا کسی معبود کے نہ ہونے کا اعلان کیا۔ اس کے ساتھ ہی ایسا سکوت طاری ہو گیا جیسے پوری کائنات ساکت ہو گئی ہو۔ چند لمحوں کے اس سکوت نے الٰہی بخش کو اس کے سوال کا جواب دے دیا۔ اس کے کانوں میں ابا کی آواز گونجی ''جو لوگ خود سے محبت نہیں کرتے، انہیں محبت کرنی پڑ جاتی ہے۔ جو آدمی محبت کرنا نہیں چاہتا، وہ بہت نقصان میں رہتا ہے۔ جب وہ محبت پر مجبور ہوتا ہے تو بہت بے بس ہوتا ہے، بہت دکھ اٹھاتا ہے وہ۔''

''تو یہ بے بسی اسی لئے ہے'' الٰہی بخش نے خود سے کہا۔ اس لمحے اسے پوری طرح ادراک ہو گیا کہ اسے محبت ہو گئی ہے۔ محبت پہلی نظر میں اور ایک ایسی لڑکی سے جس کا وہ کسی طرح ہمسر نہیں ہے۔ وہ دولت مند گھرانے کی فیشن ایبل لڑکی تھی جبکہ وہ ایک دیہاتی مزدور تھا۔ اس نے سمجھ لیا کہ اسے باپ کی بات نہ ماننے کی محبت کے سامنے سر تسلیم خم نہ کرنے کی سزا محبت ہی کی شکل میں دی گئی ہے۔ اب وہ بے بس اور مجبور رہے گا۔ نہ اپنی مرضی سے کھا سکے گا نہ اپنی مرضی سے سو سکے گا۔

اچانک ہی اسے طمانیت کا احساس ہونے لگا۔ اس نے سوچا، یہ تو بس چند روز کی سزا ہے۔ اب وہ لڑکی کہاں مل سکے گی۔ وہ تو شاید زندگی میں کبھی نظر بھی نہ آئے۔ چند روز بعد وہ سب کچھ بھول جائے گا۔ بلکہ ممکن ہے، آج ہی ... لیکن کوئی نامعلوم حس اسے بتا رہی تھی کہ یہ معاملہ اتنا آسان نہیں۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ بیت الخلا سے آنے کے بعد ٹنکی کے سامنے ہاتھ دھونے بیٹھا تو اسے احساس بھی نہیں ہوا کہ وہ وضو کر رہا ہے۔ احساس ہوا تو پہلے اسے حیرت ہوئی اور پھر پچھتاوا سر میں ڈنک مارنے لگا۔ وہ تو ہمیشہ اسی وقت جاگتا رہا ہے۔ پھر کیوں اسے نماز کا خیال نہیں آیا۔

اس نے دروازہ کھولا اور باہر نکل آیا۔ اس کے قدم مسجد کی طرف اٹھ رہے تھے۔ محبت اسے نماز کی طرف لے جا رہی تھی۔

☆

دن سست روی سے گزرتے رہے۔ الٰہی بخش ہر روز اپنی امید کو آنے والے کل کے سپرد کر دیتا۔ اس کی دلیل معقول تھی۔ جسے اب بھی ملنا نہیں تھا، دل کب تک اس کی محبت میں غرق رہ سکتا ہے۔ کب تک آنکھیں اس ایک جھلک کے عکس کو بچا سکیں گی۔ مگر معاملہ برعکس تھا۔ محبت کی دیوانگی ہر روز فزوں تر ہوتی جا رہی تھی۔ عکس آنکھوں میں گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ دو مہینے اسی طرح گزر گئے تو الٰہی بخش نے حقیقت تسلیم کر لی۔ اس نے مان لیا کہ بات اگرچہ آگے بڑھنے والی نہیں لیکن یہ روگ عمر بھر کا معلوم ہوتا ہے

اسے احساس تھا کہ وہ خود بدل گیا ہے۔ اس کے معمولات بدل گئے ہیں۔ سب کچھ بے ترتیب ہو گیا تھا۔ بھوک لگتی تو وہ کھانا کھا لیتا۔ نہ لگتی تو نہ کھاتا۔ نیند آتی تھی مگر پہلے کی طرح نہیں۔ اب وہ بے سدھ ہو کر نہیں سوتا تھا۔ وہ خوش مزاج بھی نہیں رہا تھا۔ بہت کم آمیز ہو گیا تھا وہ۔ کسی سے بات کرنے کو اس کا جی نہیں چاہتا تھا۔ گھر کے ساتھی بھی اس سے شاکی رہنے لگے تھے۔ مزدوروں کی ٹولی نے بھی اس میں تبدیلی محسوس کر لی تھی۔

اس لڑکی کی دید کو دو ماہ ہوئے تو الٰہی بخش نے شکست تسلیم کر لی۔ مزید ایک ماہ گزرا تو اس میں اور تبدیلی آئی۔ تسلیم کے بعد سپردگی کا مرحلہ آیا۔ اس نے خود کو اس محبت کے سپرد کر دیا، جو خود اسے ناقابل یقین حماقت لگتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس کی تنگ مزاجی رخصت ہو گئی۔ وہ آدم بیزار نہیں رہا۔ مزاج میں بڑی نرمی اور حلیمی آ گئی۔ اس کا لہجہ نرم اور آواز شیریں ہو گئی۔ اس کی متحمل مزاجی بھی بڑھ گئی تھی۔ کم گو اور کم آمیز وہ اب بھی تھا مگر کوئی مخاطب ہوتا تو وہ بڑی توجہ سے بات سنتا اور بے حد رسان سے جواب دیتا۔ اس کی آنکھوں کی چمک بھی بڑھ گئی تھی۔ اس سے آنکھ ملا کر بات کرنا اب آسان نہیں رہا تھا۔ یہ الگ بات کہ وہ عموماً نظریں اٹھا کر بات ہی نہیں کرتا تھا۔

سب سے زیادہ مزدوروں کی ٹولی اس کی تبدیلیوں پر حیران تھی۔ وہی اسے سب سے قریب سے دیکھ بھی رہے تھے۔

نظریں جھکا کر بازار کی رونق سے لطف اندوز ہونے والا الٰہی بخش اب نظریں اٹھا کر اس رونق کو دیکھتا بلکہ ٹٹولتا تھا۔ وہ دور و نزدیک ہر چہرے کو غور سے دیکھتا، جیسے اسے کسی خاص چہرے کی کسی خاص شخص کی تلاش ہو، اگر اس کی نگاہوں میں معصومیت نہ ہوتی تو وہ یہی سمجھتے کہ طارق روڈ نے اسے خراب کر دیا ہے۔ پہلے تو وہ عورتوں کو نظر اٹھا کر دیکھتا ہی نہیں تھا، حالانکہ دل میں گدگدی کرتے ہوئے گزرنے والی خوشبو اور چھو کر گزرنے والی لباس کی سرسراہٹوں کے سامنے مدافعت کرنا آسان نہیں ہوتا۔ اب وہ عورتوں، لڑکیوں کو خاص طور پر دیکھتا مگر اس کی نظروں میں معصومیت اور ایک بے نام سے تجسس کے سوا کچھ نہ ہوتا۔ دیکھنے والے دیکھ رہے تھے کہ کام میں اس کی دلچسپی کم ہوئی ہے۔ کام آتا تو وہ زیادہ مزدوری طلب کرتا۔ اس سے اندازہ ہوتا کہ وہ کام سے بچنے کی کوشش کر رہا ہے۔ پہلے وہ اٹھ کر ادھر ادھر گھومتا اور باتیں کرتا تھا مگر اب وہ بس اپنی جگہ بیٹھا خریداری کے لئے آنے والوں کو تکتا رہتا۔

مزدور بہت پریشان تھے۔ نثار نے تو کہہ دیا تھا کہ یہ ساری علامات عشق کی ہیں۔ ضرور اپنے محلے میں اسے کسی سے عشق ہو گیا ہے۔ دوسروں کے دل کو بھی یہ بات لگتی تھی مگر ایک بار الٰہی بخش کے ساتھ رہنے والا کرامت اس سے ملنے آیا تو مسئلہ اور پیچیدہ ہو گیا۔

نثار نے کرامت سے بھی یہی بات کہی۔

''نہیں جی، یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔'' کرامت نے شدت سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا ''وہاں تو یہ صرف سونے کے لئے جاتا ہے۔ رات نو بجے کے قریب گھر پہنچتا ہے اور فوراً ہی سونے کے لئے لیٹ جاتا ہے۔ صبح سات بجے یہاں آنے کے لئے گھر سے نکل پڑتا ہے۔ اس نے تو کبھی کسی پڑوسی کی صورت ہی نہیں دیکھی۔ کسی پڑوسن سے عشق کیا کرے گا۔''

نثار کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ وہ تو اسی ایک امکان پر تکیہ کئے بیٹھا تھا۔ وہ اس طرح رد ہوا تو اس کی عقل ہی جواب دے گئی۔ چند لمحے بعد اس نے سنبھل کر کہا ''تو پھر؟''

''ہم لوگوں کا خیال ہے کہ یہیں پر کوئی چکر چلا ہے۔'' کرامت نے آنکھ دباتے ہوئے کہا۔

"یہاں۔" نثار نے آنکھیں پھیلاتے ہوئے کہا" یہ تو پیارے بھائی جادوگری ہے۔ یہاں کوئی عشق نہیں کرسکتا۔ یہ تو بنجر میدان ہے جہاں پھول نہیں کھل سکتے۔ پھول آتے ہیں، جادو سے یہ باغ بن جاتا ہے، پھول چلے جاتے ہیں تو پھر میدان اور ریت! یہاں عشق کیسے ہوسکتا ہے۔"

"تم لوگ کام پر کس وقت آتے ہو؟" کرامت نے پوچھا۔

"ساڑھے نو بجے، زیادہ جلدی آگئے تو نو بجے۔"

"لیکن یہ بخش سات بجے گھر سے نکلتا ہے۔ ساڑھے سات بجے یہاں آجاتا ہوگا۔"

"اس وقت تو یہ سالو بول رہے ہوتے ہیں۔" مشتاق بولا۔

"تو یہ بخشا یہاں اتنی دیر کیا کرتا ہے؟" کرامت نے سوال اٹھایا" میرا تو خیال ہے ایسے ہی وقت میں یہاں کوئی چکر چلالیا ہے اس نے۔"

"مگر یہاں تو کوئی ہوتا ہی نہیں۔" اچھو نے کہا۔

"ارے یہیں فلیٹ بھی تو ہیں۔" کرامت نے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔

"لیکن پورے دن تو اسے کسی فلیٹ کی طرف متوجہ ہوتے نہیں دیکھا۔" عباس بولا" ایسی کوئی بات ہوتی تو نظر میں ضرور آتی۔"

"یہ بخشو ہے بہت گہرا آدمی، راز چھپانا اسے آتا ہے۔" نثار نے گہرا سانس لے کر کہا" خیر، میں خود دیکھوں گا کسی دن۔"

محفل برخاست ہوگئی۔ کرامت پھر کسی دن آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔

☆

الٰہی بخش کو اندازہ نہیں تھا کہ لوگ اسکے بارے میں کتنے پریشان ہو رہے ہیں۔ اسے پتہ کیا چلتا۔ وہ تو سرشاری کی عجیب ہی کیفیت میں تھا۔ اسے دوسروں کو دیکھنے اور سمجھنے کا ہوش ہی کہاں تھا۔ یہ کیا کم تھا کہ اسنے ایک بہت اہم بات سمجھ لی تھی۔ وہ یہ کہ اسے پہلی نظر میں عشق ہوگیا ہے۔

اب تو اس کے دل میں ابا کی بات کا خوف بھی نہیں تھا۔ یہ خیال ہی دل سے نکل گیا تھا کہ یہ محبت سزا ہے۔ وہ سوچتا، اگر یہ سزا ہے تو اتنی سخت سزا بھی نہیں۔ اس میں تو عجیب مستی، بے خودی ہے، اپنا آپ اچھا لگنے لگا ہے، ہاں کبھی کبھی ایک لمحے کے لئے اک خلش ستاتی، کاش وہ اس لڑکی کو پھر دیکھ سکے! مگر وہ فوراً ہی اس خلش کو جھٹک دیتا۔ اس نے خود سے بہت طویل بحث کی تھی اور اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ اس لڑکی کو دوبارہ دیکھنا، اس کے بارے میں جاننا اس کے لئے بہتر نہیں۔ سادہ سی حقیقت یہ تھی کہ محبت اپنی جگہ، لیکن وہ لڑکی اس کے لئے نہیں ہے۔ وہ حیثیت اور مرتبے میں اس سے بہت اوپر ہے۔ وہ مختلف ماحول کی لڑکی ہے، اس سے بہتر تو شاید اس کے ملازم ہوں گے۔

سو الٰہی بخش مطمئن تھا کہ اسے اس لڑکی کو دوبارہ دیکھنے کی کوئی خواہش نہیں۔ اسے احساس بھی نہیں تھا کہ غیر شعوری طور پر وہ اسکی جستجو کر رہا ہے۔ خود کو سمجھنا دنیا کے مشکل ترین کاموں میں سے ایک ہے۔ بعض اوقات تو آدمی کو برسوں پتا نہیں چلتا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ اسنے تھوڑا سا غور کرلیا ہوتا تو بات اسکی سمجھ میں بھی آجاتی مگر اسے تو خیال ہی نہیں آیا کہ وہ اب نظریں جھکا کر نہیں بیٹھتا بلکہ نظروں سے چہروں کے ہجوم کو کھنگالتا رہتا ہے۔

اپنی کسی تبدیلی کا احساس انسان کو خود نہ ہو تو دوسرے احساس دلا دیتے ہیں۔ اس کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا۔

الٰہی بخش کو یہ احساس بھی نہیں تھا کہ وہ ایک گھر میں ساتھ رہنے والوں کے لئے اور مزدوروں کی ٹولی کے لئے کیسا پیچیدہ معمہ بن گیا ہے۔

کوئی دو ہفتے بعد کرامت پھر آیا۔ اس روز الٰہی بخش کو کام مل گیا تھا۔ وہ موجود نہیں تھا" کیا رہا استاد میری بات درست نکلی نا" کرامت نے نثار سے پوچھا۔

"نہیں، ایسا نہیں ہے۔" نثار نے کہا" میں نے تین دن ساڑھے سات بجے صبح یہاں آکر دیکھا ہے۔ وہ کچھ بھی نہیں کرتا سر جھکائے بیٹھا رہتا ہے۔ میں نے اسے ایک منٹ کے لئے بھی یہاں سے اٹھتے نہیں دیکھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ وقت وہ کیسے گزار لیتا ہے۔ مجھے تو لگ رہا تھا کہ

میں پاگل ہو جاؤں گا۔"

"تو پھر......" کرامت نے مایوسی سے کہا "اور کیا بات ہو سکتی ہے؟"

"بات تو یہی ہے لیکن یہ چکر کہاں چلا ہے۔ یہ سمجھ میں نہیں آتا۔"

"میں تمہیں بتا رہا ہوں کہ گھر کی طرف تو یہ ممکن ہے۔ ایسا سوچنا بھی نہیں۔"

"اور یہاں بھی یہ ممکن نہیں۔" نثار نے کہا "ٹھیک ہے، اب میں خود اس سے بات کروں گا۔"

"لیکن اس سے اگلوانا آسان نہیں ہوگا استاد!" کرامت بولا "ہم سب ہر طرح سے کوشش کر رہے ہیں۔"

"میں کچھ اگلواؤں گا نہیں۔" نثار نے کہا "میں صرف اسے احساس دلاؤں گا کہ بہت لوگوں کو یہ بات معلوم ہے کہ اس کا کوئی چکر ہے۔ بس پھر اس کی نظریں ہی کسی دن پورا بھید کھول دیں گی۔ وہ زبان سے تو نہیں، نظروں سے یہ بات بتا دے گا۔"

"واہ استاد، ترکیب تو زوردار ہے۔" کرامت نے ستائشی نظروں سے اسے دیکھا۔

تین دن بعد نثار، الٰہی بخش کے پاس آ بیٹھا اور ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا۔ قدموں کی چاپ سن کر الٰہی بخش نے سر اٹھایا اور سامنے سے گزرنے والی لڑکیوں کے چہروں کو غور سے دیکھنے لگا۔ نثار نے کچھ دیر اسے اس کا موقع دیا۔ پھر اچانک بولا "تو نے جواب نہیں دیا میری بات کا۔"

الٰہی بخش نے چونک کر اسے دیکھا "کون سی بات نثار بھائی؟"

"تو تو میری بات سن ہی نہیں رہا تھا" نثار نے خفگی سے کہا۔

"معاف کرنا نثار بھائی۔ آج کل میرے ساتھ یہی ہوتا ہے۔ دھیان ہٹ جاتا ہے ادھر اُدھر۔"

"ایسا کیوں ہوتا ہے بخشے۔ پہلے تو نہیں ہوتا تھا۔"

"پتا نہیں نثار بھائی، مجھے خود معلوم نہیں کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔"

"معلوم نہیں ہے یا بتانا نہیں چاہتا۔" نثار نے کہا۔

"ایسی کیا بات ہو سکتی ہے کہ میں چھپاؤں۔"

"ہوتی ہیں...... ایسی باتیں بھی ہوتی ہیں۔" نثار نے مربیانہ انداز میں کہا "جس عمر میں تو ہے، اس میں ایسی باتیں ہوتی ہیں۔"

اس بار الٰہی بخش اپنے چہرے کی تمتماہٹ پر قابو نہ پا سکا۔ وہ تمتماہٹ نثار نے بھی دیکھ لی "میرے ساتھ ایسی کوئی بات نہیں نثار بھائی۔"

"اچھا، ایک بات بتاؤ، یہ تم گزرنے والوں کو اتنے غور سے کیوں دیکھتے ہو؟" نثار نے اچانک حملہ کیا۔

الٰہی بخش ہل کر رہ گیا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ لوگ اسے اتنے غور سے دیکھتے ہیں۔ "یہاں بیٹھ کر کوئی اور کیا دیکھ سکتا ہے نثار بھائی۔" اس نے مدافعانہ لہجے میں کہا۔

"لیکن پہلے تو لوگوں کو ایسے نہیں دیکھتے تھے!"

"مجھے تو خیال نہیں......"

"اور خاص طور پر عورتوں اور لڑکیوں کو۔" نثار نے کاٹ دار لہجے میں کہا۔

اس بار تو الٰہی بخش کے وجود میں بھونچال آ گیا "نن...... نہیں تو نثار بھائی!"

"کسی کو تلاش کرتا ہے تو؟" اس بار نثار نے مشفقانہ لہجے میں پوچھا۔

الٰہی بخش کا جی چاہا کہ اعتراف کر لے۔ یوں بوجھ بھی ہلکا ہو جاتا، جو اب تک وہ تنہا اٹھائے ہوئے تھا لیکن اس صورت میں اسے پوری بات بتانی پڑتی اور وہ سب کچھ اب خود اسے مضحکہ خیز لگ رہا تھا۔ وہ نثار کو بتاتا۔ نثار دوسروں کو بتاتا، پھر اس کا مذاق اڑتا، چنانچہ اس نے زبردستی کی ہنسی ہنستے

ہوئے کہا "یہ تمہارا وہم ہے استاد، ایسی کوئی بات نہیں۔"

نثار خاموش ہو گیا۔ زیادہ دباؤ ڈالنا مناسب نہیں تھا۔ اس نے الٰہی بخش کے چہرے کے بدلے ہوئے تاثرات دیکھ لئے تھے، پہلی بار کے لئے اتنا ہی کافی تھا۔

☆

الٰہی بخش اب پھر مضطرب اور بے چین تھا!

اس کی خوش فہمی دور کر دی گئی تھی وہ تو اپنے تئیں ایک بے ضرر محبت میں مست تھا۔ اسے اطمینان تھا کہ اسے اس چہرے کی جستجو نہیں، اس لئے کہ وہ مل بھی گئی تو کیا ہوگا۔ یوں محبت کرنے میں تو کوئی نقصان نہیں تھا۔ نہ ہی احساس کمتری کا کوئی سوال تھا لیکن اب صورت حال مختلف تھی۔ یہ اس کے لئے ایک انکشاف تھا کہ وہ اپنے اڈے پر بیٹھے بیٹھے اسے تلاش کرتا رہا ہے لیکن یہ حقیقت اس کے شعور سے اتنا نزدیک تھی کہ اسے تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ خود سے بحث بھی نہ کر سکا۔ اسے تو یہ خیال آیا کہ وہ اس بات سے واقف تھا۔ لیکن اسے خود سے بھی چھپاتا رہا تھا۔

اب اس حقیقت کے حوالے سے اسے کچھ سوالات کا سامنا کرنا تھا۔ سوال یہ تھا کہ وہ اس لڑکی کو کیوں تلاش کرنا چاہتا ہے۔ خود کو بہت ٹٹولنے کے بعد بھی اسے اس سوال کا تسلی بخش جواب نہ مل سکا۔ کیا وہ اس لڑکی سے محبت کا اظہار کرنا چاہتا ہے۔ اس سوال کا واضح جواب نفی میں تھا۔ تو پھر؟ بس یونہی وہ جاننا چاہتا تھا کہ جس کی محبت میں وہ بلاوجہ گرفتار کر دیا گیا ہے وہ ہے کون؟ اس کے سوا کوئی بات نہیں۔ اس جواب سے الٰہی بخش کو مطمئن ہو جانا چاہئے تھا۔ لیکن اس نے لاشعور کی کرشمہ کاری ابھی ابھی دیکھی تھی اور اس کے بعد خود پر بھی اعتبار نہیں کر سکتا تھا۔

وہ کئی دن اس سوچ میں الجھا رہا لیکن اطمینان بخش جواب نہ مل سکا۔ اس کی بے اعتباری اپنی جگہ رہی۔ پھر دھندلی دھندلی سی ایک بات اس کی سمجھ میں آئی۔ وہ یہ کہ جو محبت وہ کر رہا ہے، وہ کوئی سزا تو نہ ہوئی۔ محبت کے کچھ دکھ بھی ہوتے ہیں گے۔ وہ محسوس کر سکتا تھا کہ اس کے نئے دکھوں کا سامنا ہو رہا ہے اور وہ اس سلسلے میں کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اس ناگہانی سے نہیں بچ سکا تھا تو آگے بھی نہیں بچ سکے گا۔ اس بات کی جزئیات اس کی سمجھ میں نہیں آئیں، اسی لئے وہ اسے دھندلی سی بات سمجھ رہا تھا۔ اور وہ دھندلی سی بات بھی اس کا دماغ نہیں سمجھ سکا تھا، البتہ دل نے وہ بات سمجھ لی تھی۔

ردعمل کے طور پر وہ جھنجلا گیا۔ اسے احساس ہونے لگا کہ وہ تقدیر کے ہاتھوں میں کھلونا بن گیا ہے۔ 'اب دکھ ملنے ہیں تو دکھ ہی سہی' اس نے خود کلامی کی 'میں کیوں خواہ مخواہ پریشان ہوں۔ ٹھیک ہے، میں یہیں بیٹھے بیٹھے چہروں کے ہجوم میں ڈھونڈوں گا۔ میرا کیا جاتا ہے۔ کیا پریشانی ہے۔ ایسے کوئی ملتا ہے بھلا! ہونہہ، دیکھا جائے گا۔ یہاں کوئی بچہ کھو جائے کسی کا تو ڈھونڈتے پھرو! کس کس کی مدد لو، تب کہیں ملتا ہے' چلو بھئی دیکھتے رہو بیٹھ کے۔'

خود سے اس مکالمے کے بعد وہ بے فکر ہو گیا۔ اس ہر چہروں کے ہجوم کو ٹٹولنے کا شغل غیر شعوری نہیں تھا لیکن اسے یقین تھا کہ وہ اسے نظر نہیں آئے گی۔ اس نے یہ نہیں سوچا کہ اتفاقات پے در پے بھی ہوتے ہیں۔

اب وہ اس چہرے کو تلاش کرتا تھا۔ وہ لڑکیوں کو بہت غور سے دیکھتا تھا۔ اس یقین کے ساتھ کہ وہ اس چہرے کو پہچان بھی نہیں سکے گا۔ عجیب بات تھی۔ اسے ہر چہرے پر اس چہرے کا گمان ہوتا تھا۔ ہر حسین چہرہ اسے وہی چہرہ لگتا تھا۔ اسے حیرت ہوئی لیکن پھر اس کی سمجھ میں وجہ بھی آ گئی۔ وہ دید بہت پرانی تھی۔ اس نے اسے اپنی یادداشت کے صفحے پر، اپنے تصور کی لوح پر اتار لیا تھا۔ پھر شاید یوں ہوا ہوگا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اصل خدوخال مٹتے گئے ہوں گے اور تصور متبادل خدوخال فراہم کرتا رہا ہوگا۔ اس کے تصور میں چہرہ تو اب بھی محفوظ تھا مگر شاید یہ وہ چہرہ نہیں تھا جسے اس نے دیکھا اور چاہا تھا۔ یہ تو کوئی تصوراتی چہرہ تھا... بلکہ شاید کوئی خاکہ تھا... خال و خط سے محروم خاکہ، جس میں وہ ہر اس چہرے کے نقوش بھر دیتا جو اسے حسین لگتا، اسی لئے تو ہر حسین چہرہ اس کا چہرہ لگتا تھا

الٰہی بخش یہ سوچ کر خوش ہوتا کہ اس لڑکی کے ملنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ وہ سامنے بھی آ جائے تو اسے نہیں پہچان سکے گا۔ وہ تو جیسے دل میں محبت ڈالنے والے سے کوئی جنگ لڑ رہا تھا اور جیتنے والا تھا۔ محبت کی حد تک تو ٹھیک تھا لیکن جستجو تو دیوانگی ہے اور دیوانگی بہت نقصانات دہ ہوتی ہے۔

لیکن ایک دن وہی چہرہ اسے سچ مچ نظر آ گیا!

☆

یہ پہلی نظر کے تقریباً آٹھ ماہ بعد کی بات ہے۔ اس نے نظر ٹھٹکی اور اس کی سانسیں رکنے لگیں۔ دل کی تال میں سے تین چار دھڑکنیں تو یقیناً غائب ہو گئی ہوں گی۔ وہ چند فٹ آگے اس کے سامنے کھڑی تھی۔ اس کے ساتھ اس کی ہم عمر ایک اور لڑکی بھی تھی۔

اس بار معاملہ بالکل مختلف تھا۔ پہلے وہ کسی بھی حسین لڑکی کو دیکھتا تو سوچتا کہ یہ وہی ہے لیکن فوراً ہی اسے خیال آتا کہ اس کا تصور اس کے ساتھ بے ایمانی کر رہا ہے۔ اسے یقین ہو جاتا کہ یہ وہ نہیں ہے مگر اندر کوئی طاقت بحث کرتی کہ یہ وہی ہے۔ یعنی ایسے موقعوں پر اس کے اندر دو مختلف یقین ہوتے تھے۔ وہ ان کے درمیان ڈولتا رہتا۔ فیصلہ کرنا اس کے لئے ممکن نہ ہوتا لیکن وہ یقین ہونا بجائے خود ایک فیصلہ تھا۔ نفی کا فیصلہ! پھر وہ یہ سوچ کر خوش ہوتا کہ وہ سامنے آ بھی گئی تو وہ اسے نہیں پہچان سکے گا۔ اس خیال سے دل میں جو مایوسی کی لہر اٹھتی، اسے اس نے کبھی اہمیت نہیں دی تھی، اس وقت وہ یہ کیسے سمجھ سکتا تھا کہ وہ دوسرا اہم وزن یقین دراصل عدم یقین تھا۔ یا شک کہہ لیجئے۔ اور وہ یہ بھی نہیں سمجھ سکتا تھا کہ کبھی کبھی شک اور عدم یقین، یقین سے زیادہ اہم ہوتا ہے۔ مگر اس بار اسے دیکھتے ہی اس کا دل سینے میں ناچنے لگا تھا۔ یہ وہی تھی۔ وہی آنکھیں، وہی پیشانی، وہی رخسار، وہی ہونٹ اور وہی بال! اس بار اس کے وجود میں اس دوسرے یقین کا یعنی شک کا شائبہ بھی نہیں تھا۔ وہ جان گیا تھا اسے معلوم تھا کہ یہ وہی ہے!

کیوں ایسا کیوں۔ تو کیا اس کا عکس دل پر مرتسم ہونے کے بجائے اس کے وجود کی کسی نامعلوم اور چھپی ہوئی گہرائی میں نقش ہوا تھا۔ خود سے بھی پوشیدہ! اور اس پر نظر پڑتے ہی وہ اس کی آنکھوں میں ابھر آیا تھا تاکہ دل موازنہ کر کے مطمئن ہو جائے۔ وہ سانسیں روکے اسے دیکھتا رہا، جیسے وہ رنگوں کی بنی ہوئی کوئی گڑیا ہے جو سانسوں کی گرمی سے فضا میں تحلیل ہو جائے گی۔ اس کے ذہن میں نہ کوئی خوف تھا، نہ مقام و مرتبے کے فرق کا تصور۔

اگلے ہی لمحے اس کے یقین کی تصدیق ہو گئی، حالانکہ تصدیق کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

لڑکی نے اپنی ساتھی سے کہا "میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نائلہ۔ شام کو آنا شاپنگ کیلئے۔ اتنی گرمی میں ٹھیک سے کوئی چیز پسند بھی نہیں کر سکوں گی۔"

یہ وہ آواز تھی جو دو سو سے زائد دنوں سے اس کے کانوں میں رس گھول رہی تھی۔ اس آواز کو بھی وہ لاکھوں میں پہچان سکتا تھا۔

"ٹھیک ہے سادی!" دوسری لڑکی نے گہری سانس لے کر کہا۔

سادی الٰہی بخش نے سوچا سادی! یہ کیا نام ہوا بھلا۔ پھر بھی یہ نام اسے اچھا لگا، اس کی طرح مختلف اور انوکھا۔

اسی لمحے لڑکی نے اس کی طرف دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں، دونوں کا تاثر بے حد مختلف تھا۔ ایک طرف وارفتگی اور محبت تھی تو دوسری طرف کچھ بھی نہیں تھا۔ جیسے لڑکی کسی درخت کو، دیوار کو، کسی بے جان چیز کو دیکھ رہی ہو۔

وہ محض ایک پل کی بات تھی۔ لڑکی پلٹی اور اپنی سہیلی کے ساتھ چل دی لیکن وہ مختصر سا پل اپنے اندر بہت بڑا پل تھا۔ وہ پل الٰہی بخش کو اداس کر گیا۔ اس نے ہر چیز کا، ہر بات کا تعین کر دیا تھا۔ اس کی حیثیت بھی اسے یاد دلا دی تھی۔ لیکن وہ اداسی بھی ایک خوشی میں لپٹی ہوئی تھی۔ جیسے اس نے اسے پا لیا ہو۔

وہ بڑی محویت سے اسے دوسری لڑکی کے ساتھ جاتے ہوئے دیکھتا رہا، پھر اچانک اسے کیا ہوا، یہ اسے خود بھی پتا نہیں چلا۔ اس نے ادھر اُدھر دیکھا۔ مزدوروں کی ٹولی میں کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ صبح ہی وہ کسی کام پر چلے گئے تھے۔ جو لوگ تھے، ان میں کوئی بھی اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔

اس نے اطمینان کی سانس لی اور اٹھ کر چل دیا۔ اس کے قدم خودکار انداز میں اٹھ رہے تھے۔ دیر تک اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کر رہا ہے اور کیوں کر رہا ہے۔ اسے بس یہ احساس تھا کہ وہ چل رہا ہے۔

خاصی دور جا کر بات اس کی سمجھ میں آئی اور جب سمجھ میں آئی تو اس کے پورے جسم سے پسینہ پھوٹ نکلا۔ وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ زندگی میں کبھی وہ کسی لڑکی کا تعاقب کرے گا لیکن ایسا ہو رہا تھا، وہ ایسا کر رہا تھا! اور وہ اپنے فٹ پاتھ سے کافی آگے آ چکا تھا۔

اس بات کا احساس ہوتے ہی وہ چور بن کر رہ گیا۔ اسے لگتا تھا کہ ہر شخص۔ ہر دکاندار اور ہر راہ گیر اسے چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ سب کو معلوم ہے کہ وہ لڑکی کا تعاقب کر رہا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ اس بات پر لوگوں کے ہاتھوں مرمت شروع ہونے میں دو سیکنڈ بھی نہیں لگیں گے مگر اس کے قدم کوشش اور خواہش کے باوجود نہیں رکے۔ اس نے چاہا کہ پلٹے اور اپنے ٹھیے کی طرف واپس چلا جائے لیکن اسے خود پر ذرا بھی اختیار نہیں تھا۔ اس وقت اس کی باگ ڈور کسی اور کے ہاتھوں میں تھی۔ وہ اندر ہی اندر خوف سے لرزتا رہا۔ اس کے قدم بڑھتے رہے۔

دونوں لڑکیاں بائیں سمت مڑ گئی تھیں۔ آگے قطار سے بنگلے تھے۔ تیسرے یا چوتھے بنگلے کے گیٹ پر وہ دونوں رک گئیں۔ الٰہی بخش ان سے تھوڑا ہی پیچھے تھا۔ وہ رکتا تو یہ نامناسب بات ہوتی۔ اس نے اپنی رفتار بہت کم ... برائے نام کر دی۔

”نائلہ، آؤ نا میرے ساتھ۔“ لڑکی نے اپنی سہیلی سے کہا۔

”نہیں ساوی، میں اب چلوں گی۔“

”شام کو آؤ گی شاپنگ کے لیے؟“

”نہیں ساوی۔ شام کو مجھے امی کے ساتھ جانا ہے، اسی لیے تو آج خریداری کرنا چاہ رہی تھی۔“

”تو پھر شاپنگ کر ہی لیتیں۔“

”چلو کوئی بات نہیں، پھر سہی۔ اچھا ساوی، خدا حافظ۔“

”خدا حافظ نائلہ۔“

ساوی گیٹ کی طرف چل دی۔ دوسری لڑکی نائلہ آگے بڑھ گئی۔ اتنی دیر میں الٰہی بخش فاصلہ برابر کر کے ان سے آگے نکل گیا تھا۔ گیٹ کے پاس سے گزرتے ہوئے اس نے خوف کے باوجود سرسری انداز میں گیٹ کی طرف دیکھا تھا۔ گیٹ کی سائیڈ میں نام کی تختی لگی تھی ... شیخ مظہر علی۔ نام کے نیچے بنگلے کا نمبر اور علاقے کا نام لکھا تھا۔

اسی لمحے الٰہی بخش کا دل اتنے زور سے ... اور اس انداز میں دھڑکا کہ اسے پہلے کبھی ایسا تجربہ نہیں ہوا تھا۔ وہ خوشی بھی ایسی تھی کہ اسے یاد نہیں آتا تھا کہ کبھی وہ ایسے خوش ہوا ہو۔ لگتا تھا، کوئی بہت بڑا خزانہ مل گیا ہے اسے۔ کوئی ایسی انوکھی نعمت جو کبھی کسی کو نہیں ملتی۔ وہ جیسے گدا سے بادشاہ بن گیا تھا۔ سرشاری کی اس کیفیت میں وہ بہت دھیرے دھیرے آگے کی طرف چلتا رہا۔ اسے یہ احساس بھی نہیں تھا کہ وہ دوسری لڑکی نائلہ اس کے پیچھے آ رہی ہے یا وہ بھی کسی بنگلے میں چلی گئی ہے، حالانکہ اس کی وجہ سے وہ آگے بڑھ رہا تھا، ورنہ اس کا مقصد تو پورا ہو چکا تھا۔

آگے سڑک مڑ رہی تھی۔ اب اسے خیال آیا کہ کیا وہ دن بھر یونہی چلتا رہے گا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے پلٹ کر دیکھا۔ پیچھے کوئی بھی نہیں تھا۔ سڑک سنسان تھی۔ دوسری لڑکی نہ جانے کب اپنے گھر میں چلی گئی تھی۔ اسے اس کا گھر جاننے میں کوئی دلچسپی تھی بھی نہیں۔ اس نے ایک بار دائیں بائیں دیکھا اور پھر پلٹ کر واپس چل دیا۔ شیخ مظہر علی کے بنگلے کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس کے قدم رکے۔ گیٹ بند تھا۔ وہ چند قدم گیٹ کی طرف بڑھا مگر فوراً ہی گھبرا کر پیچھے ہٹ آیا۔ اس کے بعد وہ اپنے ٹھکانے کی طرف چل دیا۔

وہ اپنی جگہ جا بیٹھا۔ وہاں کسی نے اس کی غیر موجودگی کو محسوس نہیں کیا تھا۔ پھر بھی وہ خاصی دیر چور سا بنا بیٹھا رہا۔ اس کے بعد اسے یقین ہو گیا کہ کسی کو کچھ پتا نہیں چلا ہے۔ وہ اپنی جگہ بیٹھا تصور میں کھو رہا۔

اس بار اسے تصور میں دیکھنے کا لطف ہی کچھ اور تھا۔ وہ جیتی جاگتی تصویر تھی کہ ہاتھ بڑھاؤ اور چھولو۔ اور وہ پیارا سا خوب صورت مگر عجیب سا نام سادی! اور وہ بنگلہ، جہاں وہ رہتی ہے۔ وہ بنگلہ کتنا بڑا ہوگا، یہ وہ تصور نہیں کر سکا۔ کتنا ہی بڑا ہو، اس سے وہ مرعوب تو نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے ایبٹ آباد میں زمین بہت دیکھی تھی، جو ایک آدمی کی ملکیت ہوتی تھی، آدمی چلتے چلتے تھک جائے لیکن زمین ختم نہ ہو۔

اسے احساس ہی نہیں ہوا کہ کھانے کا وقت گزر چکا ہے۔ اسے بھوک ہی نہیں لگی۔ دھوپ کی دم توڑتی گرمی نے وقت گزرنے کا احساس دلایا تو اس نے چونک کر ادھر اُدھر دیکھا۔ شام کی چہل پہل شروع ہونے کا وقت قریب آرہا تھا۔ مزدوروں کی ٹولی واپس نہیں آئی تھی۔ یہ یقینی تھا کہ اب وہ کل ہی آئیں گے۔ کام نمٹا کر وہ گھر ہی چلے جائیں گے۔

اس نے پھر سر جھکایا اور سادی کے تصور میں گم ہو گیا۔

شام ہوئی اور روز کی طرح بازار آوازوں سے بھر گیا۔ سینڈلوں کی کھٹ کھٹ، قدموں کی چاپیں اور ضد کرتے ہوئے بچوں کی آوازیں لیکن اس روز یہ سب کچھ اسے بالکل اچھا نہیں لگا، بلکہ وہ جھنجلا گیا۔ اس کے تصور میں خلل پڑ رہا تھا۔ وہ ڈسٹرب ہو رہا تھا۔ اسے خیال ہی نہ آیا کہ اسی رونق کی وجہ سے ہمیشہ وہ دیر تک یہاں بیٹھا رہتا تھا۔ یہ رونق اسے اچھی لگتی تھی اور اب وہی رونق اسے ابتری معلوم ہو رہی تھی۔ وہ آوازیں، جو اسے زندگی سے بھرپور لگتی تھیں، اب بے معنی شور وغل لگ رہی تھیں، جن سے سماعت مجروح ہوئی جا رہی تھی۔

اس کا جی چاہا کہ کانوں میں انگلیاں ٹھونس لے اور چیخ کر کہے بند کرو یہ شور وغل، مگر اسے احساس ہو گیا کہ وہ فٹ پاتھ پر اپنی خلوت گاہ سجائے بیٹھا ہے۔ یہاں تو یہی کچھ ہوگا۔ خلوت تو بس اپنے گھر میں بند کمرے ہی میں مل سکتی ہے۔

یہ خیال آتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اسے اب رونق کی نہیں، تنہائی کی ضرورت تھی۔ آدمی باہر کی دنیا میں رونق اس وقت تلاش کرتا ہے، جب اس کے اندر ویرانی ہو، رونق کا نام و نشان نہ ہو۔ اندر کی دنیا آباد ہو جائے تو پھر باہر رونق بری لگتی ہے۔ اندر کی محفلوں میں شرکت کرنے کے لئے، اندر کی دنیا کی سیر کرنے کے لئے تنہائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے دل کا ویرانہ تو اب جنت بن گیا تھا۔ اسے رونق سے کیا!

وہ پہلا موقع تھا کہ وہ اتنی جلدی گھر چلا گیا۔ گھر میں کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ اپنی محفل سجا کر بیٹھ گیا۔ مگر شام ہوئی، سورج ڈوبا، رزق کی تلاش میں نکلنے والے انسانی پرندے اپنے ٹھکانے پر آئے تو اسے احساس ہوا کہ یہ بھی گھر نہیں ہے۔ تنہائی یہاں بھی نہیں ہے۔ تو تنہائی ہوتی کہاں ہے؟

''بخشے تو کب آیا؟'' کوئی پوچھ رہا تھا۔ اس لئے پوچھ رہا تھا کہ عام طور پر وہ سب سے آخر میں گھر آیا کرتا تھا۔

''کیا بات ہے بخشو، جلدی آگیا۔ طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' کسی اور نے پرتشویش لہجے میں پوچھا۔

''بس کچھ ایسا ہی ہے۔ سر میں درد ہے۔'' الٰہی بخش نے کہا۔

اس پر دوا کے سلسلے میں مشورے ملنے لگے۔ الٰہی بخش خاموشی چاہتا تھا لیکن اس کی سمجھ میں آگیا کہ یہ ممکن نہیں۔ سمجھوتا اسے ہی کرنا پڑے گا۔ اسے اپنے لئے وقت تبھی ملے گا، جب وہ لوگ سو جائیں گے۔ اس سے پہلے وہ جتنا جھنجلائے گا، جتنا چڑچڑا پن کرے گا، بات اتنی ہی خراب ہو گی۔ اس کا رویہ خلاف معمول ہوگا تو ساتھیوں کے ذہنوں میں سوالات کلبلائیں گے۔ وہ تجسس کریں گے اور یہ اچھا نہیں ہوگا۔

''یارو... میں کھانا کھا کر آتا ہوں، پھر تاش کھیلیں گے۔'' اس نے کہا اور گھر سے نکل آیا۔

کھانا کھا کر وہ واپس آیا اور تاش کھیلنے بیٹھ گیا۔ اس نے پتے، ٹھائے۔ اینٹ کی بیگم پر سادی کا چہرہ تھا۔ ''ذرا رک جاؤ سادی بیگم'' اس نے خاموشی کی زبان میں اس سے کہا ''یہ سو جائیں تو ہم تم خوب باتیں کریں گے۔''

اس رات اسے بھری محفل میں تنہا ہونے کا ہنر بھی آگیا۔ تصور میں سادی تھی اور وہ تاش کھیل رہا تھا۔ کبھی کبھی غلط پتا چلنے پر اسے ٹوکا بھی گیا مگر سر درد کا بہانہ آڑے آگیا۔ اس نے سوچا، چند دنوں میں اسی طرح کھیلنے کی مشق بھی ہو جائے گی۔

اور جب سب سو گئے تو وہ سادی کے ساتھ جاگتا رہا۔ وہ اس کے سامنے بیٹھی تھی اور وہ اسے تکے جا رہا تھا۔

"اے...... تمہیں بولنا نہیں آتا کیا۔ منہ میں زبان نہیں ہے؟" وہ بولی۔

"منہ میں زبان بھی ہے اور بولنا بھی آتا ہے۔" اس نے جواب دیا "لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ تم سے کیا بات کروں۔"

"جیسے دوسروں سے بات کرتے ہو، ویسے ہی مجھ سے بھی کرو۔"

"تم دوسروں سے بہت مختلف ہو۔ تمہارا مقام، تمہارا مرتبہ اور ہے۔"

وہ سر جھکا کر بیٹھ گئی اور وہ اسے تکتا رہا۔ نجانے کب، کتنی دیر بعد اسے نیند آئی۔ آنکھ کھلی تو گھر دھوپ سے بھرا ہوا تھا۔ وہ پہلا موقع تھا کہ وہ سورج نکلنے سے پہلے نہیں جاگا تھا۔ اسے کوئی اتنی پروا بھی نہیں تھی۔ کام پر تو دیر سے ہی جانا تھا۔ ہاں فٹ پاتھ کی تنہائی سے وہ ضرور محروم ہو گیا تھا، پھر اچانک ایک خلش اسے ستانے لگی، اس کی فجر کی نماز قضا ہو گئی تھی۔ اس کی تو کوئی تلافی نہیں تھی اور سر میں عجیب سا بھاری پن تھا۔

وہ دن ایک مختلف انداز میں شروع ہو رہا تھا۔ نئے معمولات بن رہے تھے جنہیں عرصے تک چلنا تھا۔

☆......☆......☆

نثار نے کن انکھیوں سے الٰہی بخش کو دیکھا، جو سر جھکائے کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ نثار اس میں آنے والی نئی تبدیلیوں کو دیکھ رہا تھا اور حیران تھا۔ یہ معمہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس نے الٰہی بخش کو پہلے دن سے دیکھا تھا۔ اس میں تبدیلیاں ایسے آ رہی تھیں جیسے وہ بہت تیزی کے ساتھ مختلف ادوار سے گزر رہا ہو۔

نثار نے زندگی سڑکوں اور فٹ پاتھوں پر گزاری تھی۔ سڑکوں اور فٹ پاتھوں پر گزرنے والی زندگی ایک بہت بڑی تعلیم ہوتی ہے۔ ایم اے کی ڈگری بھی آدمی کو اتنا عقل مند اور مردم شناس نہیں بناتی، جتنا سڑکیں بنا دیتی ہیں۔ فٹ پاتھ پر بیٹھ کر آدمی بہت کچھ دیکھتا ہے اور دیکھتے دیکھتے سمجھنے لگتا ہے۔ خوشی ہو یا غم اس کے ہر روپ سے وہ واقف ہو جاتا ہے۔ کچھ تو خود پر گزرتی ہے اور کچھ مشاہدہ سکھا دیتا ہے۔

نثار بھی بہت سمجھدار آدمی تھا۔ وہ حساس بھی تھا، اس لئے فٹ پاتھ پر بیٹھنے والے دوسرے لوگوں کے مقابلے میں بھی اس کا مشاہدہ بہت بہتر تھا۔ اس نے الٰہی بخش کو پہلے دن دیکھا تو اس کا تاثر تھا کہ وہ بہت برخوردار قسم کا آدمی ہے۔ اسے وہ ایک ایسا شخص لگا جو بے وقعتی کے احساس تلے دبا جا رہا ہو۔ اس نے سوچا، شاید گھر میں اسے کوئی اہمیت نہیں دی جاتی ہوگی۔ ماں باپ دوسرے بیٹے بیٹیوں کے مقابلے میں اسے بے وقعت سمجھتے ہوں گے۔ بہن بھائی دیگر بہن بھائیوں کو اس پر فوقیت دیتے ہوں گے۔ اسی لئے اس کے اندر احساس کمتری کی حد کو پہنچا ہوا الگ رہے۔ پھر الٰہی بخش خود دار بھی تھا لیکن دوسروں کی عزت کرنا بھی جانتا تھا۔ یہ بات تو نثار سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ الٰہی بخش کو صرف عشق کرنا سکھایا گیا تھا بلکہ سکھانے کی کوشش کی گئی تھی۔ وہ عشق کرنا تو نہیں سیکھ سکا تھا کہ یہ سیکھنے والی چیز ہی نہیں یہ تو ہو جاتی ہے اور ہو جائے تو آدمی کو سارے آداب خود بخود ہی آ جاتے ہیں۔ ہاں، اس کوشش کے نتیجے میں الٰہی بخش کو عزت کرنا ضرور آ گیا تھا اور وہ ہر شخص کی عزت کرتا تھا، بغیر کسی تفریق کے۔

جس دن استاد قاسم کو رخصت کیا جا رہا تھا، الٰہی بخش پورے دن پوری رات ان لوگوں کے ساتھ رہا تھا۔ اس روز نثار نے اسے بہت غور سے اور بہت قریب سے دیکھا تھا۔ استاد قاسم نے مزدوری میں الٰہی بخش کا حصہ لگایا تھا۔ نثار جانتا تھا کہ اس پر کسی بھی ساتھی کو کوئی اعتراض نہیں تھا لیکن الٰہی بخش کو وہ پیشکش بری ...... بہت بری لگی تھی۔ اس کے نزدیک اس پر اس کا حق نہیں تھا، اس لئے کہ اس نے سامان نہیں ڈھویا تھا۔ وہ رقم لینا اس کی خودداری کی توہین تھی۔ وہ تو فٹ پاتھ کا ساتھی ہونے کے ناتے ان کے ساتھ چلا آیا تھا، اس لئے بھی کہ قاسم کا وہ بہت احترام کرتا تھا پھر بھی اس نے نہ چاہتے ہوئے وہ رقم قبول کر لی۔ یہ صرف عزت کی بات تھی۔ نثار نے خود کو الٰہی بخش کی جگہ رکھ کر سوچا تھا تو بات اس کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ الٰہی بخش کے نزدیک وہ رقم لینا اس کی اپنی بے عزتی تھی تو استاد قاسم کے اصرار کے باوجود اس رقم کو قبول نہ کرنا نہ صرف قاسم کی بلکہ پوری ٹولی کی بے عزتی تھی۔ اس لئے اس نے اپنی بے عزتی گوارا کر کے وہ رقم لے لی تھی لیکن موقع ملتے ہی اس نے اپنی عزت بحال کر لی تھی۔ وہ رقم اس نے اپنے پاس

سے اضافہ کر کے لوٹا دی تھی۔ نثار ہی کو تو دی تھی اور کتنا اصرار کیا تھا اس کے لئے اور اس طرح کہ کسی اور کو پتا بھی نہیں چلا تھا۔ یہ الگ بات کہ نثار نے سب کو بتا دیا تھا۔ یوں ٹولی کے مزدور الٰہی بخش کی اور عزت کرنے لگے تھے۔

لیکن نثار کو ایک خلش رہی تھی۔ کون جانے، الٰہی بخش نے اپنی جیب میں کچھ بھی نہ چھوڑا ہو۔ سب کچھ استاد قاسم کے لئے دے دیا ہو۔ الٰہی بخش جیسے آدمی سے یہ بعید بھی نہیں تھا۔ نثار کو ایک اور منظر بھی یاد تھا۔ جب وہ لوگ ٹھیلا لے کر استاد قاسم کے گھر پہنچے تو قاسم کی بچیاں بھی ٹھیلا دیکھنے کے لئے بے تاب ہو کر پردے کے پاس آ گئی تھیں۔ اس وقت الٰہی بخش کے سوا ہر مزدور کی نظریں پردے کی طرف اٹھی تھیں، چاہے ایسا ایک پل کے لئے ہوا ہو۔ نثار کو وہ بات بری نہیں لگی تھی۔ سب کا ردِعمل فطری تھا مگر اس میں میلا پن نہیں تھا لیکن الٰہی بخش نظریں جھکا کر بیٹھ رہا تھا۔

اور الٰہی بخش تو طارق روڈ کے فٹ پاتھ پر سرسراتے رنگین آنچلوں، لچکیلے جسموں اور ہلکورے لیتی خوشبوؤں کے درمیان بھی نظریں جھکا کر بیٹھا رہتا تھا۔

پھر اس میں تبدیلی آئی۔ وہ نظریں اٹھا کر نسوانی چہروں کو ٹٹولنے لگا تھا۔ مگر نثار کو اس کی وہ نظریں بھی بری نہیں لگیں۔ اس نظروں میں بوالہوسی نہیں تھی۔ ایک تڑپ تھی، تلاش تھی، جیسے وہ کسی کو ڈھونڈ رہا ہو۔ ان دنوں وہ بہت بے چین اور کھویا کھویا رہتا تھا۔ کام ملتا تو وہ ٹالنے کی کوشش کرتا، جیسے اپنا ٹھیا چھوڑنا اسے گوارا نہ ہو۔ جیسے وہ یہاں سے اٹھ گیا تو اس کی کوئی قیمتی چیز کھو جائے گی۔

اور اب اس میں ایک اور تبدیلی آئی تھی۔ اس نے نظریں اٹھانا پھر چھوڑ دیا تھا۔ اب وہ پھر سر جھکائے بیٹھا رہتا تھا۔ اصولاً نثار کو یہ دیکھ کر یہ سوچنا چاہئے تھا کہ الٰہی بخش پھر پہلے جیسا ہو گیا ہے لیکن وہ جانتا تھا کہ یہ بات نہیں ہے۔ پہلے میں اور اب میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ پہلے کی جھکی ہوئی نظروں میں اس کا فطری شرمیلا پن تھا جبکہ اب وہ کبھی اتفاقاً نظریں اٹھاتا اور سامنے لڑکیوں، عورتوں کا ہجوم ہوتا تو وہ اس کے آر پار دیکھتا محسوس ہوتا۔ اس کی نگاہوں میں بے نیازی اور طمانیت ہوتی۔ جیسے تلاش ختم ہو گئی۔ جسے وہ ڈھونڈ رہا تھا، وہ اسے مل گیا ہو۔ جیسے اب کسی سے کوئی واسطہ نہ ہو۔ اور وہ سر جھکائے بیٹھا ہوتا تب بھی اس کے انداز میں، اس کے چہرے پر طمانیت ہوتی۔ وہ پہلے والی بے چینی، وہ اضطراب ختم ہو گیا تھا۔

ایک اور تبدیلی آئی تھی۔ اب کوئی کام ملتا تو وہ پہلے سے زیادہ انکساری اور عاجزی سے بات کرتا۔ مثلاً کوئی آیا اور کہا کہ گھر میں رنگ و روغن کرانا ہے۔ درمیان میں تو وہ جرح کرنے لگا تھا۔ مزدوری ریٹ سے زیادہ مانگتا۔ کوشش کرتا کہ گاہک اسے چھوڑ جائے۔ کوئی اور کاریگر دیکھ لے۔

اب وہ کہتا "کرو دیں گے صاحب جی!"

"کیا لو گے؟"

"وہی دہاڑی صاحب جی...... پچیس روپے روز۔"

"نہیں بھئی۔ دہاڑی کے چکر میں تم لوگ کام لمبا کر دیتے ہو۔ میں بہت بھگت چکا ہوں۔"

"تو پھر صاحب جی؟"

"تم چل کے گھر دیکھ لو۔ پھر ٹھیکے کی بات کر لیں گے۔"

"اس کی کوئی ضرورت نہیں صاحب جی، آپ میرے ساتھ بے انصافی تھوڑی کرو گے۔ جو جی چاہے دے دینا۔"

یہ تقریباً پندرہ دن پہلے کی بات تھی اور نثار جانتا تھا کہ اس کے بعد سے اب تک الٰہی بخش کو کوئی کام نہیں ملا ہے۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ دہاڑی والے مزدوروں کے ساتھ یہ نرم گرم چلتا رہتا ہے۔ لیکن توازن قائم رہتا ہے۔ کام کے دو تین اچھے دن، بے کاری کے چار چھ دنوں کی تلافی کر دیتے ہیں۔ مگر نثار جانتا تھا کہ الٰہی بخش کی بے کاری لمبے عرصے سے چل رہی ہے۔ آخری کام بھی اسے دو ہفتے پہلے ملا تھا۔

ایک خیال نے نثار کو چونکا دیا۔ وہ اٹھا اور الٰہی بخش کے پاس چلا گیا۔ اس کے برابر میں آلتی پالتی مار کر بیٹھتے ہوئے اس نے اسے پکارا۔ لیکن الٰہی بخش اپنے آپ میں گم رہا۔ نثار نے اسے پھر پکارا۔ وہ اسے جھنجوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اتنی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے کسی شخص کو چونکانا کبھی نہیں

چاہئے۔

بالآخر چوتھی پانچویں آواز پر الٰہی بخش کی محویت ٹوٹی۔ اس نے سر اٹھایا، اس کی نظریں شارے میں۔

اس کی آنکھوں میں دیکھا تو شارج بیچ دہل کر رہ گیا!

☆

زندگی کے اس نئے اور مختلف دور میں الٰہی بخش بہت خوش تھا۔ فاقہ مستی کا تجربہ اسے پہلی بار ہوا تھا۔ ایک تصور تھا، جو اسے ہر لمحہ سرشار رکھتا تھا۔ اسے کوئی پریشانی، کوئی دکھ نہیں تھا۔ اس کے پاس خوشی تھی۔ وہ ہر حال میں خوش تھا۔

وہ خود بدل گیا تھا۔ زندگی بدل گئی تھی۔ دن رات بدل گئے تھے۔ معمولات بدل گئے تھے۔ تنہائی تنہائی نہیں تھی اور محفل محفل نہیں تھی۔ اسے کچھ بھی برا نہیں لگتا تھا۔ کوئی اس سے بات کرتا تو اسے اچھا لگتا، اکتاہٹ اس کے مزاج سے خارج ہو گئی تھی۔ وہ رات میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ تاش کھیلتا۔ خوب چہکتا، ہنستا بولتا، رات کو سب سو جاتے تو وہ دیر تک جاگتا، البتہ دیر تک سونے کی برائی پر اس نے چند ہی دن میں قابو پا لیا تھا۔ نیند پوری ہو ہی نہیں سکتی تھی مگر اسے اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔ اتوار کو چھٹی ہوتی اور وہ جی بھر کے سوتا۔

اسے حیرت ہوتی تھی۔ پہلے اس کی دو کمزوریاں تھیں۔ وہ نیند کا بہت پکا اور بھوک کا بہت کچا تھا۔ مگر اب یہ کمزوریاں دور ہو چکی تھیں۔ اسے عشق کی طاقت کو تسلیم کرنا پڑا۔ اس نے سمجھ لیا کہ عشق انسان کی ہر کمزوری دور کر کے اسے عجیب طاقت بخشتا ہے۔ عشق فاقہ مستی سکھاتا ہے، ہر حال میں خوش رہنا سکھاتا ہے اور وہ بہت خوش تھا۔

ہر روز نیند پوری کئے بغیر وہ معمول کے مطابق اٹھتا اور فجر کی نماز ادا کرتا۔ اس کے بعد عام دنوں میں وہ کام پر چلا جاتا اور اتوار کا دن ہوتا تو نماز کے بعد دوبارہ سو جاتا۔ صبح سویرے فٹ پاتھ پر بیٹھ کر وہ سوئے ہوئے گردوپیش سے ہمیشہ کی طرح محظوظ ہوتا۔ پھر چہل پہل شروع ہوتی اور وہ کام ملنے کا انتظار کرتا رہتا۔

ایک نیا معمول اس کی زندگی میں شامل ہوا تھا۔ ہمیشہ کی طرح وہ اب بھی سوا بارہ بجے کھانے کے لئے اٹھتا۔ ڈیڑھ بجے وہ واپس آتا۔ اسے یاد نہیں ہوتا تھا کہ اس وقفے میں اس نے اس بنگلے کے کتنے چکر لگائے ہیں جس میں سادی رہتی ہے، کتنی بار وہ جاتے ہوئے اور آتے ہوئے اس بنگلے کے سامنے سے گزرا ہے۔ دو ایک بار اس نے یہ سمجھنے کی کوشش کی کہ وہ ایسا کیوں کرتا ہے۔ پھر اس نے یہ سوچنا چھوڑ دیا۔ اتنا کافی تھا کہ اس طرف جاتے ہوئے اس کے قدموں کی کیفیت رقص کی سی ہوتی ہے۔ اس کی آنکھوں میں سادی کا چہرہ ہوتا ہے اور اس کا دل ایسے دھڑکتا ہے، جیسے کوئی نغمہ سنا رہا ہو۔ تنی خوب صورت کیفیت کا سبب معلوم کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اس تمام عرصے میں اس نے سادی کو ایک بار بھی نہیں دیکھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ بنگلے کے سامنے سے گزرتے ہوئے اگر اسے سادی نظر آ گئی تو کیا ہوگا؟ وہ کیا کرے گا۔ سچ تو یہ ہے کہ اب اسے سادی کو دیکھنے کی آرزو بھی نہیں تھی۔ کم از کم وہ تو یہی سمجھتا تھا۔ جس کی تصویر ہر وقت نگاہوں میں بسی رہتی ہو، اس کی جستجو کیا معنی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اب پھر سر جھکا کر بیٹھتا تھا۔ اس کی آنکھیں اب رنگین رونقوں کو نہیں ٹٹولتی تھیں بلکہ اب اسے سادی کی مانوس آواز اپنے قریب کہیں سے سنائی دے جاتی تو بھی وہ نظریں اٹھا کر نہیں دیکھتا۔ شاید وہ سیر چشم ہو گیا تھا۔

ایک اور نیا معمول بھی بنا تھا۔ کام نہ ملنے کی صورت میں اب وہ شام سے پہلے ہی گھر چلا جاتا تھا۔ طارق روڈ کی رونقوں میں اب کا دل نہیں لگتا تھا۔ گھر کی تنہائی اس سے بدرجہا بہتر تھی۔ اسے مطالعے کا شوق ہو گیا تھا۔ عام طور پر وہ ڈائجسٹ پڑھتا تھا۔ کبھی کوئی ادبی ناول مل جاتا تو وہ بھی پڑھتا۔ اسے محسوس ہوتا کہ اس کی دنیا وسیع ہوتی جا رہی ہے۔ اس کا ذہن بھی دنیا کی طرح ہوتا جا رہا تھا۔ جو موجود تھا، لیکن دریافت کئے جانے کا منتظر تھا۔

اس وقت بھی وہ سادی کے تصور میں کھویا ہوا تھا۔ اسے پکارے جانے کا موہوم سا احساس ہوا مگر یوں جیسے فریب سماعت ہو۔ پکار بڑھتی

گئی۔ آواز کا حجم بھی بڑھتا گیا تو اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ اسے حیرت ہوئی۔ نثار اس کے پہلو میں بیٹھا اسے آواز دے رہا تھا۔

"کیا بات ہے نثار بھائی؟" اس نے سادگی سے کہا۔

نثار کچھ دیر جواب میں کچھ نہ کہہ سکا۔ وہ کچھ کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔ الٰہی بخش نے اچانک جو نظریں اٹھائیں تو اس کی آنکھوں میں اسے نقاہت نظر آئی۔ اس کے بدترین خدشات کی تصدیق ہو گئی۔ اسے افسوس ہوا کہ اس نے پہلے یہ خیال کیوں نہیں کیا۔ اسے احساس جرم ستانے لگا۔ آنکھوں میں وہ نقاہت تو اس نے بہت دیکھی تھی۔ اپنے گھر میں بھی اور اپنی آنکھوں میں بھی۔ خاصی کوشش کر کے نثار نے خود کو سنبھالا۔ سوال یہ تھا کہ بات کیسے کی جائے۔ الٰہی بخش کی خودداری سے وہ خوب واقف تھا۔ معاملہ بہت نازک تھا۔

"تجھ سے بات کرنے کو دل چاہ رہا تھا بخشے۔" نثار نے کہا۔ اس نے یہ نہیں پوچھا کہ وہ کن سوچوں میں گم رہتا ہے "پر لگتا ہے، میں مخل ہو رہا ہوں۔"

"ارے نہیں نثار بھائی، ایسی کوئی بات نہیں۔"

اس دوران نثار بہت تیزی سے کوئی ترکیب سوچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے مزید مہلت حاصل کرنے کے لئے ایک اور سوال اٹھایا۔ "آج کل تو بہت جلدی گھر چلا جاتا ہے۔"

"ہاں نثار بھائی۔"

"گھر میں کیا دل لگتا ہوگا۔"

"پڑھنے میں دل لگنے لگا ہے نثار بھائی۔ یہ دیکھو۔" الٰہی بخش نے اپنے تھیلے میں سے ڈائجسٹ نکال کر دکھایا۔

"اچھی بات ہے۔" نثار نے سر ہلا کر کہا۔ پھر بولا "یار بخشو، آج میں کھانا تیرے ساتھ کھاؤں گا۔" یہ کہتے ہوئے وہ اسے بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔

الٰہی بخش کا چہرہ فق ہو گیا تاہم اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا "ابھی تو بڑا وقت پڑا ہے نثار بھائی۔"

الٰہی بخش کے چہرے کے تاثر نے نثار کے اندازے کی پکی تصدیق کر دی تھی مگر پوری بات کرنے کے لئے بات آگے بڑھانا ضروری تھا "ایک بات کہنی ہے تجھ سے" اس نے کہا "تو سوچے گا کہ میں بہت بے شرم آدمی ہوں۔ لیکن یار بخشو، آدمی جسے اپنا سمجھتا ہے، اس سے تو بات کر سکتا ہے۔ اس میں تو شرم کی بات نہیں۔ میں تجھے چھوٹے بھائی کی طرح سمجھتا ہوں۔ تجھ پر تو حق ہے میرا۔ نظریں جھکا کے ہی سہی، تجھ سے تو سوال ڈال سکتا ہوں۔ میں۔"

نثار کے لہجے میں عاجزی اور بے بسی محسوس کر کے الٰہی بخش موم ہو گیا "تم مجھ سے ہر بات کر سکتے ہو نثار بھائی۔" اس نے کہا "میرے تمہارے درمیان تعلق ہی ایسا ہے۔ میں بھی تمہیں بڑا بھائی سمجھتا ہوں، ہم ایک دوسرے کے سامنے کبھی شرمندہ نہیں ہو سکتے۔"

"بات یہ ہے بخشے کہ مجھے کچھ پیسوں کی ضرورت ہے۔ تیرے سوا میں کسی سے سوال نہیں کر سکتا اور میرا خیال ہے کہ ضرورت کے وقت تجھے بھی میرے سوا کوئی نظر نہیں آنا چاہئے۔"

الٰہی بخش کو چکر تو پہلے ہی سے آ رہے تھے۔ یہ سن کر تو ایسا لگا، جیسے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ اسے تو فاقہ مستی میں احساس بھی نہیں ہوا تھا کہ وہ کتنے سخت وقت سے گزر رہا ہے۔ سترہ دن سے اسے کام نہیں ملا تھا اور اس سے پہلے وہ خود کام سے بچتا رہتا تھا۔ اس کے نتیجے میں جو پس انداز کیا تھا، وہ بھی بیٹھے بیٹھے کھا لیا تھا۔ سترہ دن پہلے جو پیسے ملے تھے، وہ اس نے گھر کے پاس جو ہوٹل تھا، وہاں دے دیئے تھے۔ اس ہوٹل میں وہ ناشتہ کرتا تھا اور اب تو باقاعدگی سے رات کا کھانا بھی کھاتا تھا۔ ہوٹل والے کو پیسے دینے کے بعد اس کے پاس بس اتنے پیسے بچے تھے کہ دوپہر کے کھانے اور کرائے کا خرچہ تین دن چل سکتا تھا۔ اسے امید تھی کہ اس دوران اسے کام مل جائے گا اور معاملات ٹھیک ہو جائیں گے لیکن اس کے بعد سے اب تک

کام نہیں ملا تھا۔

الٰہی بخش کو یہ بھی یاد نہیں تھا کہ کتنے دن سے وہ پیدل آ اور جا رہا ہے۔ کتنے دن سے وہ صرف رات کے کھانے پر گزارہ کر رہا، اس کے بعد سے اب تک اس کے منہ میں کھیں بھی اُڑ کر نہیں گئی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ پرسوں رات کھانے میں ادھار لکھوانے گیا تو ہوٹل کے مالک نے پوچھ لیا کہ کیا اسے کام اب تک نہیں ملا ہے۔ حالانکہ ہوٹل والے کا لہجہ خراب نہیں تھا اور انداز دوستانہ اور ہمدردانہ تھا، پھر بھی الٰہی بخش کو بکی کا احساس ہونے لگا۔ ناشتہ تو وہ ویسے بھی نہیں کرتا تھا۔ اگلے روز وہ رات کا کھانا کھانے بھی نہیں گیا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ اب وہ ادھار چکائے بغیر وہاں نہیں جائے گا۔

اور اب نثار کہہ رہا تھا کہ اسے کچھ پیسوں کی ضرورت ہے۔ وہ یہ بھی کہہ رہا تھا کہ آج وہ کھانا اس کے ساتھ ہی کھائے گا۔ اس کے ساتھ اس بات کا تو کوئی امکان ہی نہیں کہ آج وہ کھانا کھائے گا۔ گیارہ بج چکے تھے اور کام ابھی تک نہیں ملا تھا۔

اور نثار نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ کسی اور سے مدد نہیں مانگ سکتا۔ وہ اسے چھوٹے بھائی کی طرح سمجھتا ہے۔

یہ خیال کر کے الٰہی بخش کے حلق میں جیسے نمکین پانی کا کوئی چشمہ پھوٹا۔ پل بھر میں اس پانی کو اس کی آنکھوں کی طرف لپکنا اور جاری ہو جانا تھا۔ اس نے بہت تیزی سے اس کے آگے ضبط کا بند باندھا۔ پھر بھی آنکھیں نم تو ہو ہی گئیں۔ یہ بہت بڑی کامیابی تھی کہ وہ چھلکیں نہیں۔

''تو خاموش کیوں ہو گیا بخشے؟'' نثار نے اس چونکا دیا۔

''کچھ نہیں نثار بھائی۔'' الٰہی بخش نے کہا ''اللہ مالک ہے۔ کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔ انشاء اللہ کھانا ہم ساتھ ہی کھائیں گے۔'' اس لمحے اس کی زبان کو چھوئے بغیر دل سے دعا نکلی کہ کام مل جائے۔

''مجھے تو صاف جواب دے نا۔'' نثار نے اصرار کیا۔

''جواب نہ مانگو استاد تو اچھا ہے۔'' الٰہی بخش نے آہ بھری کے کہا۔ اس احساس نے اس کا حفاظتی حصار توڑ دیا کہ نثار کو مدد کی ضرورت ہے اور وہ اس کی مدد نہیں کر سکتا ''میری جیب تو نہ جانے کتنے دن سے خالی ہے۔ مگر فکر نہ کرو، اللہ مالک ہے۔''

''تو اتنے دن سے کام کیسے چل رہا ہے تو؟''

کبھی کچھ نہ بتانے والے الٰہی بخش نے صرف شرمندگی میں ڈوبے ہونے کی وجہ سے نثار کو اپنا پورا حال سنا دیا۔

نثار کی شرمندگی کی کوئی حد نہیں تھی۔ وہ دل ہی دل میں خود کو برا بھلا کہتا رہا۔ ایک فٹ پاتھ پر ساتھ بیٹھ کر بھی وہ اس سے اتنا بے خبر تھا۔ جبکہ اسے معلوم تھا کہ اتنے دن سے اسے کام نہیں ملا ہے ''تو نے تو غیریت کی حد کر دی بخشے!'' اس نے خفگی سے کہا۔ ''مجھے کیوں نہیں بتایا؟''

''میرا خیال ہے، فٹ پاتھ پر سبھی کا حال ایک جیسا ہوتا ہے۔'' الٰہی بخش نے سادگی سے کہا۔

''پھر بھی لوگ ایک دوسرے کے کام آتے رہتے ہیں۔'' نثار شرمندہ بھی تھا اور خفا بھی... الٰہی بخش سے بھی اور اپنے آپ سے بھی۔ ''تجھے مجھ کو بتانا تو چاہئے تھا۔''

''لیکن نثار بھائی، یہ تو...''

''تو نہیں سمجھتا، پڑوسی بھوکا رہے تو پڑوسی سے اللہ جواب طلب کرتا ہے، وعدہ کر، آئندہ ایسی بات چھپائے گا نہیں۔ کوئی ایک آدمی تو ہر ایک کے لئے ایسا ہوتا ہے جس سے دل کی بات کی جا سکتی ہے۔ تو مجھے اپنا بڑا بھائی سمجھا کر۔''

الٰہی بخش حیرت سے سوچتا رہا کہ یہ نثار اتنا شرمندہ کیوں ہو رہا ہے۔ شرمندہ تو اسے ہونا چاہئے تھا۔

ادھر نثار سوچ رہا تھا کہ اب کیا کرے۔ پیسے تو اس کی جیب میں اس وقت بھی تھے اور وہ الٰہی بخش کو دے سکتا تھا لیکن یہ ٹھیک نہیں تھا... وہ جانتا تھا کہ اگر اس نے ضرورت مند بن کر بات نہ کی ہوتی تو الٰہی بخش کبھی سچ نہ اگلتا۔ اب وہ اسے یوں پیسے نہیں دے سکتا تھا۔ آئندہ کے لئے بات خراب ہو جاتی۔ نثار جانتا تھا کہ الٰہی بخش کی طرح اکیلا ہونا کتنی خوفناک بات ہے۔ آدمی دکھ سے یا بھوک سے سسک سسک کر مر جائے لیکن کسی طرح

اظہار کرے۔ وہ الٰہی بخش کو دکھ اور مصائب بانٹنا اور کسی کو اپنا سمجھنا سکھانا چاہتا تھا۔

''لیکن نثار بھائی تم تو مجھ سے زیادہ پریشان ہو، تم تو بال بچوں والے ہو۔'' الٰہی بخش کہہ رہا تھا۔

نثار نے چونک کر اسے دیکھا ''تو فکر نہ کر۔ مجھے اپنے لئے بھی کچھ پیسوں کا بندوبست کرنا ہے۔ تیرے لئے بھی کروں گا۔ تو بیٹھ، میں ابھی آتا ہوں۔''

یہ کہہ کر نثار اپنی بات کا بھرم رکھنے یعنی پیسوں کا بندوبست کرنے کی غرض سے ایک طرف چلا گیا۔ پانچ منٹ بعد وہ آیا تو الٰہی بخش اپنی جگہ موجود نہیں تھا۔ نثار نے حیرت سے ادھر اُدھر دیکھا۔ اسے الٰہی بخش اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ اس کے بائیں ہاتھ میں وہ تھیلا تھا جس میں وہ اپنے برش وغیرہ رکھتا تھا۔ اس کے ساتھ ایک خوش لباس آدمی بھی تھا۔

الٰہی بخش، نثار کے پاس آ کر رکا ''نثار بھائی۔ مجھے کام مل گیا ہے۔ اب چلتا ہوں۔ کل ملاقات ہوگی۔'' اس نے چہک کر کہا اور نثار سے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ ہاتھ ملانے کے دوران اس کے ہاتھ سے کوئی کاغذی چیز نثار کے ہاتھ میں منتقل ہوگئی۔ پھر الٰہی بخش تیز قدموں سے آگے بڑھ گیا۔

نثار نے حیرت سے اپنے ہاتھ کو دیکھا۔ وہ دس کا نوٹ تھا جو الٰہی بخش بہت خاموشی سے اسے تھما گیا تھا۔ چند لمحے تو نثار سناٹے کی سی کیفیت سے ساکت کھڑا رہا، پھر اس نے الٰہی بخش کو پکارنے کے لئے ہونٹ کھولے مگر ایک احساس نے اسے روک دیا۔ کسی کو مدد مانگنا سکھانے کے لئے ضروری ہے کہ اس سے مدد لی جائے۔ نثار نے دس کا وہ نوٹ جیب میں رکھ لیا۔ یہ نوٹ وہ اگلے روز واپس بھی کر سکتا تھا اور یہ جتا بھی سکتا تھا کہ بھائی کو بھائی سے مدد لینے میں عار نہیں ہونی چاہیے۔

ادھر تیز قدم بڑھاتے ہوئے الٰہی بخش بہت خوش تھا۔ رزق دینے والے نے اس کی شرم رکھ لی تھی۔ اس نے کسی سے مدد نہیں مانگی تھی لیکن نثار کے سامنے اعتراف کرنے کے بعد وہ نثار سے کچھ لینے کو منع نہیں کر سکتا تھا اور وہ کچھ لینا بھی نہیں چاہتا تھا۔ اللہ نے اس کی دل سے نکلی ہوئی دعا سن لی تھی۔ نثار کے جاتے ہی وکیل صاحب آ گئے تھے۔ وکیل صاحب نے ایک بار پہلے بھی اس سے کام کرایا تھا اور اس سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ قریب ہی وکیل صاحب کا بہت بڑا دو منزلہ مکان تھا۔ پہلی بار انہوں نے اپنی تین دکانوں میں رنگ کرایا تھا اور وعدہ کیا تھا کہ اگلی بار وہ اسے پورے بنگلے کا کام دیں گے۔

وکیل صاحب نے اس سے کام کی بات کی تو اس نے کہا۔ ''وکیل صاحب، ایک بات کہوں، برا تو نہیں مانیں گے۔''

وکیل صاحب چونکے۔ انہوں نے سوچا، شاید یہ زیادہ مزدوری کی بات کرے گا۔ پھر بھی انہوں نے کہا ''بولو، کیا بات ہے۔''

''صاحب جی، مجھے پندرہ روپے پیشگی دے سکتے ہیں؟''

وکیل صاحب نے جیب سے بیس روپے نکال کر اسے دے دیئے۔ یوں عزت رہ گئی۔

سو اب الٰہی بخش کا رواں رواں اللہ کا شکر ادا کر رہا تھا۔ شکر گزاری کے بعد توبہ کا وقت آیا۔ الٰہی بخش کی سمجھ میں آیا کہ پچھلے دنوں اس نے کام ٹھکرا ٹھکرا کے بہت ناشکرا پن کیا ہے، ورنہ اس پر یہ وقت ہی نہیں آتا اور اللہ نے تو اس ناشکرے پن کے باوجود اس کی حاجت روائی فرمائی ہے۔

بے شک، وہ بڑا رحم والا، نہایت مہربان ہے اور اب تو سب تعریفیں اس کے لئے ہیں۔

☆

وکیل صاحب کا کام دس دن میں ختم ہوا اور الٰہی بخش کے سارے دلدر دور ہو گئے۔ ہوٹل کا حساب چکتا ہو گیا اور جیب بھی بھری ہو گئی مگر اسے ایک بڑا سبق مل گیا تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب کام کو کبھی نہیں ٹھکرائے گا۔

لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کے بارے میں اوپر کچھ اور فیصلہ ہو چکا ہے۔

اس روز وہ معمول کے مطابق سوا بارہ بجے اٹھا۔ کھانا کھا کر وہ ساوی کے گھر کی طرف چل دیا جہاں وہ گزشتہ دس دن سے نہیں جا سکا تھا۔ شاید اسی لئے اس روز اس کے قدموں میں دھمال کی سی کیفیت تھی۔

شیخ مظہر علی کے بنگلے کے سامنے سے گزرتے ہوئے اسے خیال آیا کہ اگر کبھی اس بنگلے کا گیٹ اس کے لئے کھل جائے تو کیا ہو۔ اس نے فوراً ہی اس فضول خیال کو ذہن کے کسی نہاں خانے میں دھکیل دیا۔ نہ کبھی ایسا ہونا تھا اور نہ ہی اسے ایسی کوئی خواہش تھی۔

معمول کے مطابق وہ اس موڑ تک گیا جہاں سڑک زاویہ قائمہ بناتے ہوئے دونوں جانب مڑتی تھی۔ وہاں سے وہ واپسی کے لئے پلٹا۔ وہ پلٹا تو ہمیشہ کی طرح شیخ صاحب کے بنگلے کے سامنے والے فٹ پاتھ پر تھا۔ یعنی اس کے اور بنگلے کے درمیان سڑک حائل تھی۔

وہ کوئی بیس گز چلا ہو گا۔ وہاں آئس کریم اور ٹھنڈی بوتلوں کی ایک چھوٹی سی دکان تھی۔ وہ وہاں سے گزر رہا تھا۔ اسی وقت پانچ چھ سال کا ایک لڑکا ایک بڈھے شخص کے ساتھ سڑک پار کرنے کے ارادے سے فٹ پاتھ سے سڑک پر اترا۔ بچے نے بڈھے کی انگلی تو نہیں تھامی ہوئی تھی لیکن انداز بتاتا تھا کہ دونوں ساتھ ہیں۔

اسی لمحے موڑ کی طرف سے کسی گاڑی کے ٹائر سڑک سے رگڑنے اور چرچرانے کی آواز سنائی دی۔ کچھ چرچراہٹ بریکوں کی وجہ سے بھی تھی۔

الٰہی بخش نے پلٹ کر دیکھا۔ ایک سرخ رنگ کی کار موڑ مڑ کر اسی سڑک پر آ رہی تھی۔ گاڑیاں تو بے درجے کے موڑ ایسی رفتار سے نہیں کاٹتیں۔ یہ ایک غیر معمولی بات تھی۔ موڑ کاٹتے ہوئے گاڑی سڑک کی دوسری سائیڈ تک پہنچ گئی تھی اور اب وہ یوں سنبھل رہی تھی، جیسے کوئی شرابی گرنے کے بعد لڑکھڑاتے ہوئے سنبھلتا ہے۔ اس کی رفتار اب بھی بہت زیادہ تھی۔

الٰہی بخش کی نظریں سڑک کی طرف اٹھیں۔ بڈھا اور بچہ اس وقت سڑک کے عین وسط میں تھے۔ انہوں نے گاڑی کی آواز بھی سن لی تھی اور بے قابو گاڑی ہی کی طرف متوجہ تھے۔ پھر انہوں نے سڑک پار کرنے کے بجائے واپس آنے کا فیصلہ کیا، اس لئے کہ گاڑی رانگ سائیڈ پر آتی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ پلٹے اور اسی طرف لپکے جہاں الٰہی بخش کھڑا تھا۔

ادھر گاڑی سنبھل کر اب درست سائیڈ کی طرف آ رہی تھی!

الٰہی بخش کو صورت حال کی سنگینی کا احساس ہو گیا تھا۔ گاڑی کی جو رفتار تھی، اس سے ان تک پہنچنے میں گاڑی کو ایک سیکنڈ کا وقت بھی نہ لگتا۔ ان دونوں کے پاس نہ اب پلٹنے کی مہلت تھی اور نہ وہ گاڑی سے بچ کر ادھر آ سکتے تھے۔

فیصلہ کرنے کی بھی مہلت نہیں تھی۔ گاڑی اسی رفتار سے چھپٹی چلی آ رہی تھی۔ ان دونوں نے بھی دیکھ لیا تھا اور اب خوف سے اپنی جگہ جم کر رہ گئے تھے۔ الٰہی بخش نے تیزی سے جست لگائی۔ اس کے دونوں ہاتھ آگے کی طرف پھیلے ہوئے تھے۔ اسے صرف احساس ہوا کہ گاڑی بالکل اس کے سر پر آ پہنچی ہے۔ آخری کوشش کے طور پر اس نے اپنے ہاتھ پھیلا کر دھکیلے اس کے ہاتھ دو جسموں سے ٹکرائے۔ ساتھ ہی گاڑی اس کے جسم سے ٹکرائی۔ اس نے خود کو فضا میں اڑتا محسوس کیا۔ سڑک پر گرنے تک وہ اپنے حواس میں تھا مگر پھر اسے کسی بات کا ہوش نہیں رہا۔

☆

آنکھ کھلی تو وہ جنت میں تھا!

اسے اپنے آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ وہ لیٹا ہوا تھا۔ سادی روئی سے اس کی پیشانی صاف کر رہی تھی۔ اچانک اسے احساس ہوا کہ اس کی پیشانی پر زخم ہے جس سے خون رس رہا ہے۔ لیکن یہ احساس فوراً ہی معدوم ہو گیا۔ خوشی تکلیف سے زیادہ بڑی تھی۔ پھر بھی اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کہاں ہے اور یہاں تک کیسے پہنچا ہے۔ اتنا اسے یاد تھا کہ اس نے ایک بڈھے اور بچے کو بے قابو کار سے بچانے کی کوشش کی تھی اور خود گاڑی کی لپیٹ میں آ گیا تھا۔

''تم بہت من مانی کرتی ہو سعدیہ۔'' کسی نے کہا''ڈاکٹر آنے والا ہے۔ وہ دیکھ لے گا۔ تم خواہ مخواہ ڈاکٹری دکھا رہی ہو۔''

الٰہی بخش نے سر گھما کر دیکھا اور اس خاتون کو بھی پہچان لیا۔ اس نے پہلی بار سادی کو دیکھا تو یہی اس کے ساتھ تھی۔ وہ یقیناً اس کی ماں تھی۔ پھر اسے ایک اور خیال آیا۔ سادی کا نام سعدیہ ہے۔ پیارا نام ہے سعدیہ...... لیکن سادی کتنا اچھا لگتا ہے۔

''آپ بھی کمال کرتی ہیں امی۔'' سادی نے کہا''ڈاکٹر کے انتظار میں یونہی چھوڑ دیا جائے۔ کم از کم زخم کی صفائی تو کی جا سکتی ہے۔''

''اچھا بھئی...... جو جی چاہے کرو۔''

الٰہی بخش لیٹے لیٹے یہ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ کس حد تک زخمی ہے۔ اسنے ہاتھ ہلائے۔ ٹانگوں کو حرکت دی۔ گھٹنوں کے نیچے کچھ تکلیف ہو رہی تھی۔ اسکے علاوہ سر اور پیشانی بھی دکھ رہے تھے۔ اور کہیں کوئی تکلیف نہیں تھی۔ یہ حیرت انگیز بات تھی کیونکہ وہ گاڑی کے عین سامنے تھا۔ اصولاً گاڑی کو اسکے اوپر سے گزر جانا چاہئے تھا۔ ایک ہی بات سمجھ میں آئی تھی کہ آخری ثانیے میں ڈرائیور گاڑی کو اس سے دور کاٹنے میں کامیاب ہو گیا ہو گا۔ وہ گاڑی کی سائیڈ سے ٹکرایا ہو گا، اسی لئے وہ فضا میں اچھلا تھا اور سر کے بل گرا تھا۔ یعنی خدا نے کرم کیا تھا۔ بہت سستے میں جان چھوٹ گئی تھی۔

جان چھوٹ گئی تھی اور انعام کتنا بڑا تھا! یہ طے تھا کہ اس وقت وہ سادی کے گھر میں ہے جس کے گیٹ سے گزرنے کا اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔

''لو...... ڈاکٹر بھی آ گیا، اب ہٹ جاؤ۔'' سادی کی ماں کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

وہی بڈھا شخص ڈاکٹر کا بیگ اٹھائے ہوئے تھا جسے اس نے دھکیلا تھا۔ اس کے پیچھے ڈاکٹر تھا۔ سادی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اب الٰہی بخش نے دیکھا کہ وہ پلنگ کی سائیڈ میں ایک کرسی پر بیٹھی تھی۔ ''بیٹھئے ڈاکٹر صاحب۔'' اس نے مترنم آواز میں کہا۔

ڈاکٹر نے اس سے پوچھا کہ تکلیف کہاں کہاں ہو رہی ہے۔ پھر اس نے اسے چیک کیا''تشویش کی کوئی بات نہیں بیگم صاحبہ۔'' اس نے سادی کی ماں سے کہا''معمولی چوٹیں ہیں، البتہ سر کی اندرونی چوٹ خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔ میں دوائیں لکھ رہا ہوں منگوالیں۔ مریض کو آرام کی ضرورت ہے۔ ہاں، اسے قے ہو یا متلی کی شکایت کرے تو مجھے فوراً بلوا لیجئے گا۔'' بیگم صاحبہ نے ڈاکٹر کو فیس دی، ڈاکٹر چلا گیا۔ بیگم صاحبہ نے ڈاکٹر کا لکھا ہوا نسخہ بڈھے شخص کو دیا''جاؤ کرمو چاچا، یہ دوائیں لے آؤ۔''

کرمو کے جانے کے بعد وہ الٰہی بخش کی طرف مڑیں''تو الٰہی بخش ہے تمہارا نام۔''

''جی......''

''رہتے کہاں ہو؟''

''اعظم بستی میں۔''

''یہ کہاں ہے؟'' انہوں نے پوچھا، پھر بے نیازی سے کہا''خیر...... ہو گی کہیں۔ یہ بتاؤ ماں باپ کے ساتھ رہتے ہو؟''

''جی نہیں، وہ سب تو ایبٹ آباد میں ہیں۔ میں یہاں اکیلا رہتا ہوں۔''

''یہ اور بھی اچھا ہے کیونکہ تمہیں کل تک تو یہاں رہنا ہو گا۔ ماں باپ ہوتے تو اور پریشانی ہوتی۔''

الٰہی بخش کو ان کا لہجہ اور انداز اچھا نہیں لگا لیکن اسے اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔

''تم کرتے کیا ہو؟'' اس بار سوال سادی نے کیا تھا۔

''رنگ روغن کا کام کرتا ہوں۔'' اس نے سادی کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا ''یہاں قریب ہی فٹ پاتھ پر بیٹھتا ہوں کیفے لبرٹی کے سامنے۔''

سادی کی آنکھیں ایک پل کو چمکیں ''ہاؤ ویری رومینٹک۔'' اس نے تمسخر آمیز لہجے میں کہا۔

''ٹھیک کہتی ہیں آپ، زندگی ہے ہی بہت رومانوی چیز۔'' الٰہی بخش نے سادگی سے کہا۔

سادی کی آنکھیں پھیل گئیں ''پڑھے لکھے معلوم ہوتے ہو!''

جی نہیں، میٹرک کے بعد تعلیم چھوڑ کے زندگی کی رو، تو بہت کھوجنے کے لئے نکل کھڑا ہوا تھا۔''

بیگم صاحبہ کی پیشانی کی شکنیں گہری ہو گئیں۔ ''اب چلو بھی سادی!'' انہوں نے ترش لہجے میں کہا ''ہر ایک سے باتیں کرنے کھڑی ہو جاتی ہو۔''

سادی، بیگم صاحبہ کے ساتھ چل دی۔ دروازے پر پہنچنے کے بعد اس نے پلٹ کر الٰہی بخش کو دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں معذرت تھی۔ بیگم صاحبہ اس وقت تک باہر نکل چکی تھیں ''سنو الٰہی بخش، کرم چاچا تمہارا خیال رکھے گا۔ لیکن ایک بات یاد رکھنا، اگر تکلیف محسوس ہو تو فوراً کرم چاچا کو بتا دینا، یہ بہت ضروری ہے۔''

وہ دونوں چلی گئیں۔ الٰہی بخش نے آنکھیں موند لیں۔ سادی واپس آ گئی۔ اس نے آنکھیں کھول دیں 'یہ کیا ہو رہا ہے میرے ساتھ؟' اس نے خود کلامی کی۔

'عشق کی تربیت دی جا رہی ہے تمہیں۔' اس کے اندر سے کسی نے کہا۔

'یہ کیسا عشق ہے کہ میں کسی سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتا۔'

'عشق میں کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔'

اس نے پھر آنکھیں موند لیں۔ سادی پھر آ گئی۔ اس نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھ دیا۔ نہ جانے کیسے لیکن زندگی میں پہلی بار وہ دن میں ہی سو گیا۔

☆

اس بار آنکھ کھلی تو کرم دین چاچا اس کے پاس بیٹھے تھے۔ ان سے بات ہوئی تو اسے اندازہ ہوا کہ وہ در حقیقت اتفاقات کا اسیر ایک ایسا شخص ہے جسے کوئی انجانی قوت کسی خاص سمت میں لئے جا رہی ہے۔

یہ بات کھلنے میں زیادہ دیر نہیں لگی کہ بڈھا کرم دین بھی ایبٹ آباد کا رہنے والا ہے۔ ''تو ایبٹ آباد میں کہاں رہتا ہے بیٹے؟''

''بانڈہ ونگ میں چاچا، اور تم؟''

''میں شیخا باندی کا ہوں۔'' کرم دین کا لہجہ سوچ میں ڈوبا ہوا تھا ''باپ کا تیرے کیا نام ہے؟''

''پیر بخش۔''

پتا چلا کہ کرم دین اس کے باپ کو بہت اچھی طرح جانتا ہے۔ برسوں ... برسوں پہلے دونوں ایک ہی اسکول میں پڑھتے تھے۔ دیر تک کرم دین، پیر بخش کے بارے میں معلوم کرتا اور اپنے اور اس کے لڑکپن کی باتیں کرتا رہا۔ پھر اس نے بڑی شفقت سے کہا ''تو تو ویسے ہی میرے لئے بیٹے کی طرح ہے۔ میری جان بچا کر تو تو سگے بیٹے سے زیادہ عزیز ہو گیا ہے۔''

''کیسی باتیں کرتے ہو چاچا۔'' الٰہی بخش نے شرمساری سے کہا۔

''اور وہ بچہ جو میرے ساتھ تھا نا، وہ اس گھر کا اکلوتا بیٹا ہے ... بہت لاڈلا۔ دو ہی بچے ہیں ان لوگوں کے۔ ساری بی بی اور اظہر بیٹا۔''

''بچے کو چوٹ تو نہیں آئی؟''

''خراش بھی نہیں آئی۔ وہ تو اللہ نے تجھے رحمت کا فرشتہ بنا کر بھیج دیا، ورنہ میرے اور اس کے بچنے کا سوال ہی نہیں تھا۔'' کرم دین کہتے کہتے رکا۔ پھر بولا ''یہ اظہر بابا بڑی منتوں مرادوں کا بچہ ہے۔ تجھے اندازہ ہی نہیں کہ تو نے ان لوگوں پر کتنا بڑا احسان کیا ہے!''

''احسان کرنے والی تو اللہ کی ذات ہے چاچا۔'' الٰہی بخش نے سخت لہجے میں اس کی بات کاٹ دی۔

''ٹھیک ہے لیکن عزت تو وسیلے کی بھی ہوتی ہے۔ یہ بہت اچھے لوگ ہیں۔ کسی کا احسان کبھی نہیں بھولتے۔''

''پر بیگم صاحبہ تو ایسے بات کر رہی تھیں، جیسے میں کوئی مصیبت یا بوجھ ہوں۔ اگر مجھے ...'' الٰہی بخش نے بروقت خود کو روک لیا۔ یہ حقیقت تھی کہ اگر اس گھر میں ساری نہ ہوتی تو فوراً ہی وہاں سے نکل جاتا۔

''بس بیگم صاحبہ ایسی ہی ہیں۔'' کرم دین نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا ''کبھی کبھی تو لگتا ہے کہ ہم جیسے، ان کی نظروں میں انسان ہی نہیں۔ پر صاحب بہت اچھے ہیں اور بچے بھی۔ بڑی عزت دیتے ہیں۔ بیگم صاحبہ کو شاید پیسے کا غرور ہے۔ سب نوکروں سے ایسے ہی بات کرتی ہیں۔''

''پر میں نوکر تو نہیں ہوں ان کا۔''

''چھوڑ دان کی بات۔ صاحب آئیں تو دیکھنا۔ اب تو یہ دوا کھا لے۔''

الٰہی بخش نے پانی کے ساتھ گولی نگل لی ''تو یہ ہے ان کا بنگلہ ...'' وہ بڑبڑایا۔

''بنگلہ کہاں پگلے۔ یہ تو میرا کوارٹر ہے۔ ایک حصے میں نوکروں کے لئے کوارٹر بنوا دیے ہیں۔ بنگلا تو بہت بڑا ہے۔ کل دیکھنا۔''

الٰہی بخش نے ادھر ادھر دیکھا ''میں یہاں سوؤں گا تو تم کیا کرو گے؟'' اس نے پوچھا ''چارپائی تو یہاں ایک ہی ہے۔''

''تو اس کی فکر نہ کر۔''

''چاچا ... میں گھر ہی نہ چلا جاؤں۔ اب تو میں بالکل ٹھیک ہوں۔''

''بے کار کی باتیں نہ کر۔ صاحب سے ملے بغیر تو نہیں جا سکتا۔ چلا گیا تو صاحب بہت خفا ہوگا مجھ سے۔ یہ بات نہ ہوتی تو بیگم صاحبہ نے ہی چلتا کر دیا ہوتا تجھے۔''

الٰہی بخش یہ سن کر مسکرایا "تو یہ بات ہے!"

"میں نے کہا نا کہ صاحب بہت اچھا آدمی ہے۔"

دیر تک وہ اس گھر کی، کراچی کی اور ایبٹ آباد کی باتیں کرتے رہے۔ پھر کرمو کھانا لے آیا۔ دونوں نے ساتھ بیٹھ کر کھایا۔ کھانے کے دوران الٰہی بخش نے پوچھا "تم یہاں کیا کرتے ہو چاچا؟"

"میں مالی ہوں اور باہر سے سودا سلف بھی لاتا ہوں۔ پورے پندرہ سال سے ہوں یہاں۔ صاحب بہت اعتبار کرتے ہیں مجھ پر۔ مجھے نوکری چھوڑ کر جانے ہی نہیں دیتے۔ وہاں میرے بیٹے اب اپنے پاؤں پر کھڑے ہیں۔ وہ مجھے بلاتے ہیں کہ اب مجھے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ پر صاحب مجھے نہیں چھوڑتے۔ سال دو سال میں کچھ دن بچوں کے ساتھ گزار آتا ہوں۔"

کھانے کے بعد الٰہی بخش نے دوا لی اور تھوڑی ہی دیر بعد اسے نیند آگئی۔

☆

شیخ مظہر علی رات دس بجے گھر پہنچے۔ شام کو انہوں نے گھر فون کر کے بتا دیا تھا کہ ایک اہم میٹنگ کی وجہ سے واپسی میں دیر ہو جائے گی۔ کھانے پر ان کا انتظار نہیں کیا جائے۔ وہ پہنچے تو سادی انہیں جاگتی ملی۔ اس نے حیرت سے انہیں دیکھا "پاپا، آپ تو جلدی آگئے!"

"کیا بات ہے بیٹی، واپس چلا جاؤں۔ تمہیں میرا آنا اچھا نہیں لگا۔" شیخ صاحب نے صوفے پر بیٹھ کر پاؤں پھیلاتے ہوئے کہا۔

"آپ جانتے ہیں پاپا کہ یہ بات نہیں۔" سادی ٹھنک کر بولی "آپ نے کہا تھا کہ دیر سے گھر آئیں گے۔ ہم نے کھانا کھالیا۔ اتنی دیر تو ہم انتظار کر سکتے تھے۔ ساتھ ہی کھا لیتے کھانا۔ صرف دس ہی تو بجے ہیں۔"

شیخ صاحب مشفقانہ انداز میں مسکرائے "مجھے اور دیر بھی ہو سکتی تھی۔ یہ تو اتفاق ہے کہ میں جلد چلا آیا۔"

"کھانا لگواؤں آپ کے لئے؟"

"بھوک نہیں ہے، البتہ کافی پلوا دو۔"

سادی اٹھ کر گئی اور ملازمہ جمیلہ کو کافی کے لئے کہہ آئی۔ وہ پھر باپ کے پاس آ بیٹھی "تمہاری ممی کہاں ہیں؟" شیخ صاحب نے پوچھا۔

"اوپر اپنے بیڈ روم میں۔ سر میں درد ہو رہا تھا۔ نیند کی گولیاں لے لی ہیں۔"

"سر کے درد کا علاج نیند کی دوا لے کر سو جانا تو نہیں۔" شیخ صاحب نے کہا "مگر وہ بات کہاں سنتی ہیں!"

سادی کو ان کے لہجے کی بے بسی پر دکھ ہونے لگا۔ اس نے تو بچپن سے ہی ماں باپ کو لڑتے جھگڑتے دیکھا تھا۔ امی کے مزاج میں سرکشی بہت تھی۔ وہ پاپا کی کوئی بات نہیں مانتی تھیں۔ پاپا میں بھی برداشت کا مادہ نہیں تھا۔ شکر تھا کہ مار پیٹ کی نوبت نہیں آتی لیکن امی اور پاپا میں کئی کئی دن تک بات چیت بند رہتی تھی پھر اظہر کی پیدائش کے بعد پاپا بہت متحمل مزاج ہو گئے اور امی اور چڑچڑی اور بد دماغ ہو گئیں۔ شاید اس لئے کہ پاپا اب ان سے لڑتے بھی نہیں تھے۔

"اور اظہر کہاں ہے۔" شیخ صاحب نے کافی کا گھونٹ لیتے ہوئے پوچھا۔ جمیلہ چند لمحے پہلے کافی کی پیالی ان کے سامنے رکھ گئی تھی۔

سادی نے ان کی بات سنی ہی نہیں۔ وہ اپنی سوچوں میں گھری ہوئی تھی۔

"بیٹی، اظہر کہاں ہے؟" شیخ صاحب نے دہرایا۔ انہیں حیرت ہو رہی تھی۔ اظہر ہر حال میں ان کا انتظار کرتا تھا۔ چاہے رات کے بارہ بج جائیں۔

"اظہر" سادی نے چونک کر سر اٹھایا "وہ سو رہا ہے پاپا۔ ڈاکٹر نے اسے ٹرینکولائزر دیا تھا۔"

اب کے چونکنے کی باری شیخ صاحب کی تھی "کیوں بھئی ... کیوں ہوا اسے۔ خیریت تو ہے؟" انہوں نے پرتشویش لہجے میں پوچھا۔

"تو کیا امی نے آپ کو نہیں بتایا؟"

"کیا نہیں بتایا؟" شیخ صاحب سنبھل کر بیٹھ گئے۔

سادی کو اس بار امی کے رویے پر شدید غصہ آیا۔ اس کا خیال تھا کہ امی نے فون پر پاپا کو حادثے کے متعلق بتا دیا ہوگا۔ اسے تو حیرت ہوئی تھی کہ پاپا فوراً ہی دوڑے کیوں نہیں آئے۔ پھر اس نے سوچا ... شاید اس لئے کہ اظہر کو خراش بھی نہیں آئی تھی۔

"پاپا ... اظہر آج ایک جان لیوا حادثے میں بال بال بچا ہے۔"

شیخ صاحب اچھل کر کھڑے ہو گئے۔ وہ زینوں کی طرف لپکے لیکن سادی نے انہیں پکار لیا "پریشانی کی کوئی بات نہیں پاپا۔ اسے خراش بھی نہیں آئی ہے۔ اس وقت وہ بے خبر سو رہا ہوگا۔ صبح دیکھ لیجئے گا اسے۔"

"تم سچ کہہ رہی ہو نا؟" شیخ صاحب کے لہجے میں التجا تھی۔

"ہاں پاپا، آپ آرام سے بیٹھ کر کافی پئیں۔ اظہر کو معمولی سی چوٹ بھی آئی ہوتی تو میں اتنے سکون سے بیٹھی ملتی آپ کو؟" سادی کے لہجے میں شکایت تھی۔

بات درست تھی۔ شیخ صاحب نے خجالت سے بیٹی ... کو دیکھا۔ وہ اپنی جگہ واپس آ بیٹھے۔ "ہوا کیا تھا۔" انہوں نے پوچھا۔ کافی کی پیالی کو وہ بھول ہی گئے تھے۔

"تفصیل تو مجھے نہیں معلوم پاپا۔ کرمو چاچا بتا سکتے ہیں۔ مجھے اتنا معلوم ہے کہ ایک اجنبی انہیں بچاتے ہوئے زخمی ہو گیا تھا۔ اس کو بھی معمولی چوٹیں آئیں۔"

"اسے بھی تمہاری ممی نے کچھ احسان کر کے نکال دیا ہوگا۔" شیخ صاحب کے لہجے میں تلخی تھی۔

"ارادہ تو یہی تھا ان کا لیکن میں نے انہیں روک دیا۔ وہ کرمو چاچا کے کوارٹر میں ہے۔"

"تم بہت پیاری بیٹی ... ہو میری۔" شیخ صاحب نے اٹھتے ہوئے کہا "میں ذرا اسے دیکھ آؤں۔"

"پاپا، میں جمیلہ کو بھیج کر انہیں یہیں بلوا لیتی ہوں۔"

"نہیں سادی بیٹی، مجھے خود جانا چاہئے۔" یہ کہہ کر شیخ صاحب باہر چلے گئے۔ سادی پھر اپنی سوچوں میں گم ہو گئی۔ امی اور پاپا کتنے مختلف ہیں ایک دوسرے سے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ دو افراد جنہیں ایک دوسرے کے ساتھ زندگی گزارنی ہوتی ہے، وہ خوفناک حد تک ایک دوسرے کے برعکس کیوں ہوتے ہیں۔ اب تو اسے شادی سے خوف آتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس کے ساتھ بھی یہی ہوگا۔

اُدھر ہلکی سی دستک پر کرم دین نے دروازہ کھولا تو شیخ صاحب کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ "صاحب جی آپ۔ مجھے بلوا لیا ہوتا۔"

"میں اس سے ملنے آیا ہوں۔" شیخ صاحب نے کہا اور اندر داخل ہو گئے۔ انہوں نے سوئے ہوئے الٰہی بخش کو غور سے دیکھا۔ وہ بہت خوش رو جوان تھا۔ پتلا ناک نقشہ، کشادہ پیشانی اور پیشانی پر بہت گہرے زخم کا نشان، انہیں حیرت ہوئی کہ وہ نشان بدنما نہیں لگ رہا تھا۔ بلکہ لگتا تھا کہ وہ اس کے وجود کا ایک حصہ ہے۔ "ارے ... یہ تو سو رہا ہے؟" انہوں نے دھیمی سی آواز میں کہا۔

"جی صاحب جی!"

"تم ذرا میرے ساتھ آؤ کرمو۔"

کرم دین دروازہ بھیڑ کر ان کے پیچھے نکل آیا۔ وہ اسے باغیچے میں لے گئے۔ وہاں گارڈن چیئرز پڑی تھیں۔ وہ ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ "بیٹھو کرمو۔" کرمو نیچے گھاس پر بیٹھ گیا۔

"اب مجھے سب کچھ بتاؤ۔"

کرم دین نے بتایا کہ کس طرح وہ اظہر کے ساتھ سڑک پار کر رہا تھا کہ وہ گاڑی موڑ سے اس طرف آئی۔ آواز سے اندازہ ہو گیا تھا کہ گاڑی کی رفتار خطرناک ہے۔ "گاڑی مڑتے ہوئے اپنے گھر والی سائیڈ پر تھی صاحب جی! رفتار بہت تیز تھی اور فاصلہ کم۔ ہم اس وقت سڑک کے بیچ میں تھے۔ اظہر بابا ڈر کر پلٹے کہ دوسری طرف واپس چلے جائیں، میں بھی ان کے ساتھ پلٹا، اتنی دیر میں گاڑی نے رخ بدل لیا دوسری سائیڈ پر۔ صاحب جی، ہم دونوں ڈر کے مارے کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ ہل بھی نہیں سکے اور گاڑی تیزی سے ہماری طرف آ رہی تھی۔ کھڑے رہنے میں تو پھر شاید بچت ہو جاتی۔ مگر اظہر بابا آگے کی طرف جانے والے تھے اور میں انہیں روک بھی نہیں سکتا تھا۔ بس صاحب جی، ایسے میں یہ الٰہی بخش فرشتہ بن کر آیا۔ اس نے جھپٹ کر ہم دونوں کو دھکا دیا۔ ہم گر گئے۔ یہ گاڑی کی لپیٹ میں آیا۔ وہ تو شکر ہے کہ ڈرائیور نے عین وقت پر گاڑی کو دوسری طرف گھما دیا، ورنہ یہ کچلا جاتا صاحب جی پھر بھی یہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ میں نوکروں سے اٹھوا کر اسے کوارٹر میں لے آیا۔ ڈاکٹر کو بلا کر دکھایا۔ وہ بولتا ہے، معمولی چوٹیں ہیں۔ کل تک ٹھیک ہو جائے گا۔"

شیخ مظہر علی کے جسم میں واضح طور پر تھرتھراہٹ نظر آئی "اور وہ گاڑی۔"

"وہ نہیں رکی صاحب، میرا خیال ہے، بریک فیل ہو گئے تھے اس کے۔"

شیخ صاحب تصور میں کرم دین کا بیان کیا ہوا پورا منظر دیکھ رہے تھے "واقعی، اللہ نے بڑا کرم کیا۔ اس لڑکے کے لیے کچھ کرنا چاہیے۔" ان کا انداز خود کلامی کا سا تھا۔

"صاحب جی، بعد میں پتا چلا کہ یہ اپنے ایبٹ آباد ہی کا ہے۔ اس کے باپ کو میں جانتا ہوں برسوں سے۔"

"ہم...." شیخ صاحب نے پرخیال لہجے میں کہا "تو پھر کیا ہونا چاہیے۔"

"صاحب جی! آپ ایک ڈرائیور رکھنے کو کہہ رہے تھے۔" کرم دین نے یاد دلایا۔

شیخ صاحب نے سعدیہ سے اس کے لئے کار خریدنے کا وعدہ کیا تھا لیکن وہ کم از کم فی الحال یہ نہیں چاہتے تھے کہ سعدیہ ڈرائیو کرے اس لئے ڈرائیور کی ضرورت تھی۔ ڈرائیور رکھے بغیر وہ کار نہیں خریدنا چاہتے تھے اور یہ ان کی فطرت تھی کہ اعتبار بہت دیکھ پرکھ کر کرتے تھے اور جب کرتے تو اندھا اعتبار کرتے تھے۔

"تمہارا مطلب ہے کہ یہ لڑکا ڈرائیونگ جانتا ہے۔"

"ہزارے میں تو بچپن میں ہی ڈرائیونگ آ جاتی ہے صاحب!" کرم دین نے فخریہ لہجے میں کہا۔

شیخ صاحب چند لمحے سوچتے رہے "نہیں، ابھی یہ مناسب نہیں۔" انہوں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا "یہ بتاؤ کہ یہ کام کیا کرتا ہے؟"

"رنگ و روغن کا بہت اچھا کاریگر ہے صاحب۔"

"اور تم اسے ڈرائیور بنانا چاہتے ہو!" شیخ صاحب کے لہجے میں ملامت تھی "خیر اسے جانے نہ دینا۔ ہر طرح سے اس کا خیال رکھنا۔ کل ڈاکٹر کو بھی بلا لانا۔ اگر وہ ٹھیک ہو گیا ہو تو کل شام اسے میرے پاس لے آنا۔ میں جلدی گھر آ جاؤں گا۔ دیکھیں گے کچھ۔" شیخ صاحب اٹھ کھڑے ہوئے "اب تم آرام کرو۔"

☆

اگلی صبح ناشتے کی میز پر شیخ صاحب نتھے اظہر سے ملے۔ انہوں نے اظہر سے بھی حادثے کی روداد سنی۔ ''بس پاپا، گاڑی ہم پر چڑھنے والی تھی کہ انہوں نے ہمیں دھکا دے دیا۔'' اظہر نے جو نقشہ کھینچا وہ اور خوف ناک تھا۔

شیخ صاحب نے ملامت بھری نظروں سے بیوی کو دیکھا ''اور آپ نے فون پر مجھے یہ بتانا ضروری بھی نہیں سمجھا!''

''کوئی ایسی خاص بات نہیں تھی۔ کچھ بھی تو نہیں ہوا تھا۔'' رخسانہ بیگم نے بے پروائی سے کہا۔

''جب تک کوئی مر نہ جائے، آپ کے خیال میں حادثہ سنگین نہیں ہوتا!'' شیخ صاحب نے سرد لہجے میں کہا ''یہ تو بڑی خطرناک بات ہے اللہ کو ناراض کرنے والی۔''

''ارے یہ لوگ بڑھا چڑھا کر سنا رہے ہیں۔''

''چلیے ٹھیک ہے۔'' شیخ صاحب نے کہا۔ پھر چند لمحے کے توقف کے بعد بولے ''میں بہت دنوں سے دیکھ رہا ہوں کہ اس گھر کو رنگ و روغن کی ضرورت ہے۔''

''صاف کیوں نہیں کہتے کہ اب فٹ پاتھ پر بیٹھنے والے اس رنگ ساز کا احسان چکائیں گے!'' رخسانہ بیگم نے تڑسے کہا۔

''تو احسان ماننا کوئی بری بات ہے۔''

''احسان کیسا! ٹھیک ٹھاک ہے وہ، ماتھے پر ذرا سی خراش آئی ہے بس۔''

''پھر وہی بات۔ وہ مر جاتا یا اپاہج ہو جاتا، تب آپ اس کا احسان مانتیں!'' شیخ صاحب نے گہری سانس لے کر کہا ''یہ بھی سن لیجیے کہ یہ کوئی احسان کا صلہ نہیں ہوگا۔ وہ کام کرے گا اور اجرت لے گا۔ احسان تو عمر بھر نہیں اتارا جا سکتا۔ یہ سب چھوٹے پن کی باتیں ہیں۔''

''کرتے رہیں جو جی میں آئے۔ مجھے بتانے کی ضرورت نہیں۔ میرے خیال میں چھوٹے لوگوں کو ذرا سی بات پر سر پر بٹھا لینا چھوٹا پن ہے، جسے آپ بڑائی سمجھتے ہیں۔'' رخسانہ بیگم نے پاؤں پٹختے ہوئے کہا اور ناشتے کی میز سے اٹھ گئیں۔

شیخ صاحب نے بات کو بڑھانا مناسب نہیں سمجھا۔ جانتے تھے کہ اس سے تلخی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا۔

☆

ناشتے کے بعد کرم دین ڈاکٹر کو بلا لایا۔ ڈاکٹر نے اچھی طرح معائنہ کر کے کہا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں۔ دن میں تین بار مرہم لگایا جائے۔ پیشانی کا زخم دو تین دن میں ٹھیک ہو جائے گا۔

''چاچا، اب میں چلتا ہوں۔'' ڈاکٹر کے جانے کے بعد الٰہی بخش نے کہا۔

''نہ بیٹے! صاحب جی سے ملے بغیر تو نہیں جا سکتا۔''

''وہ تو کل رات ہی تجھ سے ملنے آئے تھے۔ تو سو رہا تھا، تجھے دیکھا اور چلے گئے۔'' الٰہی بخش کے دل میں ان دیکھے شیخ صاحب کے لئے قدر و منزلت کا جذبہ پیدا ہوا ''اچھا..... تو مجھے جگا لیا ہوتا۔''

''انہوں نے جگانے نہیں دیا۔ آج شام وہ تجھ سے ملیں گے۔''

''ٹھیک ہے چاچا، پر ابھی مجھے باہر جانا ہے۔'' الٰہی بخش نے کہا ''ایک گھنٹے میں واپس آ جاؤں گا۔''

کرم دین نے بے اعتباری سے اسے دیکھا ''دیکھ تو ملے بغیر چلا گیا تو میری بڑی بے عزتی ہوگی۔''

''ارے چاچا تم میرے لئے ابا جیسے ہو، میں تمہاری بے عزتی کرا سکتا ہوں؟'' الٰہی بخش نے مسکراتے ہوئے کہا ''وہ جن لوگوں کے ساتھ میں رہتا ہوں کل سے میرے لئے پریشان ہو رہے ہوں گے۔ انہیں جا کر بتا تو آؤں کہ میری فکر نہ کریں۔ میں خیریت سے ہوں۔''

''تو چل جا۔ پر دوپہر کا کھانا میرے ساتھ کھانا ہے۔'' کرم دین نے کہا۔

الٰہی بخش کو نہیں معلوم تھا کہ اس کے ساتھ رہنے والے کہاں کہاں کام کرتے ہیں۔ اس نے سوچا، جا کر نثار کو بتا دے گا۔ کرامت اس کے پاس آتا رہتا ہے۔ نثار اسے بتا دے گا۔ وہ فٹ پاتھ پر پہنچا تو پتا چلا کہ اس کے متعلق باتیں ہو رہی ہیں۔ سب پریشان تھے۔ کرامت بھی آیا ہوا تھا۔ اب اسے خیال آیا کہ وہ تو گزشتہ روز دوپہر کا کھانا کھانے کے لئے نکلا تھا اور اس کے بعد واپس ہی نہیں گیا۔ وہ لوگ تو کل سے اس کے لئے پریشان تھے۔ اسے ڈھونڈتے بھی پھرتے تھے۔ پھر نثار نے اس کے برش اور پینٹ کے خالی ڈبے سامنے پان والے کی دکان پر رکھ دیئے تھے۔ وہ سب الٰہی بخش کو گھیر کر بیٹھ گئے۔ الٰہی بخش نے انہیں ماجرا سنایا۔ کرامت مطمئن ہو کر چلا گیا۔

''بات تو جب ہے کہ تجھے اس بنگلے میں نوکری مل جائے۔'' نثار نے کہا۔

''کیسی باتیں کرتے ہو نثار بھائی!'' الٰہی بخش بولا ''میں یہ فٹ پاتھ نہیں چھوڑنا چاہتا۔''

''بے وقوف نہیں تو، ابے یہ بھی کوئی زندگی ہے۔ پگار کی بات ہی اور ہے۔ ایک تاریخ کو لگی بندھی رقم ہاتھ میں۔ یہاں کیا ہے۔ ایک دن کام مل گیا تو چار دن چھٹی اور ایک دن فاقہ!''

''نہیں نثار بھائی۔ یہ فٹ پاتھ کی زندگی بڑی رومینٹک ہے۔'' الٰہی بخش نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا ''کسی کو یہ زندگی بڑی رومینٹک لگتی ہے۔''

نثار کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ ''تو کتابیں بہت پڑھنے لگا ہے۔'' اس نے الٰہی بخش پر آنکھیں نکالیں۔

وہ ادھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ پھر الٰہی بخش بنگلے کی طرف چل دیا۔ وہاں کرم دین باغیچے میں کیاریاں ٹھیک کر رہا تھا۔ اس نے اسے اپنے ہی پاس بلا لیا۔ ''بتا آیا اپنے ساتھیوں کو۔''

''ہاں چاچا۔''

''دیکھ، مجھے لگتا ہے کہ اب تو اس گھر سے نہیں جائے گا۔''

''کیا بات کرتے ہو چاچا!''

''میرا اندازہ تو یہی ہے بیٹے۔''

''اتنے میں سادی گیٹ سے اندر آئی۔ وہ کالج سے واپس آئی تھی اور کالج کی سفید یونیفارم میں بہت پیاری لگ رہی تھی۔ انہیں بیٹھے دیکھ کر وہ

ان کی طرف چلی آئی "کیسے ہو الٰہی بخش۔" اس نے پوچھا۔ "تکلیف بڑھی تو نہیں؟"

الٰہی بخش کو احساس ہوا کہ وہ اسے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا ہے۔ اس نے گھبرا کر نظریں جھکا لیں "میں بالکل ٹھیک ہوں بی بی، ابھی باہر بھی گیا تھا۔"

"بہت اچھی بات ہے۔ مجھے تمہاری بڑی فکر تھی۔" ساوی نے سادگی سے کہا۔ پھر بولی "میرا نام سعدیہ ہے۔ سب ساوی کہتے ہیں مجھے۔"

"مجھے معلوم ہے بی بی۔" الٰہی بخش نے کہا۔ اسے اپنا دل ڈھول کی طرح بجتا محسوس ہو رہا تھا۔ جس کی آواز سب کو سنائی دے رہی ہو۔ کیسی بات تھی یہ! وہ کہہ رہی تھی کہ اسے اس کی فکر ہے! وہ اسے دعوت دے رہی تھی کہ وہ سعدیہ یا ساوی کہہ کر اسے پکارے۔ اُسے کسی خوش فہمی میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں! اس نے اپنے دل کو ٹوکا۔

"تو پھر ایسے ہی پکارا کرو مجھے۔"

الٰہی بخش کہنا چاہتا تھا کہ وہ تو ایک ایسا پنچھی ہے جو سفر کے دوران تھک کر پل دو پل کے لئے اس شاخ پر بیٹھ گیا ہے اور اب اسے اڑ جانا ہے۔ یہاں یہ مسئلہ ہی کب ہے کہ اسے کیسے پکارا جائے لیکن اس نے کہا کچھ نہیں۔

ساوی کچھ اور کہنا چاہتی تھی کہ صدر دروازے سے اسے امی نے آواز دے لی۔

"سعدیہ۔۔۔ کالج سے آ گئی ہو تم۔"

"جی امی، ابھی آئی ہوں۔" ساوی نے کہا اور الٰہی بخش سے مزید کچھ کہے بغیر اس طرف چل دی۔

ساوی بی بی بہت اچھی ہیں۔" کرم دین نے کہا۔

الٰہی بخش نے اس پر بھی کچھ نہیں کہا۔ وہ یہ سوچ رہا تھا کہ کیا کرم دین کے اس جملے کو ہزار گنا بہتر بنانے والے لفظ بھی وضع کیے گئے ہیں۔ کیا یہ بیان کیا جا سکتا ہے کہ ساوی بی بی کتنی اچھی ہیں!

☆

اس روز شیخ صاحب ساڑھے پانچ بجے گھر آ گئے۔ باتھ روم سے آ کے لباس تبدیل کر کے اور چائے پینے کے بعد تازہ دم ہو کے انہوں نے کرمو کو بلوایا۔ "کرمو اس الٰہی بخش کو میرے پاس لے آؤ۔" انہوں نے کہا "ہاں تم اسے یہاں چھوڑ کر چلے جانا۔"

"جی بہتر صاحب جی۔"

شیخ صاحب اس وقت ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ تھوڑی دیر بعد کرمو، الٰہی بخش کو وہاں لے آیا۔ شیخ صاحب نے اٹھ کر بڑے تپاک سے الٰہی بخش سے مصافحہ کیا۔ "آؤ بیٹے، یہاں بیٹھو، میرے پاس۔" انہوں نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

کرم دین نے پوچھا "میں جاؤں صاحب۔"

"ہاں تم جاؤ۔" شیخ صاحب نے کہا اور پھر الٰہی بخش کی طرف متوجہ ہوئے "تم بیٹھے نہیں ابھی تک۔"

الٰہی بخش نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "میں یہیں ٹھیک ہوں صاحب!" وہ کمرے کی آرائش سے مرعوب ہو گیا تھا۔ ایسی آرائش تو اس فلیٹ کی بھی نہیں تھی جہاں وہ اس دن مزدوروں کی ٹولی کے ساتھ گیا تھا، جبکہ وہ بھی مرعوب کر دینے والی تھی۔

"نہیں بھئی۔ بیٹھ جاؤ آرام سے۔" شیخ صاحب نے زور دے کر کہا "دیکھو، زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے مگر اللہ کسی کے وسیلے سے احسان کرتا ہے تو اس وسیلے کا احترام بھی ضروری ہے۔ اصل میں وہ احترام بھی اللہ ہی کے لئے ہے۔ تم بیٹھ جاؤ۔ مجھے تم سے مل کر خوشی ہو رہی ہے۔ اللہ نے تمہارے ذریعے میرے بیٹے کو اور کرمو کو نئی زندگی دی۔ جواب میں، میں کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ تمہیں تھوڑی دیر عزت تو دے سکتا ہوں۔" انہوں نے تھوڑی دیر پر خاص طور پر زور دیا۔

الٰہی بخش کی جھجک دور ہو گئی۔ اسے شیخ صاحب اچھے لگے۔ وہ مختلف انداز میں بات کر رہے تھے۔ انہوں نے رسماً بھی اس کے احسان پر زور دے کر اسے شرمندہ نہیں کیا تھا۔ وہ ان کے سامنے صوفے پر بیٹھ گیا۔ بیٹھ کیا گیا، دھنس گیا کہئے، اور جتنی تیزی سے وہ دھنسا تھا، وہ ڈر گیا لیکن پھر اسے آرام کا احساس ہونے لگا۔

"یہ بتاؤ، کیا پیو گے۔ شربت یا چائے؟" شیخ صاحب نے پوچھا۔

"کچھ۔ کچھ بھی نہیں صاحب جی۔" الٰہی بخش نے گڑبڑا کر کہا۔

"دیکھو الٰہی بخش، تم بات سمجھ نہیں رہے ہو۔" شیخ صاحب نے ناصحانہ انداز میں کہا "تم اس وقت میرے مہمان کی حیثیت سے یہاں بیٹھے ہو اور مہمان میزبان سے برتر ہوتا ہے۔ تم جہاں کے ہو، وہاں تو مہمان نوازی ہمارے ہاں سے بڑھ کر کی جاتی ہے اور یہ اللہ کا حکم بھی ہے۔ یہ ذہن میں رکھو کہ تم میرے مہمان ہو، ملازم نہیں ہو۔" اس بار انہوں نے ملازم پر بطور خاص زور دیا۔ "اب بولو، کیا پیو گے؟"

"چائے پی لوں گا صاحب جی۔"

شیخ صاحب نے جمیلہ کو آواز دے کر چائے لانے کو کہا۔ پھر الٰہی بخش سے بولے "یہ صاحب جی کیا ہوتا ہے۔ میرا نام شیخ علی ہے۔ صاحب تو بس میرے گھر کے ملازم ہی کہتے ہیں مجھے۔"

الٰہی بخش کے کانوں میں ساوی کی آواز گونجی۔ 'میرا نام سعدیہ ہے۔ سب لوگ ساوی کہتے ہیں مجھے۔'

جمیلہ چائے لے آئی۔ الٰہی بخش جلد از جلد پیالی خالی کرنے کی کوشش میں مصروف ہو گیا۔

"اب تم کیسے ہو؟" شیخ صاحب نے پوچھا۔

"جی۔" ساوی کے تصور میں الجھے ہوئے الٰہی بخش کی سمجھ میں پہلے تو بات ہی نہیں آئی پھر اس نے کہا "اب میں بالکل ٹھیک ہوں اور اب میں جانا چاہتا ہوں۔"

"میں تو چاہتا تھا کہ تم ہمیں چند روز میزبانی کا موقع دو۔ لیکن زبردستی اچھی چیز نہیں ہوتی۔ ہو سکتا ہے، تمہارے کام کا حرج ہو رہا ہو۔ ٹھیک ہے،

تم آج ہی چلے جانا،لیکن پہلے کچھ دیر اپنے بارے میں باتیں کرو مجھ سے۔"

الٰہی بخش یک لخت پرسکون ہو گیا۔شیخ صاحب عجیب آدمی تھے۔رسمی باتوں کا سرسری تذکرہ کرتے تھے۔ان کے ساتھ بیٹھ کر بندھے ہونے کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔شیخ صاحب اس سے اسکے بارے میں پوچھتے رہے۔اس کے ماں باپ،گھر بار،تعلیم،کام ۔۔۔ انہوں نے سبھی کچھ پوچھ ڈالا۔

تھوڑی دیر بعد الٰہی بخش نے کہا "سر ۔۔۔ اب مجھے اجازت دیجئے۔"

"ہاں ۔۔۔ ٹھیک ہے۔" شیخ صاحب نے اٹھ کر اس سے گرم جوشی سے مصافحہ کیا "دیکھو میاں، اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے تو تمہیں فرشتہ رحمت بنا کر بھیجا ہے لیکن میں ہر وقت احسان کی رٹ لگانے کا قائل نہیں۔ہاں،ایک بات پوری سچائی سے کہہ رہا ہوں۔اس گھر کو ہمیشہ اپنا ہی گھر سمجھنا۔جب ملنے کو جی چاہے،چلے آنا۔کبھی کسی وقت،کل یا اس سے بیس سال بعد،میں تمہارے کسی کام آسکوں تو اپنا بزرگ سمجھ کر بلا تکلف میرے پاس چلے آنا۔میں انشاءاللہ تمہیں ہمیشہ یاد رکھوں گا۔"

الٰہی بخش کو اپنا دل پگھلتا محسوس ہوا۔کیسے اچھے آدمی ہیں یہ شیخ صاحب احسان احسان کر کے اسے شرمندہ بھی نہیں کیا اور اتنا کچھ کہہ بھی دیا۔انہیں عزت دینا اور عزت کرانا آتا ہے۔"شکریہ سر،میں یاد رکھوں گا۔"

الٰہی بخش دروازے پر پہنچا تھا کہ شیخ صاحب کی آواز پر اس کے قدم ٹھٹک گئے "الٰہی بخش،ذرا سنو تو۔"

اس نے پلٹ کر سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا "جی سر؟"

"یہاں آؤ،پانچ منٹ اور بیٹھو۔"

الٰہی بخش جا کر صوفے پر بیٹھ گیا۔

"بھئی ۔۔۔ معاف کرنا۔میں نے تمہاری بات توجہ سے نہیں سنی تھی۔تم پینٹر ہو نا۔"

الٰہی بخش نے اثبات میں سر ہلایا "جی سر۔"

"جو کچھ میں نے تم سے کہا،وہ اپنی جگہ۔میں اپنی بات مکمل بھی کر چکا ہوں۔مجھے اچانک خیال آیا ہے کہ ایک کاروباری بات تم سے کر لی جائے۔"

'کاروباری بات۔اور مجھ سے۔' الٰہی بخش نے حیرت سے سوچا۔

"میں کچھ مہینے سے سوچ رہا ہوں کہ پورے گھر کو دوبارہ پینٹ کرانا ہے۔" شیخ صاحب کہہ رہے تھے "اب تم نعمت کی طرح آگئے ہو تو کیوں نہ تم سے کچھ فائدہ ہی اٹھا لوں۔"

الٰہی بخش،شیخ صاحب کے فہم و فراست کا قائل ہو گیا۔اصولاً اسے جواب میں کہنا چاہئے تھا کہ جو کچھ میں نے کیا،وہ خدا کی مرضی کے تحت سرزرد ہوا۔انہیں احسان سمجھ کر اس کا صلہ دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔لیکن اس کے سامنے وہ شخص بیٹھا تھا جس نے ابتدا میں ہی کہہ دیا تھا کہ احسان اللہ کا ہے البتہ وسیلے کی حیثیت سے اس کا احترام کیا جا رہا ہے اور اب وہ کہہ رہا تھا کہ وہ پینٹر ہے تو اس سے فائدہ ہی کیوں نہ اٹھا لے۔ایسے شخص سے ایسی بات کیسے کی جا سکتی ہے!

"ذرا اس ڈرائنگ روم کی دیواریں دیکھو اور انصاف سے کہو کہ یہ موجودہ پینٹ کیا اس کے شایان شان ہے۔رنگ روغن ہونے کے بعد یہ کیسا لگے گا؟" شیخ صاحب نے جیسے اس کے خیالات پڑھ لئے۔ایک بار پھر انہوں نے اپنے فہم و فراست کا ثبوت دیا تھا۔

الٰہی بخش نے ڈرائنگ روم کی دیواروں کا جائزہ لیا۔شیخ صاحب کی شرط تھی کہ اسے جواب انصاف سے دینا ہے۔وہ ٹال نہیں سکتا تھا،چنانچہ اس نے انصاف سے کہا "آپ درست فرماتے ہیں سر،دیواروں کو واقعی تازہ پینٹ کی ضرورت ہے۔"

"تو چلو میں تمہیں پورا گھر دکھا دوں۔"

الٰہی بخش نے گھر دیکھا۔سب سے بڑی بات یہ کہ اس نے سادی کا کمرہ بھی دیکھ لیا۔کمرے کی سادگی اور خوب صورتی نے اسے بہت متاثر کیا۔ اس نے بڑی چاہت سے کمرے کا چپہ چپہ دیکھا، جیسے وہ زیارت کے قابل کوئی متبرک مقام ہو۔

شیخ صاحب اسے پھر نیچے لے آئے ''اب اپنی اُجرت بتاؤ'' وہ بولے ''الٰہی بخش ہچکچایا تو انہوں نے کہا'' دیکھو یہ کاروباری بات ہے، ہمارے تعلقات سے الگ۔''انہوں نے تعلقات پر زور دیتے ہوئے کہا''اس میں نہ شرماؤ، نہ میں تمہیں اجرت زیادہ دوں گا، نہ کم۔ جو حق ہے، وہ لو گے؟''

''آپ ٹھیکے پر دیں گے یا دہاڑی پر کرائیں گے؟'' الٰہی بخش، رنگساز الٰہی بخش بن گیا۔

''دہاڑی پر۔'' شیخ صاحب بلا جھجک کہا۔

''دہاڑی پچیس روپے روز ہو گی۔میٹریل آپ کا۔''

شیخ صاحب نے کچھ نوٹ نکال کر اسے دیئے ''یہ ہزار روپے ہیں۔ پینٹ اور دوسری چیزیں تم ہی لاؤ گے۔آخر میں حساب دے دینا اور ضرورت پڑے تو بیگم صاحب سے لے لینا۔''

''کلر آپ پسند کر لیں سر، میں کارڈ لا کر دکھاتا ہوں آپ کو۔''

''اس کی ضرورت نہیں۔ مجھے رنگوں کی تمیز نہیں۔تم خود رنگ پسند کر لینا۔میں اسے رنگ کرنے والے کی ذمے داری سمجھتا ہوں۔پچھلی بار بھی میں نے یہ کام پینٹر کے سپرد کیا تھا لیکن اس نے مجھے مایوس کیا۔امید ہے، تم مجھے خوش کر دو گے۔''

''ذمے دار، بہت بڑی ہے سر۔لیکن مجھے یقین ہے کہ آپ کو خوش کر دوں گا۔'' الٰہی بخش نے اعتماد سے کہا۔

''بس تو جاؤ اور کل سے کام شروع کر دو۔''

الٰہی بخش جانے لگا تو شیخ صاحب نے اسے آواز دی۔ سنو، اگر کوئی حرج نہ سمجھو تو مجھے اپنی پیشانی کے اس زخم کے بارے میں بتاؤ۔''

الٰہی بخش سوچ میں پڑ گیا۔کیا بتائے اس زخم کے بارے میں۔اسے تمغۂ دیانت کہے یا نشانِ عشق۔''آپ کا کام پورا کرنے کے بعد بتاؤں گا سر۔'' کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے کہا ''بشرطیکہ آپ اس وقت بھی جاننا چاہیں۔''

ٹھیک ہے الٰہی بخش۔میں انتظار کروں گا۔''

☆

بارہ دن بعد پورا بنگلہ یوں جگمگا رہا تھا جیسے ابھی تعمیر ہوا ہو۔ الٰہی بخش نے اپنے رنگوں کے انتخاب سے ثابت کر دیا تھا کہ رنگ ساز بھی فنکار ہوتے ہیں۔ شیخ صاحب بہت خوش تھے۔ الٰہی بخش ان کی آزمائش پر پورا اترا تھا۔ اس نے ان کے اندازے کی تائید کر دی تھی۔

شیخ صاحب میں انسان کو ایک نظر سے پہچان لینے کی قدرتی صلاحیت تھی۔ لیکن انہوں نے اس پہلی نظر کے فیصلے پر کبھی اعتبار نہیں کیا تھا۔ اعتبار وہ آزمائش کے بغیر کبھی نہیں کرتے تھے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ الٰہی بخش آزمائش سے گزرنے کے دوران ہی قابل اعتبار ثابت ہو گیا تھا۔

بظاہر شیخ صاحب نے کرم دین کی تجویز مسترد کر دی تھی کہ الٰہی بخش کو ڈرائیور رکھ لیا جائے۔ لیکن درحقیقت انہوں نے اسے الٰہی بخش کی آزمائش سے مشروط کر دیا تھا۔ بنگلے کا رنگ و روغن کا ٹھیکہ ہی اس کی آزمائش تھا۔

الٰہی بخش کام شروع کر چکا تھا۔ ایک دن شیخ صاحب نے اپنے ایک دوست سے جو قریب ہی رہتے تھے، اس سلسلے میں بات کی، یہ وکیل صاحب، یہاں اچھا رنگ روغن کرنے والے ہی نہیں ملتے۔" انہوں نے کہا۔

یہ وہی وکیل صاحب تھے جن کے ہاں الٰہی بخش دو بار کام کر چکا تھا "بات تو سچ ہے شیخ صاحب۔ لیکن مجھے قسمت سے بہت اچھا کاریگر مل گیا تھا۔ وہ کینٹ لبرٹی کے سامنے فٹ پاتھ پر بیٹھتا ہے۔ الٰہی بخش نام ہے اس کا۔"

شیخ صاحب نے اپنے تاثرات کو چھپانے کی بھرپور کوشش کی "بھائی قسمت سے اچھا کاریگر مل جائے تو وہ ویسے کھال کھینچ لیتا ہے۔۔۔ دہاڑی پر کام کراؤ تو کام لمبا کر دیتے ہیں۔ ٹھیکے پر دو تو حساب گھپلا کر دیتے ہیں۔"

الٰہی بخش کا یہی تو کمال ہے۔" وکیل صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا "اتنا ایماندار آدمی میں نے کہیں نہیں دیکھا۔ ٹھیکے پر کام کرنے والا مزدور جتنا کام ڈیڑھ دن میں کرتا ہے، الٰہی بخش ایک دن کی دہاڑی میں کرتا ہے۔"

"یقین نہیں آتا۔"

"میں خود دو بار اس سے کام کرا چکا ہوں۔"

اس کے بعد شیخ صاحب نے خود مشاہدہ کیا۔ الٰہی بخش صبح نو بجے کام شروع کرتا تھا۔ چھ بجے وہ کام روک دیتا تھا۔ یہ معمول کے مطابق تھا لیکن اس کے کام کی رفتار بہت تیز تھی اور اس کے کام میں غیر معمولی ۔۔۔ بلکہ فنکارانہ صفائی تھی۔

بارھویں دن وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ الٰہی بخش صاحب کو حساب دے رہا تھا "پینٹ کے ڈبے کی یہ قیمت تو نہیں۔" شیخ صاحب نے اعتراض کیا!

الٰہی بخش کے چہرے کی رنگت متغیر ہو گئی "اس سے کم قیمت میں مجھے تو نہیں مل سکتا سر۔"

شیخ صاحب اعتماد سے مسکرائے۔ انہوں نے اپنا ہوم ورک بہت اچھی طرح کیا تھا "میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں۔" انہوں نے کہا "میری معلومات کے مطابق ڈبا ایک سو دس روپے کا ملتا ہے۔ تم نے اٹھانوے روپے کا کیسے لے لیا۔"

اب کے الٰہی بخش بھی مسکرایا "دکان والے مجھے جانتے ہیں۔ میں ہمیشہ وہیں سے لیتا ہوں۔ وہ مجھے کنسیشن دیتے ہیں۔"

شیخ صاحب بہت خوش ہوئے۔ عام طور پر کاریگر زیادہ رقم کی رسید بنواتے تھے اور پیسہ بچاتے تھے۔ انہوں نے حساب لگایا تو پتا چلا کہ الٰہی بخش نے ان کو کم از کم ڈیڑھ سو روپے کی بچت کرائی ہے۔ انہوں نے اسے اس کی اجرت دی۔ سو روپے انعام کے طور پر دیئے پھر بولے "دیکھو الٰہی بخش، میں بزنس مین ہوں۔ نقصان کا سودا کبھی نہیں کرتا۔ ایماندار آدمی کو اپنا بنانے کی کوشش کرتا ہوں، اس لئے کہ اس میں بھی میرا اپنا ہی فائدہ ہے۔ میری بات غور سے سنو۔ میں چاہتا ہوں کہ تم میرے لئے کام کرو۔"

الٰہی بخش ہنسنے لگا "رنگ و روغن کا کام کرنے والے کو ملازم رکھ کر آپ کو کیا فائدہ ہو گا سر۔"

"میں تمہیں اس حیثیت میں ملازمت کی پیشکش تو نہیں کر رہا ہوں۔ تمہیں ڈرائیونگ آتی ہے۔"

"جی سر۔"

''تو بس میں تمہیں ڈرائیور رکھنا چاہتا ہوں۔'' شیخ صاحب نے کہا۔ سعدیہ کے لئے گاڑی انہوں نے دو دن پہلے خریدی تھی۔

''مجھ پر تو یہ احسان ہوگا سر۔''

''مگر فائدہ زیادہ مجھے ہوگا۔ خیر میں تمہیں نو سو روپے تنخواہ دوں گا۔ رہنے کے لئے کوارٹر، کھانا گھر سے ہی ملے گا۔ تم صرف سعدیہ کی گاڑی ڈرائیو کرو گے۔ بولو منظور ہے؟''

الٰہی بخش کیا بولتا۔ وہ تو گنگ ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ اور سادی کی گاڑی! وہ اسے ہر جگہ لے جایا اور لایا کرے گا! اتنی قربت..... اتنا بڑا اعزاز! یہ تو اس کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا۔ یہ قسمت میرے ساتھ کیا کھیل رہی ہے۔ کہاں پہنچا دیا ہے مجھے۔ اور کہاں تک لے جایا جائے گا۔ مگر پھر اسے خیال آیا کہ وہ ناشکرا پن کر رہا ہے۔ اسے تو اس کی توقع سے، بہت زیادہ مل رہا ہے۔

اس کی خاموشی سے شیخ صاحب نے یہ نتیجہ نکالا کہ اسے تنخواہ پر اعتراض ہے ''دیکھو میاں، پچیس روپے روز کے حساب سے تمہیں مہینہ بھر بھی کام ملے تو ساڑھے سات سو روپے ملیں گے۔ میں تمہیں نو سو روپے دے رہا ہوں۔ اس سے زیادہ نہیں دے سکتا۔''

''آپ غلط سمجھ رہے ہیں سر! یہ تنخواہ تو میری سوچ سے بھی زیادہ ہے۔''

''بس تو ٹھیک ہے۔ کل مجھے ٹرائی دے دو اور کام شروع کر دو۔''

''ٹھیک یو سر۔''

''جاؤ کرمو تمہیں تمہارا کوارٹر دکھا دے گا۔ وہاں ضرورت کی ہر چیز موجود ہے۔''

الٰہی بخش اٹھنے لگا تو شیخ صاحب نے کہا ''ذرا ٹھہرو۔ تمہیں یاد ہے، تم نے مجھ سے ایک وعدہ کیا تھا۔''

''سر..... مجھے یاد نہیں۔''

''میں یاد دلاتا ہوں۔ وہ وعدہ تمہاری پیشانی کے زخم کے متعلق تھا۔''

''اوہ..... وہ''..... الٰہی بخش ہچکچایا۔

''بتانا نہیں چاہتے تو میں زور نہیں دوں گا۔''

''نہیں سر، ایسی کوئی بات نہیں۔ میں ایسا وعدہ کبھی نہیں کرتا جو پورا نہ کر سکوں۔ مگر آپ کا وقت ضائع ہوگا۔''

''تم سناؤ۔''

''یہ ایمانداری کا صلہ ہے یا عشق کا حاصل، آپ خود ہی اس کا فیصلہ کر لیجئے گا۔'' الٰہی بخش نے کہا اور کچھ سوچنے لگا۔ اس کی آنکھیں کہیں دور دیکھتی محسوس ہو رہی تھیں۔ وہ برسوں پیچھے چلا گیا تھا۔ اس نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہنا شروع کیا۔

☆

ان دنوں الٰہی بخش فوجیوں کی بیرکس میں رنگ و روغن کا کام کر رہا تھا۔ اس کے علاوہ بھی کئی کاریگر تھے۔ وہ بھی اس سے شاکی تھے۔ جبکہ فوجی خوش رہتے تھے۔ ان کے نزدیک وہ ایک مثالی مزدور تھا۔ اس متضاد رویے کی وجہ مشترک تھی۔

الٰہی بخش کم سخن اور کم آمیز تھا۔ کام کے وقت میں وہ صرف کام کرتا تھا۔ یہ نہیں کہ کبھی چائے پینے میں لگ گیا یا کبھی سگریٹ سلگا لی۔ وہ دوسرے مزدوروں کی طرح گپ شپ میں بھی نہیں لگتا تھا۔ پھر اس کے کام کی رفتار بھی اپنے ساتھیوں سے زیادہ تھی۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ دوسروں سے دگنا کام کرتا تھا۔ اس بنا پر فوجی عزت کرتے تھے۔ وہ دوسرے مزدوروں کو لعن طعن کرتے تھے کہ وہ الٰہی بخش کی طرح کیوں کام نہیں کرتے۔ کئی بار مزدوروں کو تنبیہ کی جا چکی تھی کہ انہوں نے اپنی کارکردگی نہیں بڑھائی تو انہیں نکال دیا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ اس پر ساتھی کاریگر اس سے خفا تھے۔

ایک دن کھانے کے وقفے میں ساتھیوں نے اسے گھیر لیا "او بھائی الٰہی بخش تو اتنا کام کیوں کرتا ہے؟" ایک نے کہا۔

یہ سوال ہی الٰہی بخش کی سمجھ سے باہر تھا۔ اس نے کہا۔ "تو کیا کام نہ کیا کروں۔"

"کام کر لیکن ہماری طرح۔ ہم بھی تو کام کرتے ہیں۔"

"بھائی تمہاری میری رفتار میں فرق ہے۔ بس اتنی سی بات ہے۔"

"تیرے لئے، اتنی سی بات ہے۔" ایک اور کاریگر بولا "لیکن اس کی وجہ سے ہم پر تو مصیبت آئی رہتی ہے۔"

"تو میں کیا کروں؟" الٰہی بخش نے بے بسی سے کہا۔

"اپنی رفتار کو ہمارے برابر لے آ۔" تیسرے نے مشورہ دیا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" الٰہی بخش نے حیرت سے پوچھا۔

"او یار، اتنی سی بات سمجھ میں نہیں آتی۔" پہلے نے جھنجھلا کر کہا۔ "تھوڑی تھوڑی دیر میں گپ شپ کر لیا کر کسی سے۔"

"پیسے مجھے گپ شپ کرنے کے نہیں کام کرنے کے ملتے ہیں۔"

"ہمیں بھی معلوم ہے۔ پر اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔"

"تمہیں نہیں پڑتا ہوگا۔" الٰہی بخش نے درشت لہجے میں کہا "میں حلال کی کھانا چاہتا ہوں۔"

"تو کیا ہم حرام کی کھاتے ہیں۔" ایک کاریگر آپے سے باہر ہونے لگا۔

"یہ تو مجھے نہیں معلوم۔ نہ مجھے اس کی فکر ہے۔" الٰہی بخش نے باپ کا سمجھایا ہوا دہرایا۔ "میں صرف اپنی فکر کرتا ہوں۔"

"دیکھ بھائی، مان جا۔" ایک اور کاریگر نے بڑے تحمل سے کہا "تیری وجہ سے ہم ذلیل ہوتے ہیں۔" ہماری روزی کھوٹی بھی ہو سکتی ہے۔"

"کیا میں تمہاری وجہ سے اپنی عاقبت خراب کر لوں۔" الٰہی بخش نے کرخت لہجے میں کہا "یہ نہیں ہو سکتا۔"

سب کاریگر اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ "دیکھ الٰہی بخش دریا میں رہ کر مگرمچھ سے دشمنی نہیں لیتے۔" ایک جوشیلے مزدور نے تنبیہ کی۔

"بات سنو، میں انچارج صاحب کو سمجھا دوں گا کہ تمہاری میری رفتار میں فرق ہے۔ اسے مسئلہ نہ بنائیں ورنہ میں کام ہی چھوڑ دوں گا۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کر سکتا۔ مجھے میرے باپ نے ہمیشہ رزق حلال کمانے کی تاکید کی ہے۔"

اس پر سبھی کاریگر بوکھلا گئے۔ جانتے تھے کہ انچارج سمجھ جائے گا کہ وہ لوگ الٰہی بخش کو تنگ کر رہے ہیں۔ ... اور وہ الٰہی بخش کو کام بھی نہیں چھوڑنے دے گا۔ چاہے باقی سب کی چھٹی کرا دے۔ "نہیں بھئی۔ ... الٰہی بخش تجھے بات کرنے کی ضرورت نہیں۔" پہلے نے کہا۔

"اچھا ہوتا کہ تو ہماری بات مان لیتا" ایک اور بولا۔

"چلو میں کام ہی چھوڑ دیتا ہوں۔" الٰہی بخش نے بے بسی سے کہا۔ "اللہ رزق دینے والا ہے۔"

"یہ غلطی بھی نہ کرنا۔" تیسرا بولا۔ وہ بھی جانتے تھے کہ انچارج کو پتا چل جائے گا کہ ان لوگوں نے الٰہی بخش پر دباؤ ڈالا ہے۔ پھر ان کا روزگار

بھی جائے گا اور وہ بلیک لسٹ بھی ہو جائیں گے۔" "ٹھیک ہے یار جو جی میں چاہے کر۔ ہم کچھ نہیں کہتے۔"

بات آئی گئی ہو گئی۔ تین چار دن بعد انچارج نے ایک کاریگر کی چھٹی کرادی۔ اسے شکایت تھی کہ وہ پورا کام نہیں کر رہا ہے۔ "تم سب لوگ سدھر جاؤ۔" اس نے دیگر کاریگروں سے کہا۔ "الٰہی بخش بھی تو کام کرتا ہے۔"

"سر جی، آپ مجھے بیچ میں نہ لائیں۔" الٰہی بخش نے انچارج سے بڑی عاجزی سے کہا۔ "مجھے اللہ نے زیادہ رفتار دی ہے تو اس میں ان لوگوں کا قصور نہیں۔ یہ اپنی صلاحیت کے مطابق کام کرتے ہیں اور میں اپنی صلاحیت کے مطابق کام کرتا ہوں۔"

"بات اللہ کی دی ہوئی رفتار کی نہیں۔" انچارج نے کرخت لہجے میں کہا۔ "یہ حرام خور ہیں۔ جان بوجھ کر کم کام کرتے ہیں۔"

"سر جی، پھر میں کام چھوڑ دیتا ہوں۔"

"کام چھوڑ کر تو دیکھ..... گھر سے اٹھوا لوں گا تجھے۔"

اگلے روز کاریگر بہت پریشان تھے۔ ان کا ایک ساتھی نکالا جا چکا تھا۔ اوروں کی باری بھی آ سکتی تھی۔ وہ تیز ہاتھ چلانے کی کوشش کر رہے تھے۔ مگر مسئلہ یہ تھا کہ انہیں اس کی عادت نہیں تھی۔ انہوں نے الٰہی بخش سے بات کرنا چھوڑ دیا۔ ان کے خیال میں وہ بدرنگ تھا۔

ان میں ایک سید کاریگر بھی تھا۔ اس کا نام سلیمان شاہ تھا۔ وہ بھی کم آمیز تھا۔ کسی سے زیادہ بات نہیں کرتا تھا۔ اس روز سب کھانے کے لئے نکلے تو انہوں نے سلیمان شاہ کو پکڑ لیا۔ "دیکھا شاہ جی، یہ الٰہی بخش کیا کر رہا ہے ہمارے ساتھ۔" لال خان نے بات شروع کی۔

"کیا ہوا۔ خیر تو ہے؟" سلیمان شاہ نے پوچھا۔

"کل اصغر کی چھٹی کرادی اس نے۔"

"اچھا، مجھے تو معلوم ہی نہیں تھا۔" سلیمان شاہ گزشتہ روز کام پر نہیں آیا تھا۔

"ہوا کیا؟"

"وہی شکایت شاہ جی کہ ہم لوگ کام چوری کرتے ہیں۔"

"تو اس سے الٰہی بخش کا کیا تعلق؟"

"سب اسی کی وجہ سے ہوا ہے۔" لال خان نے کہا۔ اس وقت وہی سب کی نمائندگی کر رہا تھا۔ "وہی اپنی ایمانداری کا چرچا کرتا رہتا ہے۔ باقی سب حرام خور ہیں۔"

"سب ہوں گے۔ میں نہیں ہوں۔" سلیمان شاہ نے اکڑ کر کہا۔ اور یہ سچ تھا۔ سلیمان شاہ بھی رزق حلال کا قائل تھا۔

"گستاخی معاف شاہ جی!" شکور بولا۔ "الٰہی بخش کے سامنے تو سبھی حرام خور ہیں۔ ہم دن میں ایک دیوار کرتے ہیں۔ آپ ڈیڑھ کرتے ہو اور الٰہی بخش دو دو دیواریں نمٹا دیتا ہے۔"

"تو کیا ہوا۔ میں حرام خوری تو نہیں کرتا۔ الٰہی بخش کا ہاتھ تیز چلتا ہے۔ اس لئے وہ زیادہ کام کر لیتا ہے۔"

"ہاتھ تیز نہیں چلتا شاہ جی! وہ ہمیں ذلیل کرنے کے لئے تیز ہاتھ چلاتا ہے۔" لال خان بولا۔ "ہمارا تو کچھ نہیں۔ پر شاہ جی، آپ تو عزت والے لوگ ہو۔ الٰہی بخش کو سمجھاؤ نا۔"

"الٰہی بخش تو صاف کہتا ہے کہ اس کے سوا سب بے ایمان اور حرام خور ہیں۔" شکور نے آگ لگانے کی کوشش کی۔

سلیمان شاہ آگ بگولا ہو گیا۔ "کس کی مجال ہے کہ میرے بارے میں ایسی بات کہے!"

"زبان سے کہنا ضروری تو نہیں ہوتا باجی!" یار محمد نے کہا۔ "الٰہی بخش اپنے عمل سے یہی کہہ رہا ہے۔"

"اور کسی دن انچارج صاحب بھی کہہ دیں گے۔" لال خان بولا۔

''اچھا، اب بس کرو۔ مجھے کھانا کھانے دو۔'' سلیمان شاہ غرایا لیکن اس سے کھانا نہیں کھایا گیا۔ بے ایمانی اور حرام خوری کا طعنہ اس کے لئے بہت بڑا تھا۔

الٰہی بخش کو اس سب باتوں کا کچھ علم نہیں تھا۔ وہ اس شام کام سے فارغ ہو کر بازار چلا گیا۔ بازار میں بھی زیادہ دیر نہیں لگی۔ امید تھی کہ مغرب سے پہلے وہ گھر جائے گا۔ وہ پھیکی دھوپ میں نالی کے کچے راستے پر تیز قدم بڑھاتا چل رہا تھا کہ دائیں جانب کے کھیتوں کی طرف سے اچانک ہی سلیمان شاہ اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ اس کے چہرے پر گمبھیرتا تھی اور ہاتھ میں کلہاڑی۔

الٰہی بخش نے چونک کر اسے دیکھا اور احتراماً رک گیا۔ سلیمان شاہ کی وہ بہت عزت کرتا تھا۔ اس لئے کہ سلیمان شاہ خود بھی بہت محنتی اور ایماندار آدمی تھا۔ اس میں غرور بھی نہیں تھا، جس سے سادات عام طور پر مالا مال ہوتے ہیں۔ ''سلام علیکم باجی'' الٰہی بخش نے کہا۔

سلیمان شاہ نے روکھے لہجے میں سلام کا جواب دیا۔ پھر بولا ''تجھ سے ایک ضروری بات کرنی تھی۔ اس لئے یہاں تیرے انتظار میں کھڑا ہوں۔''

''مجھے گھر سے بلوا لیا ہوتا باجی!'' الٰہی بخش بولا ''خیر... حکم کریں، کیا بات ہے۔''

''پہلے تو ایک بات پوچھنی ہے تجھ سے، یہ بتا، میں تیرے خیال میں بے ایمان حرام خور ہوں، کام چوری کرتا ہوں۔''

''توبہ باجی توبہ۔'' الٰہی بخش نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔ ''آپ کی ایمانداری تو مثالی ہے۔''

سلیمان شاہ کچھ نرم پڑ گیا۔ ''تو چاہتا ہے کہ دوسرے مجھے بے ایمان اور حرام خور سمجھیں؟''

''کیسی بات کرتے ہیں شاہ صاحب، میں بہت گناہ گار ہوں۔ لیکن ایسے گناہ کرنے والا آدمی نہیں۔''

''تو پھر تو مجھ سے زیادہ کام کیوں کرتا ہے؟'' سلیمان شاہ نے کڑے لہجے میں کہا۔

''دیکھیں شاہ جی، مقررہ وقت میں آپ بھی ایمانداری سے کام کرتے ہیں اور میں بھی۔ کام کی مقدار سے اس کا کیا تعلق۔''

''الٰہی بخش، تو بس میری بات سمجھنے کی کوشش کر۔''

''باجی، آپ میری بات سمجھنے کی کوشش کریں۔'' الٰہی بخش نے بے حد رسان سے کہا۔ ''دیکھیں دوسرے لوگ آپ سے بھی کم کام کرتے ہیں۔ اگر وہ آپ سے مطالبہ کریں کہ انہیں بے ایمانی کے الزام سے بچنے کے لئے آپ اپنی استعداد سے کم کام کریں تو آپ کیا کریں گے؟''

''کسی کی مجال ہے کہ مجھ سے یہ بات کرے۔'' سلیمان شاہ کو جلال آ گیا۔

''بات مجال کی نہیں ہے۔ آپ صرف فرض کر لیں۔''

''دیکھ الٰہی بخش، میں تجھے حکم دے رہا ہوں کہ اب تو مجھ سے زیادہ کام نہیں کرے گا۔''

''باجی سرکار، یہ حکم مانوں گا تو میں بے ایمان نہیں ہو جاؤں گا؟ میرے حلال رزق میں حرام نہیں مل جائے گا؟ باجی سرکار، اللہ کا حکم تو سب سے بڑا ہے۔''

''میں کچھ سننا نہیں چاہتا۔'' سلیمان شاہ نے گرج کر کہا۔ ''تجھے میری بات ماننا ہوگی ورنہ... '' اس نے کلہاڑی بلند کر لی۔

''دیکھیں شاہ جی! آپ اپنی ذمے داری کا بھی خیال کریں۔'' الٰہی بخش نے عاجزی سے کہا۔ ''میں تو آپ کے سامنے اپنے بچاؤ کے لئے بھی ہاتھ نہیں اٹھا سکتا۔ اس لئے کہ میرے باپ نے مجھے یہی سکھایا ہے۔ تو میرا بچاؤ بھی آپ ہی کی ذمے داری ہے تو آپ آلِ رسول ﷺ ہیں۔ آپ مجھے بے ایمانی اور حرام خوری کے لئے کیسے کہہ سکتے ہیں۔''

لیکن مشتعل سلیمان شاہ اب کچھ سمجھنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ ''میں تیرا لیکچر نہیں سنوں گا الٰہی بخش!'' اس نے کہا۔ ''مجھے ہاں یا نہ میں جواب دے۔''

"مجھے موت کا خوف نہیں ہے شاہ جی!" اب الٰہی بخش کا لہجہ بھی سخت ہو گیا۔ "اللہ جانتا ہے کہ میں آپ کو زیادتی سے روکنے کی طاقت بھی رکھتا ہوں لیکن بزرگوں کی روایات اور لحاظ کا تقاضا ہے کہ میں کچھ نہ کروں۔"

"جواب دے، ہاں یا نہ!"

"جواب آپ کو معلوم ہے، میں آپ کی یہ بات نہیں مانوں گا۔"

سلیمان شاہ کا کلہاڑی والا ہاتھ نیچے آ رہا تھا۔ الٰہی بخش نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ ایک لمحے کو اس کے جی میں آئی کہ ہاتھ بڑھا کر کلہاڑی کو پکڑ لے ..... اور وہ ایسا کر بھی سکتا تھا۔ مگر اس کے اندر ایسی کوئی تحریک نہیں تھی۔ وہ سر جھکانے لگا۔ یہی وجہ تھی کہ کلہاڑی اس کے چہرے پر نہیں لگی۔ البتہ اس کی پیشانی میں آ گ اتر گئی۔

سلیمان شاہ نے فوارے کی شکل میں ابلتے خون کو دیکھا تو اس کا حوصلہ جواب دے گیا۔ غصہ سرد ہو گیا۔ اب اس کو صرف یہ خیال تھا کہ وہ بہت خطرناک حرکت کر بیٹھا ہے، اور نہ جانے اس کا انجام کیا ہوگا۔

الٰہی بخش چکراتا ہوا نیچے بیٹھتا گیا۔ اس کا ایک ہاتھ سختی سے اپنی پیشانی پر جما تھا، جیسے خون روکنے کی کوشش کر رہا ہو۔ مگر خون کہاں رکتا ہے۔ گاڑھا گاڑھا خون اس کی بھنچی ہوئی انگلیوں کے درمیان سے بھی رس رہا تھا۔ سلیمان شاہ نے جو خون کا فوارہ چھوٹتے دیکھا تو اس کے اوسان جواب دے گئے۔ اسے احساس ہوا کہ وہ تو بہت ہی سنگین حرکت کر بیٹھا ہے۔ اضطراری طور پر وہ پلٹا اور بھاگ کھڑا ہوا۔

جانے وہ چند لمحے تھے یا کئی گھنٹے۔ بہر حال الٰہی بخش وہیں پڑا رہا۔ پھر اسے قدموں کی آہٹیں سنائی دیں۔ "ارے..... یہ تو بہت زخمی ہے" کسی نے کہا۔ الٰہی بخش کو وہ آواز بہت دور سے آتی محسوس ہوئی۔ کسی نے اسے سہارا دے کر بٹھایا۔ "خون رکنا تو مشکل ہے۔" اسی آواز نے کہا۔ "چادر کس کر باندھ دیتا ہوں۔ آگے اللہ کی مرضی۔"

اس کے سر پر چادر کس کر باندھ دی گئی۔ "بخشے..... تو چل سکتا ہے؟" اس بار دوسری آواز نے پوچھا۔

الٰہی بخش اثبات میں سر ہلا رہا تھا کہ پہلی آواز نے دوسری کو ڈانٹ دیا۔ "کیسی باتیں کرتے ہو۔ اسے اٹھا کر لے جانا پڑے گا۔"

انہوں نے الٰہی بخش کو اٹھا لیا۔ اسی دوران الٰہی بخش کے ہوش و حواس اس کا ساتھ چھوڑ گئے۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ اسے کس طرح لے کر گئے۔ ہوش آیا تو وہ اسپتال میں تھا۔ "یہ پولیس کیس ہے۔" ڈاکٹر کہہ رہا تھا۔ "پہلے تھانے لے جاؤ۔ رپورٹ درج کراؤ۔ پھر پٹی ہوگی۔"

"چاہے اس دوران یہ مر جائے گا۔" پہلی آواز نے تلخ لہجے میں کہا۔

"ہاں، چاہے یہ مر جائے۔ قانون تو قانون ہے۔"

"عجیب قانون ہے۔ سزا مارنے والے کو ملنی چاہئے۔ یہاں سزا اسے مل رہی ہے، جس کے ساتھ ظلم ہوا ہے۔ آپ کے اس قانون سے ظالم کا کیا بگڑے گا۔ ہاں مظلوم بچ بھی سکتا ہو تو بھی مر جائے گا۔"

"قانون میں نے نہیں بنایا۔" ڈاکٹر نے نرم لہجے میں کہا۔ "لیکن میں اس کے خلاف کروں گا تو مصیبت میں پھنسوں گا۔"

"اور یہ مر گیا تو آپ کے ضمیر پر بوجھ نہیں ہوگا۔"

ڈاکٹر سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے الٰہی بخش کی پیشانی پر بندھا ہوا صافہ کھول کر زخم کا معائنہ کیا اور نرم پڑ گیا۔ خون پہلے ہی بہت ضائع ہو چکا تھا۔ اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا ٹھیک ہے۔ میں مریض کی پٹی کرتا ہوں۔ تم ایک کام کرو۔ تھانہ یہاں قریب ہی ہے۔ ایس ایچ او شاہ صاحب میرے دوست ہیں۔ ان سے جا کر کہو کہ میں نے انہیں بلایا ہے۔ میرا نام ڈاکٹر جمیل ہے۔"

فاضل تھانے چلا گیا۔ ڈاکٹر الٰہی بخش کے لئے مصروف ہو گیا۔

☆.....☆

چند گھنٹے بعد الٰہی بخش تھانے میں ایس ایچ او ابرار شاہ کے سامنے پیش تھا۔ ڈاکٹر نے کہہ دیا تھا کہ اسے اسپتال میں داخل ہونے کی ضرورت نہیں۔ زخم گہرا ضرور ہے۔ لیکن خطرناک ہرگز نہیں۔ اس نے بتایا تھا کہ زخم مہلک بھی ثابت ہو سکتا تھا۔ دماغ پر بھی اثر پڑ سکتا تھا۔ بینائی، سماعت یا قوت شامہ بھی ختم ہو سکتی تھی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ البتہ زخم کے معاملے میں احتیاط کرنا ہوگی اور پٹی باقاعدگی سے کرانا ہوگی۔

''اب کیسا محسوس کر رہے ہو؟'' ایس ایچ او نے مشفقانہ لہجے میں الٰہی بخش سے پوچھا۔

''ٹھیک ہوں شاہ جی۔ بس ذرا کمزوری ہے۔ چکر آتے ہیں۔'' الٰہی بخش نے جواب دیا۔

''ابھی تمہاری دوائیں آ جائیں گی۔ یہ بتاؤ، بات کر سکتے ہو مجھ سے؟''

''جی شاہ صاحب۔''

ابرار شاہ نے پیڈ سامنے گھسیٹا اور پنسل سنبھال لی۔ ''تمہیں کس نے مارا ہے؟''

''سلیمان شاہ نے۔''

ابرار شاہ چونکا۔ سلیمان شاہ اس کا دور کا رشتے دار ہوتا تھا۔ سوال کر کے اس نے اس بات کی تصدیق بھی کر لی۔ ''ہوا کیا تھا؟''

الٰہی بخش نے پوری تفصیل بتا دی۔

ابرار شاہ نے سر کو تفہیمی جنبش دی۔ ''تمہیں انصاف ملے گا۔ بے فکر رہو۔'' پھر اس نے آواز لگائی ''بہرام خان...... تین کانسٹیبل ادھر بھیج دو۔''

چند لمحے بعد تین کانسٹیبل اس کے سامنے کھڑے تھے۔ ''نوروز ...... تم تینوں جاؤ اور شاہ کو پکڑ لاؤ۔ ہتھکڑی لگا کر لانا ہے اسے۔ رعایت کوئی نہیں کرنی۔'' یہ کہہ کر وہ ان تینوں کو پتا سمجھانے لگا۔ الٰہی بخش بے یقینی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اسے یقین نہیں تھا کہ اسے انصاف مل سکے گا۔ سادات کی ویسے ہی اتنی عزت ہے کہ کوئی ان پر ہاتھ نہیں ڈالتا۔ پھر یہاں تو منصف خود بھی سادات ہی میں سے تھا۔ ایسے میں انصاف کی امید وہ کیا کرتا۔

تینوں کانسٹیبل چلے گئے۔ ''تم یہاں بیٹھ سکتے ہو۔'' ابرار شاہ نے کہا۔ ''طبیعت زیادہ خراب ہو تو گھر چلے جاؤ۔''

''میرا رکنا ضروری ہے شاہ جی سرکار؟''

''ضروری تو نہیں لیکن رک جاؤ تو میں تمہیں انصاف کا تماشا دکھاؤں گا۔''

''میں رکوں گا باجی!'' الٰہی بخش نے زخمی لہجے میں کہا۔ اس کا دل بہت دکھا ہوا تھا۔ اس نے سلیمان شاہ کو کتنی معقولیت سے بات سمجھانے کی کوشش کی تھی لیکن سلیمان شاہ کو نام ونسب کے گھمنڈ نے اندھا کر دیا تھا۔ اس نے یہ تک خیال نہیں کیا کہ اس کا حکم اللہ کے حکم سے متصادم ہے اور اللہ کے حکم سے بڑھ کر کوئی حکم نہیں۔ الٰہی بخش جانتا تھا کہ اس کی کوئی غلطی نہیں۔ رائی برابر بھی نہیں۔ یہ تالی ایک ہاتھ سے بجی ہے۔ سلیمان شاہ نے زیادتی کی ہے اور اس کو اس کی سزا اس کے سامنے ملنی چاہیے۔

اسی لمحے اس کا باپ پیر بخش ہڑبڑایا ہوا ابرار شاہ کے کمرے میں داخل ہوا۔ ''کیا ہوا میرے بیٹے؟'' وہ الٰہی بخش کی طرف لپکا۔ ''یہ کیسے ہو گیا۔ مجھے فاضل نے بتایا آ کر۔''

الٰہی بخش نے پتھر کا بت بنا اسے دیکھتا رہا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''زخم گہرا ہے لیکن خطرناک نہیں۔ خدا کا شکر ادا کرو کہ تمہارا بیٹا بچ گیا۔'' ابرار شاہ نے کہا۔

پیر بخش نے چونک کر اسے دیکھا۔ اسے سلام کیا۔ ''معاف کرنا مائی باپ۔ اس کی پریشانی میں آپ کا خیال ہی نہیں رہا۔'' وہ پھر الٰہی بخش کی طرف مڑا۔ ''کس نے مارا ہے تجھے۔ مجھے بتا، میں خون پی جاؤں گا اس کا۔''

''نہیں پی سکو گے ابا!'' الٰہی بخش نے سرد لہجے میں کہا۔ ''سلیمان شاہ نے میرے سر پر کلھاڑی ماری ہے۔''

پیر بخش کے چہرے پر زلزلے کا تاثر ابھرا۔ ''تو یہ ...... یہ کیسے ہو سکتا ہے، بیٹے۔ تجھے غلط فہمی ہوئی ہے۔''

''ایسا ہی ہوا ہے ابا، مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی۔ مرنے سے پہلے وہ دیر تک مجھ سے باتیں کرتا رہا تھا۔''

''بیٹے.... اندھیرے میں تو ٹھیک سے دیکھ نہیں سکا ہوگا۔'' پیر بخش نے ڈوبتے لہجے میں کہا۔

''ابا.... اندھیرا نہیں تھا اور میں نے کہا نا کہ پہلے اس نے مجھ سے باتیں کی تھیں۔''

پیر بخش کا چہرا ایسا پیلا ہوگیا، جیسے کسی نے اس کے جسم کا پورا خون نچوڑ لیا ہو۔

''جاؤ ابا، اب اس کا خون پی جاؤ۔ اس نے بلا وجہ مجھے مارا ہے۔'' الٰہی بخش نے کہا۔ پیر بخش نے جیسے سنا ہی نہیں۔ وہ ابرار شاہ کی طرف مڑا۔

''مائی باپ، ابھی پرچہ تو نہیں کاٹا ہے آپ نے؟''

''ابھی تو نہیں کاٹا ہے۔ کاٹنے والا تھا کہ تم آ گئے۔''

''اللہ کا شکر ہے۔'' پیر بخش نے دل کی گہرائیوں سے کہا۔ ''صاحب جی، یہ پرچہ نہیں کاٹنا۔ کاٹنا تو اس میں شاہ جی کا نام درج نہ کرنا۔''

''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟''

''حملہ آور نا معلوم دکھا دینا۔''

''لیکن حملہ آور نا معلوم نہیں۔'' الٰہی بخش نے احتجاج کیا۔ ''میں سلیمان شاہ کو جانتا ہوں۔''

''تو چپ رہ۔'' پیر بخش نے اسے ڈپٹا، پھر وہ ابرار شاہ کی طرف مڑا۔ صاحب جی، خدا کے لئے پرچہ نہ کاٹنا۔'' اس نے التجا کی۔

''پرچہ تو کٹے گا بڑے میاں!'' ابرار شاہ نے کہا۔ ''یہ سنگین معاملہ ہے۔''

پیر بخش تیزی سے اٹھا اور اپنی پگڑی ایس ایچ او کے قدموں میں ڈال دی۔ ''صاحب جی، میری عزت کا خیال کریں.... ''

ابرار شاہ کے چہرے پر حیرت تھی۔ ''آپ مجرم کو بچانے کی بات کرتے ہیں۔ جبکہ جرم آپ کے سگے بیٹے کے خلاف ہوا ہے۔''

''کوئی جرم نہیں ہوا صاحب جی! یہ تو گھر کی بات ہے۔ آقا اور غلام کا معاملہ ہے۔ آقا غلام کو مارے تو یہ جرم نہیں ہوتا۔'' پیر بخش نے کہا اور گڑگڑانے لگا۔ ''صاحب جی، میری عاقبت بچا لو صاحب جی! حضور کی اولاد کے خلاف مدعی بنوں گا تو قیامت کے دن ان کے پاؤں پکڑ کر شفاعت کے لئے کیسے کہوں گا صاحب جی، کیا منہ لے کر جاؤں گا صاحب جی.... ''

ابرار شاہ سناٹے میں آ گیا۔ پیر بخش کے لہجے میں ایسی شدت تھی کہ وہ دہل کر رہ گیا تھا۔ الٰہی بخش جو خاموشی سے یہ سب کچھ سن رہا تھا، اب چپ نہ رہ سکا۔ ''ابا.... میں مر بھی سکتا تھا۔ جا کر ڈاکٹر سے پوچھو۔''

''لیکن تو مرا تو نہیں بیٹے، اللہ نے تجھے اسی لئے بچا لیا کہ تجھ پر اٹھنے والا ہاتھ نبی پاک کی اولاد کا تھا۔''

''نہیں ابا، نبی کی اولاد پر کسی انسان کا خون معاف نہیں ہے۔''

پیر بخش دونوں ہاتھوں سے اپنے رخسار پیٹنے لگا۔ ''کفر مت بک، اپنے قد سے بڑی بات اچھی نہیں ہوتی.... اور وہ بھی اتنی بڑی بات۔''

''اچھا بڑے میاں، اگر تمہارا بیٹا مر جاتا تو کیا کرتے؟'' ابرار شاہ نے پوچھا۔

''میں تب بھی کہتا کہ پرچہ نہ کاٹیں۔ میں بیٹے کا خون معاف کر دیتا۔''

''لیکن پرچہ تو کٹے گا بڑے میاں؟''

''میں نے اپنی پگڑی آپ کے قدموں میں ڈال دی ہے صاحب جی!''

''مگر تمہارا بیٹا پرچہ کٹوانا چاہتا ہے اور میں بھی مجرم کو رعایت دینے کے حق میں نہیں ہوں۔''

میں اس کا باپ ہوں صاحب جی!'' پیر بخش نے افسردگی سے کہا۔ ''اس کی بات میری بات سے بڑی تو نہیں۔''

''اس کی بات زیادہ بڑی ہے بڑے میاں!'' ایس ایچ او نے سرد لہجے میں کہا۔ ''یہ مدعی ہے، تم نہیں۔ فیصلہ اس کے ہاتھ میں ہے۔''

پیر بخش بے بسی کے احساس سے شل ہو کر رہ گیا۔ "خدا کے لئے صاحب جی!"

"دیکھو بڑے میاں، میں بھی سید ہوں۔" ابرار شاہ نے کہا۔ "اور یہ ملازمت میرے لئے پل صراط ہے۔ میں کسی کو رعایت دینے کا قائل نہیں۔ پھر یہ تو قانون کا معاملہ ہے۔ مدعی جو چاہے رپورٹ درج کرا سکتا ہے۔"

پیر بخش الٰہی بخش کی طرف مڑا۔ "دیکھ بیٹے میں تیرا باپ ہوں، لیکن اس معاملے میں تیرے پاؤں بھی پڑ سکتا ہوں۔"

"ابا، بے کار ضد نہ کر۔ اسے سزا ملنی ہی چاہئے" الٰہی بخش بولا۔

"اب کیا بات منوانے کے لئے اپنی پگ تیرے قدموں میں ڈالنی پڑے گی۔" پیر بخش نے دل گرفتگی سے کہا "کاش تو مر جاتا۔ تب تو مدعی میں ہی ہوتا نا۔ کاش ایسا ہی ہوا ہوتا۔"

الٰہی بخش کے جسم میں واضح طور پر تھرتھری دوڑ گئی۔ "ٹھیک ہے ابا، میں اس کے نام کا پرچہ نہیں کٹواتا۔"

پیر بخش اس کی طرف بڑھا۔ "میں تیرا شکر گزار رہوں گا بیٹے" اس نے بیٹے کے سر پر ہاتھ پھیرنا چاہا لیکن بیٹے نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ "تو مجھ سے بہت خفا ہے بیٹے اس بات پر۔" پیر بخش نے افسردگی سے کہا۔ "لیکن حشر کے دن تو سرخرو ہوگا بیٹے۔ تب میری بات تیری سمجھ میں آئے گی۔"

ابرار شاہ اپنی آنکھوں کی نمی چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ "ٹھیک ہے بڑے میاں تم جیت گئے۔" اس نے کہا۔ "لیکن اس سیدزادے کو ایک سبق تو میں نے دے ہی دیا۔ عزت کا سبق جو صرف بے عزتی سے ملتا ہے۔ ابھی وہ ہتھکڑیاں لگائے ہوئے یہاں آئے گا اور راستے میں سب اس کا تماشا دیکھیں گے۔"

یہ سن کر پیر بخش کا چہرہ فق ہو گیا۔ "یہ آپ نے کیا کیا باجی!" اس نے تڑپ کر کہا۔ "ہم گناہ گار تو کہیں کے نہیں رہے۔" اس نے ملامت آمیز نظروں سے بیٹے کو دیکھا۔ "سچ ہے کہ اولاد سب سے بڑی آزمائش ہوتی ہے۔ اولاد آدمی کو جہنم رسید بھی کرا دیتی ہے۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے کمرے سے چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد ابرار شاہ نے حیرت سے کہا۔ "تمہارا باپ اس دنیا کا آدمی تو نہیں لگتا۔"

"ابا کا خیال ہے کہ میں اس کا بیٹا نہیں۔ کسی نے بدل دیا تھا مجھے۔" الٰہی بخش نے تلخی سے کہا۔

☆

پیر بخش ہانپتا کانپتا نازی کے کچے راستے پر چلا جا رہا تھا۔ اسے کچھ ہوش نہیں تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ کوئی اس کا دل مٹھی میں لے کر بھینچ رہا ہے۔ اس کے ہونٹوں پر بس ایک دعا تھی۔ سلیمان شاہ کی رسوائی سے پہلے وہ اس تک پہنچ جائے۔ اس کا ہتھکڑیوں والا تماشا نہ شروع ہوا ہو۔

لیکن دعائیں ایسے کہاں قبول ہوتی ہیں۔

اسے دور سے پولیس والوں کے ساتھ سلیمان شاہ آتا دکھائی دیا۔ ایک پولیس والا آگے چل رہا تھا، دو اس کے دائیں بائیں تھے۔

پیر بخش کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اس پر لرزہ طاری ہو گیا۔ اسے لگا کہ سامنے کربلا ہے اور وہ بدعہد کوفی ہے، جس نے نبی کے چہیتے نواسے کو پیاس کے صحرا میں دھکیل دیا ہے۔ اس کے دل میں بس ایک خیال تھا، قیامت کے دن وہ کس منہ سے حضورؐ کے حضور پیش ہوگا۔ آپؐ پوچھیں گے تو کیا جواب دے گا۔

وہ بے تاب ہو کر ایسے دوڑا کہ زندگی میں کبھی نہیں دوڑا تھا۔ وہ ان کے پاس پہنچ کر رکا اور بے تابانہ سلیمان شاہ کے ہتھکڑی لگے ہاتھ چومنے لگا

"باجی، میرے سرکار، آپ کو آپ کے بزرگوں کی قسم ہمیں معاف کر دینا۔"

سلیمان شاہ کا بے تاثر چہرہ پتھر کا بنا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ اسے جیسے گرد و پیش کا ہوش ہی نہیں تھا۔ توہین اور بے عزتی کے احساس نے اسے شل کر کے رکھ دیا تھا۔

"مجھے پتا نہیں تھا شاہ جی، ورنہ یہ سب کچھ نہ ہوتا۔ وہ میرا بدنصیب بیٹا کچھ نہیں جانتا۔ اس نے اپنی عاقبت خراب کی اور میری بھی "

اچانک سلیمان شاہ جیسے کسی سحر سے آزاد ہو گیا۔ "نہیں چاچا پیر بخش، غلطی میری تھی۔ الٰہی بخش کی نہیں۔" اس نے شرمساری سے کہا۔ "میں سزا کا مستحق ہوں۔ مجھے سزا ملنی چاہئے۔ میں نے ظلم کیا ہے۔ میری آنکھوں پر پٹی پڑ گئی تھی۔"

"نہیں باجی، پٹی تو میرے بیٹے کی عقل پر پڑی تھی "

"او بابا جی، ہٹو ایک طرف۔" آگے چلنے والے نوروز خان نے پیر بخش کو ڈپٹ کر کہا۔ "ہمیں تھانے پہنچنا ہے۔"

"ہٹتا ہوں۔ آپ ان کی ہتھکڑیاں تو کھول دو۔"

"دماغ خراب ہوا ہے۔" نوروز خان بگڑ گیا۔ "تھانیدار صاحب کا حکم ہے۔ ہتھکڑیاں تو اب وہی کھول سکتے ہیں۔ ہٹ جا بابا۔"

"کیوں گناہ کماتے ہو حوالدار، ان کے ہاتھ کھول دو۔ یہ بھاگنے والے نہیں۔ میں ضمانت دیتا ہوں ان کی۔"

"لو ضمانت لینے والے کو تو دیکھو ذرا" نوروز خان نے حقارت سے کہا۔

"میرا حق ہے یہ۔" پیر بخش کا لہجہ بدل گیا۔ "جس سے ان کا جھگڑا ہوا ہے، وہ میرا ہی بیٹا ہے۔"

نوروز خان کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ وہ ہتھکڑیاں کھول دیتا لیکن جانتا تھا کہ ابرار شاہ کتنا سخت اور اصول پرست آدمی ہے۔ چنانچہ اس نے نرم لہجے میں کہا۔ "بابا جی، یہ میرے اختیار سے باہر ہے۔ مجھ کو معافی دو۔"

"اچھا ... چلو، ہتھکڑیاں مجھے لگا دو۔" پیر بخش بولا۔

"او بابا، جان چھوڑ دو میری۔ میں مجبور ہوں۔ تھانے دار تو مجھے جان سے مار دے گا۔"

"باجی کے ہتھکڑیاں لگی رہیں گی تو میں اپنی جان دے دوں گا۔" یہ کہہ کر پیر بخش نے زمین سے سر ٹکرانا شروع کر دیا۔ تینوں کانسٹیبل بوکھلائے ہوئے اسے دیکھتے رہے۔ سلیمان شاہ نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ لیکن اس پر تو جیسے جنون طاری ہو گیا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی پیشانی سے خون نکلنے لگا۔

"کھول دو یار۔ اب جو ہوگا، دیکھا جائے گا۔" نوروز خان نے اپنے ساتھیوں سے بے بسی سے کہا۔ پھر وہ پیر بخش کی طرف مڑا۔ "چل۔ اٹھ جا بابا۔"

☆

راضی نامہ ہو چکا تھا۔ الٰہی بخش اور اس کا باپ جا چکے تھے۔ راضی نامہ مکمل طور پر یکطرفہ تھا۔ ابرار شاہ نے کوشش کی تھی کہ الٰہی بخش کا دوا دارو کا خرچہ سلیمان شاہ برداشت کرے اور اس کے علاوہ بھی کچھ نقد رقم دے۔ لیکن پیر بخش نے انکار کر دیا۔ الٰہی بخش یہ کہہ کر الگ ہو گیا کہ اس نے معاملہ باپ پر چھوڑ دیا ہے۔

''چچا۔۔۔ اب میں جاؤں؟'' سلیمان شاہ نے ابرار شاہ سے پوچھا۔

''ذرا بیٹھو۔ مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔'' ابرار شاہ نے کہا۔

جب سے سلیمان شاہ تھانے آیا تھا، مسلسل کھڑا ہوا تھا۔ ابرار شاہ نے اسے بیٹھنے نہیں دیا تھا۔ یہی نہیں، اس نے ابرار شاہ کو چچا کہہ کر پکارا تو اسے ڈانٹ سننا پڑی تھی۔ ابرار شاہ نے صاف کہہ دیا تھا کہ رشتے داری گھر میں ہوتی ہے، تھانے میں نہیں۔ یہاں وہ ایس ایچ او ہے اور وہ ملزم ہے۔

سو اب سلیمان شاہ بیٹھتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔ ابرار شاہ نے کہا ''بیٹھ جاؤ سلیمان، اس وقت تم ملزم نہیں ہو۔ میرے چھوٹے ہو۔ مجھے تم کو کچھ سمجھانا ہے۔''

سلیمان شاہ بیٹھ گیا۔

''تمہیں اندازہ ہے کہ تم کتنی بڑی مصیبت میں پھنس گئے تھے۔''

''جی چچا، میں جانتا ہوں۔''

''یہ 307 کا کیس تھا اور میں پرچہ کاٹ دیتا۔ تمہاری جگہ میرا بیٹا ہوتا تو میں اس کے ساتھ بھی رعایت نہ کرتا۔''

''جانتا ہوں چچا، اور مجھے آپ پر فخر ہے۔ میرے دل میں آپ کی عزت اور بڑھ گئی ہے۔''

''میں تمہیں یہ سمجھانا چاہتا ہوں بیٹے کہ یہ لوگ آلِ رسولؐ ہونے کے ناتے ہمارا احترام کرتے ہیں تو یہ ہم پر بھی فرض ہے۔ ہمیں خود کو محترم بنانا چاہئے۔ اچھی صفات پیدا کرنا چاہئیں اور ان عقیدت مندوں کی عزت بھی کرنی چاہئے۔ میں جانتا ہوں تم اچھے کردار کے لڑکے ہو۔ کوئی برائی نہیں تم میں۔ پھر بھی۔۔۔۔۔''

''چچا آپ یقین کریں۔ میں ابتدا ہی سے شرمندہ ہوں اور میں چاہتا ہوں کہ مجھے اپنے کئے کی سزا ملے۔''

''جانتے ہو، تم سے غلطی کیوں ہوئی؟''

''چچا میں بے ایمانوں کے اکسائے میں آ گیا تھا۔''

''اور اس کا سبب یہ تھا کہ تمہیں اپنے نام و نسبت پر غرور ہے۔ گھمنڈ ہے اور یہ دنیا کی بدترین چیز ہے۔ اللہ کو سب سے زیادہ ناپسند ہے۔ آدمی غرور کس چیز پر کرے، جبکہ سبھی کچھ اللہ کا دیا ہوا ہے۔ اسی لئے تو سب تعریفیں اس کے لئے ہیں۔ اس کی دی ہوئی عزت پر گھمنڈ کرنا چھوڑ دو۔ اچھے اور مثالی انسان بنو۔ اس لئے کہ یہ عزت کرنے والے عقیدت مند ہم سے یہی توقع کرتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آئندہ تم کبھی اس حیثیت میں یہاں نہیں آؤ گے۔''

''چچا انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔''

☆

یہ کسی کو نہیں معلوم تھا کہ جرگہ کس نے بلایا۔ گاؤں میں سادات کی اکثریت تھی۔ سارے بڑے اکٹھے ہوئے۔ مسئلہ وہی تھا الٰہی بخش کے ساتھ سلیمان شاہ کی زیادتی۔

''میں مانتا ہوں کہ سلیمان نے بہت زیادتی کی۔'' سلیمان شاہ کے باپ عرفان شاہ نے کہا۔ ''خود سلیمان بھی بہت شرمندہ ہے۔''

سب لوگ سلیمان کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ''یہ سچ ہے بزرگو، مجھے شروع ہی میں احساس ہو گیا تھا۔ میں تو معافی مانگنے والا تھا لیکن چاچا پیر بخش نے روک دیا۔''

''چلو یہ بڑی اچھی بات ہے کہ تمہیں غلطی کا احساس ہو گیا۔'' گاؤں کے سب سے بڑے افسر شاہ نے کہا۔ ''اور غلطی پر معافی مانگنے میں بڑائی بھی ہے لیکن بیٹا، صرف معافی سے کچھ نہیں ہوتا۔ تلافی بھی ضروری ہے۔''

''میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا دادا!'' سلیمان شاہ نے کہا۔

''پیر بخش نے پرچہ نہیں کٹنے دیا۔ ورنہ کچہری کے چکر لگتے۔ پیسہ الگ خرچ ہوتا، اور ہو سکتا ہے کہ تمہیں سزا بھی ہو جاتی۔ پھر اس نے تمہیں زبانی معافی تک نہیں مانگنے دی۔ راضی نامہ کرنے کا کوئی صلہ بھی نہیں لیا۔''

''ہاں جی، شاہ صاحب ٹھیک کہتے ہیں۔'' کسی نے تائید کی۔

''اور الٰہی بخش نے یہ سب کچھ تمہارے لئے نہیں کیا۔'' افسر شاہ نے مزید کہا ''تم جانتے ہو کہ کس حوالے سے اس نے تمہاری عزت کی۔ ورنہ تم کیا ہو۔ اور یہ بھی سن لو کہ اس نے صرف تم پر احسان نہیں کیا۔ ہم سب پر کیا ہے اور ہمیں اس کا صلہ دینا چاہئے اسے۔''

''آپ حکم کریں دادا!'' سلیمان شاہ نے کہا۔

''میں چاہتا ہوں کہ تم اسے پچاس روپے دو۔ پچاس روپے ہم سب اکٹھے کر کے اسے دیں گے۔ اور جو بھی جس کی توفیق ہو گی، وہ دے گا۔ ہم سب الٰہی بخش کی عیادت کو جائیں گے۔ اور یہ سب اسے دیں گے۔''

سلیمان شاہ سوچ میں پڑ گیا۔ پچاس روپے چھوٹی رقم نہیں تھی۔ پھر بولا ''آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔ لیکن اس وقت تو میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ مجھے پیسے دس دن بعد ملیں گے۔''

''میں تمہیں قرض دوں گا۔ دس دن بعد واپس دے دینا۔'' افسر شاہ نے یہ مسئلہ بھی حل کر دیا۔ پھر وہ دوسروں کی طرف مڑے۔ ''آپ لوگوں کا خیال ہے؟''

سب متفق تھے، بات طے پا گئی۔

پیر بخش کو اطلاع مل گئی کہ سادات کا جرگہ اس کے گھر آ رہا ہے۔ اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اس نے بیوی کو بتایا، بیٹوں سے باہر چھڑکاؤ کر کے چارپائیاں باہر لگانے کو کہا اور خود ان کے استقبال کے لئے دوڑ گیا۔

جرگہ گاؤں کی حدود میں داخل ہی ہوا تھا کہ پیر بخش وہاں پہنچ گیا۔ اس نے سب کی دست بوسی کی اور پھر افسر شاہ کے قدموں میں بیٹھ گیا۔

''سرکار ــــ مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہے؟'' اس نے تعجب سے پوچھا۔

''تمہیں یہ خیال کیوں آیا پیر بخش؟''

''آپ لوگوں نے کیوں تکلیف کی۔ حکم کیا ہوتا تو میں خود حاضر ہو جاتا۔''

''لیکن آنا تو ہمیں ہی تھا پیر بخش؟'' افسر شاہ بولے۔

''مجھے کیوں گناہ گار کیا باجی!''

''ہم تمہارے بیٹے کی مزاج پرسی کو آئے ہیں۔''

''مجھے کہلوایا ہوتا۔ میں اسے خود آپ کے پاس لے آتا۔''

''عیادت گھر جا کر کی جاتی ہے پیر بخش۔ بیمار کو گھر نہیں بلوایا جاتا'' افسر شاہ نے نرم لہجے میں کہا۔ ''اور یہ نبی کریم کی سنت ہے۔''

یہ سن کر پیر بخش گنگ ہو کر رہ گیا۔ وہ بڑے احترام سے انہیں گھر لایا۔ وہیں دوسرے بیٹے الٰہی بخش کو باہر لے آئے تھے۔ الٰہی بخش بھی ان کی پیشوائی کو آگے بڑھا اور دست بوسی چاہی۔ ''الٰہی بخش تم سکون سے چارپائی پر بیٹھ جاؤ۔ تم بیمار ہو'' افسر شاہ نے شفقت سے کہا۔

الٰہی بخش نے بے بسی سے باپ کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''آپ لوگوں کے سامنے یہ گستاخی کیسے کر سکتا ہوں۔''

''یہ ہمارا حکم ہے۔ ہمارا احترام کرتے ہو تو یہ حکم بھی ماننا پڑے گا۔''

پیر بخش کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں، ادھر الٰہی بخش مستفسرانہ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ''باجی سرکار اسے اس پر مجبور نہ کریں۔'' وہ گڑگڑایا۔

''یہ تو تمہارے احترام کی آزمائش ہے۔'' افسر شاہ نے کہا اور الٰہی بخش کا ہاتھ تھام کر اسے چارپائی کی طرف لے گئے۔ ''چلو بیٹھ جاؤ۔'' وہ اس کے بیٹھنے کے بعد اس کے ساتھ ہی چارپائی پر بیٹھے۔ ''اب یہ بتاؤ طبیعت کیسی ہے؟''

سب نے الٰہی بخش کی مزاج پرسی کی۔ پھر اپنی لائی ہوئی چیزیں اسے دیں۔ ان میں چار مرغیاں، ڈیڑھ درجن انڈے اور کچھ گھی مکھن تھا۔ پیر بخش نے بہت حجت کی۔ لیکن وہ چیزیں اسے لینا پڑیں۔ البتہ پیسوں کے معاملے میں وہ اڑ گیا۔ ''یہ ضد نہ کریں سرکار، ورنہ میں جان دے دوں گا۔'' اس نے کہا۔ پیسے اس نے قبول نہیں کیے۔ مگر ایک اور سخت مرحلہ اس کا منتظر تھا۔ سلیمان شاہ نے الٰہی بخش سے کہا۔ ''میں دل کی گہرائیوں سے شرمندہ ہوں اور تم سے معافی چاہتا ہوں الٰہی بخش۔''

اس وقت پیر بخش کا جی چاہا کہ زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔

باجی لوگوں کے جانے کے بعد اس نے الٰہی بخش سے کہا۔ ''یہ سب تیری وجہ سے ہوا ہے بیٹے، ہم بہت گناہ گار ہو گئے ہیں۔''

''ابا مجھے معاف کر دو۔ مرنا میرے اختیار میں تو نہیں تھا۔'' الٰہی بخش نے تلخ لہجے میں کہا۔ اس لمحے اس نے فیصلہ کر لیا کہ اب وہ یہاں نہیں رہے گا... کراچی جائے گا۔

☆

''تو یہ ہے اس زخم کی کہانی۔'' شیخ صاحب نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

''جی سر، خواہ مخواہ آپ کا وقت ضائع ہوا۔'' الٰہی بخش نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ شیخ صاحب اسے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

''میں وقت کبھی ضائع نہیں کرتا الٰہی بخش!'' انہوں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''میرا وقت بہت قیمتی ہے۔''

''جی سر!''

''اچھا، اب تم جا کر آرام کرو۔ کل صبح نو بجے ڈرائی کے لیے تیار رہنا۔ پھر پرسوں سے تمہاری ڈیوٹی سعدیہ کے ساتھ ہوگی۔ گڈ نائٹ۔''

''گڈ نائٹ سر!'' الٰہی بخش کو عجیب سا لگا۔ یہ لفظ اس نے پہلی بار بولا تھا۔

☆

وہ الٰہی بخش کی زندگی کا یادگار ترین دن تھا۔ جب وہ پہلی بار سعادی کو کالج چھوڑنے گیا۔

اس صبح وہ معمول کے مطابق سویرے اٹھا۔ فجر کی نماز ادا کر کے وہ باغیچے میں آ گیا۔ وہ بہت حسین صبح تھی یا اسے حسین لگ رہی تھی۔ گھاس پر ننگے پاؤں چلتے ہوئے اسے اپنے اندر روشنی سی اترتی ہوئی محسوس ہوئی۔ وہ گہری گہری سانسوں کے ساتھ پھیپھڑوں میں خوشبو سے مہکتی ہوا کو اتارتا رہا۔ اس صبح وہ خوش تھا۔ کچھ دیر ٹہلنے کے بعد وہ کرمو کے پاس بیٹھ کر ادھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔

ساڑھے چھ بجے وہ اٹھا اور اپنے کوارٹر میں چلا گیا۔ کپڑے بدل کے، تیار ہو کے وہ باہر آیا تو نئی چمکتی کار کو اور چمکانے میں مصروف ہو گیا۔ چمکانا کیا، در حقیقت وہ اسے پیار سے سہلا رہا تھا۔ قسمت کی بات ہے، اسے باقاعدہ چلانے کو یہ پہلی کار ملی تھی۔ بالکل نئی چمچماتی کار!

اسے بتایا گیا تھا کہ سعادی ساڑھے سات بجے آیا کرے گی۔ لیکن وہ پہلا دن تھا۔ شاید اس لئے وہ سوا سات بجے ہی آ گئی۔ شیخ صاحب اور بیگم صاحبہ اس کے ساتھ تھے۔ ''تم تیار ہو؟'' شیخ صاحب نے الٰہی بخش سے پوچھا۔

''جی سر جی!''

''اس کے لئے یونیفارم کا بھی بندوبست کرو۔'' بیگم صاحبہ نے اسے کڑی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ڈرائیور کو ڈرائیور ہی نظر آنا چاہئے۔''

''سعادی چاہے گی تو یہ بھی ہو جائے گا۔'' شیخ صاحب بولے۔

''نہیں پاپا، اس کی ضرورت نہیں۔'' سعادی نے کہا ''میں تماشا نہیں بننا چاہتی۔''

''اس میں تماشے کی کیا بات ہے؟'' بیگم صاحبہ کا منہ بن گیا۔ ''اس سے تو شان کا پتا چلتا ہے۔''

''مجھے نہیں چاہئے ایسی شان۔'' سعادی نے جھنجلا کر کہا۔

بیگم صاحبہ اسے نظر انداز کر کے الٰہی بخش کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ ''گاڑی ذرا احتیاط سے چلانا۔ پتا نہیں، تمہیں چلانی آتی بھی ہے یا نہیں۔''

شیخ صاحب کا چہرہ تمتما اٹھا۔ ''میں کل ٹرائی لے چکا ہوں۔ یہ بہت اچھی ڈرائیو کرتا ہے۔''

''آپ کی ٹرائی کا مجھے تو اعتبار نہیں۔ پینٹ کرنے والے کو ڈرائیور بنا دیا۔''

الٰہی بخش کا چہرہ تپنے لگا۔ اسے احساس ہو گیا کہ بغیر کسی وجہ سے بیگم صاحبہ اس سے چڑتی ہیں اور وہ وہاں زیادہ عرصہ کام نہیں کر سکے گا۔ اس نے دھیرے سے کہا۔ ''سر۔۔۔ بیگم صاحبہ مجھ سے مطمئن نہیں تو۔۔۔''

شیخ صاحب نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔ پھر وہ رخسانہ بیگم کی طرف مڑے۔ ''آپ کو پریشانی کیا ہے؟''

''گاڑی نئی ہے، آپ بہت بڑا خطرہ مول لے رہے ہیں۔۔۔''

''میرے لئے پرانی بیٹی نئی کار سے زیادہ اہم ہے۔ میں اس معاملے میں کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ آپ بے فکر رہیں۔ میں پوری طرح مطمئن ہوں۔''

''آپ صرف احسان اتارنے کی خاطر۔۔۔''

اس بار شیخ صاحب کا تحمل جواب دے گیا۔ ''بس رخسانہ بیگم'' انہوں نے بلند آواز میں کہا۔ ''آپ میری نرمی سے فائدہ نہ اٹھائیں۔ اب میں ایک لفظ بھی نہیں سنوں گا۔''

''جہنم میں جائیں۔'' رخسانہ بیگم نے پاؤں پٹختے ہوئے کہا اور وہاں سے چلی گئیں۔

شیخ صاحب نے کندھے جھٹکے اور الٰہی بخش سے بولے۔ ''بیگم صاحب کی باتوں کو مائنڈ نہ کرنا۔ میں بھی نہیں کرتا۔ برداشت تو کرنا پڑتا ہے۔''

''میں کیا مائنڈ کروں گا سر، بے حیثیت آدمی ہوں۔''

شیخ صاحب نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ انہوں نے سعدیہ کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''وقت ہو گیا جاؤ بیٹی خدا حافظ۔''

الٰہی بخش نے پچھلا دروازہ کھولا اور سادی کے بیٹھنے کے بعد اسے بند کر دیا۔ پھر وہ گھوم کر اگلے دروازے کی طرف آیا۔

"خدا حافظ پاپا!" سادی نے کہا۔

☆

وہ خوشبو کا پہلا سفر تھا!

الٰہی بخش گاڑی کو باہر سڑک پر لے آیا تھا۔ اس نے بیک ویو مرر میں دیکھا۔ وہاں سادی نہیں تھی۔ الٰہی بخش نے عقب نما آئینے کو درست کر کے ایسی پوزیشن میں لانے کی کوشش بھی نہیں کی کہ اس میں سادی نظر آئے۔ اس کے لئے اتنا ہی بہت کافی تھا کہ وہ گاڑی میں اس کے ساتھ تھی۔

سادی اس کی رہنمائی کر رہی تھی۔ وہ اس کی ہدایت کے مطابق گاڑی چلا رہا تھا۔ اس کی خوشبو اس کی روح سے باتیں کر رہی تھی۔ کوئی بیس منٹ کی ڈرائیو کے بعد سادی نے کالج کے گیٹ کے سامنے گاڑی رکوا دی۔

"تم ایک بجے مجھے لے جانے کے لئے آ جانا" سادی نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

"بی بی۔۔۔ ایک بات بتائیں گی۔"

"میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ میں سعدیہ ہوں۔ تم مجھے سادی بھی کہہ سکتے ہو۔"

"میں۔۔۔ نہیں بی بی۔ یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔"

"تو چلو، اپنی بات بھی رکھ لو اور میری بھی۔ تم مجھے سادی بی بی کہہ لیا کرو۔"

"یہ ٹھیک ہے سادی بی بی۔"

"اب پوچھو کیا بات ہے۔"

"یہ علاقہ کون سا ہے سادی بی بی، کیا نام ہے اس کا؟"

"یہ فریئر روڈ ہے۔"

"ٹھیک ہے جی۔ وہ میں پہلی بار اس طرف آیا ہوں۔"

"تم فکر نہ کرو، میں تمہیں پورا شہر دکھا دوں گی۔ اب میں جاؤں؟"

الٰہی بخش نے حیرت سے اسے دیکھا۔ وہ اس سے اجازت مانگ رہی تھی یا اس کا مذاق اڑا رہی تھی۔ لیکن اس کے چہرے پر کوئی ایسا تاثر نہیں تھا۔ وہ جواب طلب نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ "خدا حافظ سادی بی بی!"

"میری چھٹی ایک بجے ہوتی ہے۔ لیکن کبھی دیر ہونے لگے تمہیں تو تیز ڈرائیو نہ کرنا۔ میں پانچ دس منٹ انتظار بھی کر سکتی ہوں۔"

"جی سادی بی بی!"

"اچھا۔۔۔ خدا حافظ۔"

الٰہی بخش اسے گیٹ کی طرف جاتے دیکھتا رہا۔ کتنی پیاری لڑکی تھی وہ۔۔۔ کتنی مٹھاس تھی اس کے لہجے میں اور کتنی اپنائیت۔۔۔ لوگ نوکروں سے ایسے بات تو نہیں کرتے۔ اسے ذرا بھی غرور نہیں ہے۔ کاش۔۔۔ یہ لڑکی ایبٹ آباد کے کسی غریب گھرانے کی ہوتی۔ اسے اس کی کتنی فکر تھی کہ تیز ڈرائیونگ کو منع کر رہی تھی، کون جانے، اسے ڈرائیور کی فکر ہے یا اپنی نئی کار کی۔ اس کے اندر سے کسی نے کہا۔ اس سے آگے اس سے سوچا نہیں گیا۔ اس نے خود کو یاد دلایا کہ سادی اس کے لئے نہیں ہے۔ ہے تو اس حد تک کہ وہ اس کی خوشبو سے باتیں کر سکتا ہے۔ اس کی قربت پر خوش ہو سکتا ہے۔ اس سے آگے تو اسے خواب دیکھنے کا حق بھی نہیں۔

وہ اسی راستے سے واپس آ گیا، جس سے سادی اسے لائی تھی۔

ٹھیک ایک بجے وہ کالج پہنچ گیا۔ سادی گاڑی میں آ بیٹھی۔ راستے میں ان کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔

اگلا روز ذرا مختلف تھا۔ سادی ساڑھے سات بجے اکیلی باہر آئی۔ الٰہی بخش گاڑی صاف کر رہا تھا۔ ''گڈ مارننگ الٰہی بخش'' سادی نے کہا۔ الٰہی بخش تھوڑا سا حیران ہوا۔ پھر اس نے بھی جواب میں گڈ مارننگ سادی بی بی، کہا۔ اس دن کے بعد یہ معمول میں شامل ہو گیا۔

سادی گاڑی میں بیٹھ گئی تو الٰہی بخش ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا۔ ''چلیں سادی بی بی۔'' اس نے کہا اور بلا ارادہ نظریں اٹھ گئیں۔ لیکن آئینے میں سادی کا عکس دیکھ کر وہ ہڑبڑا گیا۔ سادی اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

یہ کیا؟ اس نے سوچا۔ پہلے تو اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ عقب نما شیشے کی پوزیشن تو وہی کل والی تھی۔ البتہ سادی اس بار دوسرے کونے میں بیٹھی تھی۔ الٰہی بخش کی نظریں جھک گئیں۔

''چلو الٰہی بخش'' سادی نے آہستہ سے کہا۔

الٰہی بخش نے گاڑی اسٹارٹ کی اور آگے بڑھا دی۔

اس روز الٰہی بخش نے جب بھی نظریں اٹھا کر عقب نما آئینے میں دیکھا، سادی کو کھڑکی سے باہر دیکھتے پایا۔ لیکن ہر بار اسے یہ احساس ہوا کہ اس سے پہلے سادی عقب نما ہی میں دیکھ رہی تھی اور اس کی نظریں اٹھتے دیکھ کر اس نے سر گھما لیا ہے۔

پھر اچانک سادی نے پوچھا ''یہ تم بیک ویو مرر میں کیا دیکھتے ہو؟''

الٰہی بخش بوکھلا گیا۔ ''ج.... جی.... کک.... کچھ نہیں.... کچھ بھی تو نہیں۔''

''پھر بھی کچھ تو ہو گا۔''

''بس اتفاق سے نظر اٹھ جاتی ہے۔'' الٰہی بخش نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا ''ورنہ میں تو اس شیشے کو دیکھتا بھی نہیں۔''

''یہ تو بہت بری بات ہے۔ پھر تم اچھے ڈرائیور تو نہیں ہو سکتے۔''

''میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا سادی بی بی!''

''گاڑی میں یہ شیشہ لگا ہے تو اس کا کوئی مقصد، کوئی استعمال بھی تو ہو گا۔ یہ آرائش کے لئے تو نہیں نا!''

''ہاں جی، اس سے ڈرائیور پیچھے دیکھتا ہے، اس پر نظر رکھتا ہے۔''

''پر تم تو پیچھے کے ٹریفک پر نظر نہیں رکھتے۔''

''یہ کیسے ممکن ہے سادی بی بی، پیچھے کے ٹریفک پر نظر نہ رکھو تو کسی بھی وقت کوئی ایکسیڈنٹ ہو جائے۔''

''تو جب میں نے پوچھا تھا کہ تم اس شیشے میں کیا دیکھتے ہو تو تم نے کہا تھا کہ کچھ نہیں دیکھتے۔'' سادی نے شوخ لہجے میں کہا۔

اس بار الٰہی بخش بری طرح گڑبڑا گیا۔ ''وہ جی سادی بی بی، میں آپ کی بات سمجھا ہی نہیں تھا۔''

''میں تو یہ کہہ رہی تھی کہ تم اس شیشے کو بھی دیکھتے رہا کرو۔ میں نہیں چاہتی کہ کوئی حادثہ ہو۔''

''آپ بے فکر رہیں سادی بی بی۔''

اس روز سادی کو کالج میں چھوڑ کر کوٹھی واپس آتے ہوئے الٰہی بخش اسی گفتگو پر سوچتا رہا۔ اب وہ اس شیشے میں سادی کو دیکھ سکتا تھا۔ اسے پیچھے کے ٹریفک پر نظر جو رکھنی تھی۔

☆

خوشبو کے اس سفر میں دن پر لگا کر اڑتے رہے!

اب وہ خاموشی میں نہیں ہوتا تھا۔ ان کے درمیان یکطرفہ بے تکلفی اور یکطرفہ گفتگو کا رشتہ قائم ہو گیا تھا۔ یکطرفہ اس لئے کہ الٰہی بخش کے پاس کہنے کو کچھ تھا نہ پوچھنے کو۔ اس کی فطرت میں تجسس تو بہت تھا۔ لیکن اس نے اس پر قابو پانے کا طریقہ جان لیا تھا۔ یہ تو اسی وقت ہو گیا تھا، جب باپ اسے عشق کی تلقین کیا کرتا تھا اور وہ مزاحمت کرتا تھا۔ بات کچھ یوں ہے کہ عشق احترام سکھاتا اور احترام تجسس سے روکتا ہے۔

چنانچہ سادی اس سے سوال کرتی رہتی تھی اور وہ جواب دیتا تھا۔ سوالات سے اندازہ ہوتا تھا کہ سادی کو اس کے بارے میں تجسس بہت ہے۔ وہ اس سے اس کی شہر اس کے گاؤں کے بارے میں پوچھتی، ان کے رہن سہن، ان کے رسم و رواج کے بارے میں سوال کرتی۔ اس کے لئے وہ جیسے پریوں کا دیس تھا۔ بہت سی باتوں پر اسے یقین نہ آیا۔ خاص طور پر وہاں کے معاشرے میں عورت کا جو مقام اور کردار تھا، وہ اسے اداس کر دیتا۔ دوسری طرف وہ اس علاقے کے قدرتی حسن کے متعلق سن کر بہت خوش ہوتی۔

”ہائے ــــ وہ تو سچ مچ خوابوں کی سرزمین ہے۔“ وہ گہری سانس لے کر کہتی۔ ”کاش ــــ میں بھی کسی ایسی جگہ رہ سکتی۔“

الٰہی بخش کی سمجھ میں نہ آتا کہ یہ خوابوں کی سرزمین کا کیا مطلب ہے۔ وہ ایبٹ آباد میں پیدا ہوا تھا۔ اس نے آنکھیں ہی اس خوب صورتی میں کھولی تھیں۔ اس کے لئے وہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ اسے تو کراچی زیادہ اچھا لگتا تھا۔ ”وہاں رہنا آسان نہیں ہے سادی بی بی!“ اس نے کہا۔

”کیا مطلب؟“

”وہاں کی زندگی رومینٹک بہت ہے۔“ الٰہی بخش نے پچھلے حوالے سے کہا۔

”میں اب بھی نہیں سمجھی۔“

”وہاں روزگار نہیں ہے۔ اسی لئے تو ہم لوگ یہاں فٹ پاتھ پر بیٹھنے کو اپنے گھر پر ترجیح دیتے ہیں۔ وہاں کی ہماری زندگی یہاں کی زندگی سے بھی زیادہ رومینٹک ہے۔“

سادی کو وہ حوالہ یاد آ گیا اور وہ شرمندہ ہو گئی۔ ”تمہیں اس دن بری لگی تھی میری بات۔“

”نہیں سادی بی بی، مجھے تو اچھا لگا تھا۔ مگر میں نے یہ ضرور سوچا تھا کہ آپ وہ زندگی خود گزاریں، تب بھی وہ آپ کو رومینٹک لگے گی؟“

”بہت مشکل سوال ہے۔ شاید کسی دن میں تمہیں اس کا جواب دے سکوں۔“ سادی نے کہا اور پھر گفتگو کا رخ بدلا۔ ”اتنا خوبصورت علاقہ ہے تمہارا۔ اس کی وجہ سے کم از کم بہت بڑی بچت ہوتی ہوگی۔“

”کیسی بچت سادی بی بی؟“

”تمہاری شادی ہوگی تو ہنی مون پر تمہارا زیادہ خرچہ نہیں ہوگا۔“

”ہنی مون۔ یہ کیا ہوتا ہے؟“

سادی ہنی مون کے متعلق سمجھانے لگی۔

”ہمارے ہاں یہ بھی نہیں ہوتا۔“ الٰہی بخش نے اس کی بات سننے کے بعد سادگی سے کہا۔ ”ہمارے ہاں تو میاں بیوی ساتھ بھی نہیں بیٹھتے کبھی۔ خود میں نے ابا اور اماں کو کبھی ایک ساتھ بیٹھے نہیں دیکھا۔“

سادی بھونچکا رہ گئی۔ ”کیوں بھئی؟“

”ہمارے ہاں شرم و لحاظ بہت ہے۔ پورا کنبہ ساتھ رہتا ہے۔ لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔ ورنہ لوگ بے شرم کہتے ہیں اور ایسے لوگوں کو اچھا نہیں سمجھتے۔“

”یہ تو کوئی اچھی بات نہیں۔“ سادی نے کہا۔ ”میں نے قرآن پاک میں پڑھا ہے کہ شوہر اور بیوی ایک دوسرے کا لباس ہیں۔ اس سے قریبی کوئی رشتہ ہو ہی نہیں سکتا۔“

اس لمحے الٰہی بخش کو وہ بہت بے شرم لگی۔ اسے افسوس ہوا۔ اس کے ذہن میں سادی کا جو تصور تھا وہ بھی مجروح ہوا۔ لیکن اس نے حوالہ قرآن پاک کا دیا تھا۔ پھر بھی اس نے دھیرے سے کہا۔ "اللہ نے شرم وحیا کو بھی اہمیت دی ہے۔ اس کی بہت تلقین کی ہے۔ اور پھر تنہائی اور محفل کے الگ الگ آداب ہوتے ہیں۔"

"میں صرف اس بات پر اعتراض کر رہی ہوں کہ میاں بیوی کا دوسروں کے سامنے ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھنا بے شرمی تو نہیں ہوتا۔ خیر، یہ تمہارے ہاں کا قاعدہ ہے تو مجھے اس سلسلے میں کچھ نہیں کہنا چاہئے۔" یہ کہتے کہتے سادی کے لہجے میں بے رخی آ گئی۔

الٰہی بخش خاموش ہو گیا۔ اس نے صرف محبت کی تھی۔ اگر سادی کو پانے کی آرزو کی ہوتی تو کچھ اسے سمجھانے کی، کچھ خود سمجھنے کی کوشش بھی کرتا۔ لیکن ایک تو وہ جانتا تھا کہ وہ زمین پر کھڑا ہے۔ جبکہ سادی آسمان پر چمکنے والا چاند ہے۔ جس سے وہ باتیں کر سکتا ہے، جسے وہ دیکھ سکتا ہے لیکن اس تک پہنچ نہیں سکتا۔ اسے ہاتھ بڑھا کر چھو نہیں سکتا۔ دوسرے اسے جس عشق کی گھٹی پلائی گئی تھی، اس میں صلے اور معاوضے کا کوئی تصور نہیں تھا۔

سعدیہ نے اس کی خاموشی کو ناراضی پر محمول کیا۔ وہ بولی "ناراض ہو گئے کیا؟"

"نہیں سادی بی بی، آپ سے میں کبھی ناراض نہیں ہو سکتا۔ آپ کچھ بھی کہہ لیں۔ کچھ بھی کر لیں۔"

"بہت بڑی بات کہہ رہے ہو۔ کبھی ایسا ہوا تو یاد ضرور دلاؤں گی۔"

"ایسا کبھی نہیں ہو گا سادی بی بی!" الٰہی بخش نے بڑے اعتماد سے کہا۔

"چلو...... دیکھیں گے۔"

ایک اور موقع پر سادی نے اس سے پوچھا۔ "تمہاری بیوی بھی تمہارے ساتھ ایسے ہی رہے گی، جیسا تمہارا قاعدہ ہے؟"

"جی سادی بی بی۔ آدمی اپنے ہاں کے رواج تو نہیں توڑ سکتا۔"

سعدیہ کچھ دیر سوچتی رہی۔ "اور جو تمہاری شادی کسی شہری لڑکی سے ہو گئی تو؟"

الٰہی بخش کی نظریں بے ساختہ اٹھیں۔ اس نے عقب نما میں دیکھا۔ سادی پہلے ہی اسے دیکھ رہی تھی۔ ایک لمحے کو دونوں کی نظریں ملیں۔ پھر الٰہی بخش سامنے دیکھنے لگا۔

"تم نے جواب نہیں دیا۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے سادی بی بی۔"

"ہو کیوں نہیں سکتا۔ کہتے ہیں، جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔ پر میرے ساتھ ایسا نہیں ہو سکتا۔"

"کیوں؟ تمہارے ساتھ کیوں نہیں ہو سکتا۔"

"بس میرا دل بتاتا ہے کہ میرے ساتھ ایسا نہیں ہو گا۔" الٰہی بخش نے پوری سچائی سے کہا۔ اس کا دل واقعی یہی کہتا تھا۔

"اور فرض کرو، ایسا ہو گیا۔ پھر؟"

الٰہی بخش چند لمحے سوچتا رہا۔ پھر بولا۔ "تو اس لڑکی کو میرے لئے دیہاتی بننا ہو گا۔"

"حالانکہ تمہیں اس کی خاطر شہری بن جانا چاہئے۔" سادی نے کہا "سوچتی ہوں تم شہری بن کر کیسے لگو گے۔"

"کیسا بھی نہیں لگوں گا۔ اس لئے کہ بنوں گا ہی نہیں۔" الٰہی بخش نے بریک لگاتے ہوئے کہا۔ گاڑی کالج کے گیٹ کے سامنے رک گئی۔

"اچھا الٰہی بخش، خدا حافظ۔ ایک بجے۔"

"ٹھیک ہے سادی بی بی، خدا حافظ۔"

☆

الٰہی بخش موجودہ وقت کا تقابل اس وقت سے کرتا، جب اس نے سادی کو دیکھا تھا، اس سے ملا نہیں تھا تو اسے محسوس ہوتا کہ وہ بڑے خسارے میں ہے۔ اب سادی اس کی نظروں کے سامنے ہوتی تھی، بہت قریب بھی ہوتی تھی۔ مگر اس سرشاری کی وہ کیفیت نہیں ہوتی تھی۔ جس میں اسے کچھ بھی یاد نہیں رہتا تھا، جس میں بھوک پیاس کا احساس بھی مٹ جاتا تھا۔ کوئی تکلیف تکلیف نہیں رہتی تھی۔ وہ خوش رہتا تھا۔ خوش اور مست و بے خود۔

اب اس کی سمجھ میں آ رہا تھا کہ قربت محبت کو کم کر دیتی ہے۔ محبوب نظروں کے سامنے نہ ہو تو اس کا تصور بڑا ہوتا ہے۔ اس میں صرف خوبیاں ہی خوبیاں ہوتی ہیں۔ اس کی خامیوں کا علم نہیں ہوتا۔ لہٰذا اس کا مرتبہ بلندی رہتا ہے۔

تو کیا سادی کا مرتبہ کم ہو گیا ہے؟ اس نے سوچا اور اس سوال پر دیر تک سوچتا رہا۔ سادی کا مرتبہ کم نہیں ہوا تھا۔ مگر یہ تھا کہ پہلے وہ عام انسان نہیں لگتی تھی۔ جیسے کوئی خاص ہستی ہو آسمان سے اتری ہوئی۔ اب وہ ایک لڑکی لگتی تھی، جس پر وہ نکتہ چینی بھی کر سکتا تھا۔

الٰہی بخش خود کو ٹٹولتا رہا۔ سادی بہت اچھی، بہت پیاری لڑکی تھی۔ مگر اسے یہ بات اچھی نہیں لگی تھی کہ وہ بے حجابانہ اس سے وہ گفتگو بھی کر لیتی تھی، جو اس کے خیال میں معیوب تھی۔ بلکہ شاید وہ اس سے ہر موضوع پر بات کر سکتی تھی۔ جبکہ ایسا صرف دوستوں کے درمیان ہو سکتا ہے۔

یہ سوچتے ہوئے الٰہی بخش کو خیال آیا کہ وہ ایک اہم بات نظر انداز کر رہا ہے۔ یہ اپنی اپنی تربیت، اپنے ماحول اور اپنی سوسائٹی کے رسم رواج کی بات ہوتی ہے کہ کیا معیوب ہے اور کیا نہیں۔ اس بنیاد پر کوئی کسی پر بے شرمی کا فتویٰ نہیں لگا سکتا۔ یوں تو سادی بھی اس پر اعتراض کر سکتی ہے۔ مثلاً یہاں بیت الخلا ہر گھر میں ہوتا ہے۔ جبکہ گاؤں میں رفع حاجت کے لیے لوگ باہر جاتے ہیں۔ شہر کے لوگ اسے بے شرمی قرار دیں گے۔ ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئے گی کہ اتنی زمین ہوتے ہوئے گھر میں بیت الخلا کی گنجائش کیوں نہیں نکالی جا سکتی ہے۔

پھر اسے ایک اور خیال آیا۔ ہزارے میں نوکروں کے ساتھ ایسا سلوک بھی نہیں ہوتا۔ اتنی بے تکلفی سے بات کرنا تو دوسری بات ہے، کوئی نوکر کو اپنے پاس بھی نہیں بٹھاتا۔ نوکروں کو منہ ہی نہیں لگایا جاتا۔ تو جب یہ بات ہزارے سے متصادم ہونے کے باوجود اسے بری نہیں لگتی تو دوسری باتیں بھی بری نہیں لگنی چاہئیں۔

پھر اسے ایک اور خیال آیا۔ اسے سادی سے محبت ہے۔ بلکہ عشق ہے۔ تو عشق انساں کی خوبیوں سے نہیں، خود انسان سے ہونا چاہئے۔ سادی کی بدترین برائی سے بھی اس کا دل اس کی طرف سے برا نہیں ہونا چاہئے۔ اور اس نے کوئی بار بار ارادہ تو عشق نہیں کیا۔ یہ جذبہ تو اس کے دل میں ڈالا گیا ہے۔ نہیں اسے سادی کو کسی قیمت پر برا نہیں سمجھنا چاہئے اور پھر کون جانے، یہ کتنے دن کا ساتھ ہے۔ اسے تو بس سادی کو خوش کرنا چاہئے۔

قریب آنے سے ایک نقصان اور ہوا تھا۔ پہلے وہ آنکھیں موندتا تو وہ اس کے سامنے آ کھڑی ہوتی تھی۔ گھنٹوں وہ اس سے باتیں کرتا تھا۔ باتیں تو وہ اب بھی کرتی تھی اس سے۔ لیکن اس میں وہ لذت نہیں تھی۔ پہلے وہ کم سوتا تھا۔ سوتا تھا تو وہ اس کے خواب میں ضرور آتی تھی۔ اب وہ پہلے کی طرح سوتا تھا۔ زیادہ تر خوابوں سے محروم نیند صبح سو کر اٹھنے میں بھی وہ لذت نہیں رہی تھی۔

الٰہی بخش اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ محرومی بڑی ہے۔ پھر اسے خیال آیا کہ وہ ناشکرا پن کر رہا ہے۔ باپ ہمیشہ اسے یہی تو سمجھاتا تھا کہ شکر گزاری نہ چھوڑو۔ شکر گزاری ہے تو عشق بھی کر سکتے ہو۔ وہ دل ہی دل میں توبہ کرنے لگا۔ اسے تو وہ ملا تھا جو اس کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا۔

اس کے وجود میں شکر گزاری موج در موج امڈنے لگی۔ اتنے عرصے میں پہلی بار اس نے وہ سرشاری محسوس کی، جو مہینوں اس کا معمول رہی تھی۔

☆

اس روز سعدیہ کسی گہری سوچ میں گم تھی۔ الٰہی بخش نے کئی بار نظریں اٹھا کر عقب نما شیشے میں دیکھا۔ لیکن وہ سوچ میں گم رہی۔ وہ بھی پوری طرح ڈرائیونگ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ لیکن اس کا دل پریشان ہو گیا۔ سادی پریشان تھی۔ لیکن کیوں؟

اچانک سعدیہ نے اسے پکارا۔ ''الٰہی بخش ایک بات پوچھوں۔ سچ سچ بتاؤ گے۔''

''سادی بی بی ..... میں کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔'' الٰہی بخش نے سنجیدگی سے کہا۔

''لیکن کبھی جھوٹ نہ بولنے والے بھی جھوٹ بولنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔''

''پتا نہیں، میرے ساتھ تو آج تک ایسا نہیں ہوا۔ خیر آپ پوچھیں۔''

''تم نے کبھی محبت کی ہے کسی سے؟''

''میں تو نسلی عاشق ہوں سادی بی بی!'' الٰہی بخش نے عقب نما شیشے میں دیکھا۔ سادی حیران نظر آ رہی تھی۔ ''کیا بات ہے۔ آپ کو اتنی حیرت کیوں ہوئی؟'' اس نے پوچھا۔

''مجھے اس جواب کی توقع نہیں تھی..... اور وہ بھی ان الفاظ میں۔''

''جو سچ تھا، ویسے ہی کہہ دیا۔''

''ذرا وضاحت تو کرو۔''

''ہماری نسل ہی محبت کرنے والی نسل ہے۔'' الٰہی بخش نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''ابا بچپن ہی سے مجھے عشق کی تلقین کرتے تھے۔ لیکن مجھے عشق نہیں ہوا۔ میں عشق سے لڑتا رہا۔ مجھے عشق برا لگتا تھا۔''

سادی اب بھی حیران نظر آ رہی تھی۔ الٰہی بخش نے وضاحت کرتے ہوئے اسے اپنے جدی عشق کے بارے میں بتایا۔

''پہلے تم نے کہا کہ تم نسلی عاشق ہو۔ پھر تم نے کہا کہ تم عشق سے لڑتے رہے۔ یہ تو متضاد بات ہے۔''

''ہاں سادی بی بی، میں لڑتا رہا۔ مگر اب میری سمجھ میں عشق آنے لگا ہے۔ اب میں محبت کرنے لگا ہوں۔''

''کس سے؟''

''مجھے ہر انسان سے محبت ہے سادی بی بی، میں نے سمجھ لیا ہے کہ اللہ سے عشق کرنے کی یہی صورت ہے۔''

''پھر بھی یہ بتاؤ، کس سے محبت کرتے ہو تم؟''

''میں نے بتایا نا، ہر انسان سے، ماں باپ سے، بہن بھائیوں سے، رشتے داروں سے، آپ کے پاپا سے، کرمو چاچا سے، اظہر سے، آپ کی امی سے..... سب سے سادی بی بی۔''

''اِدھر دیکھو'' سادی نے کہا۔ الٰہی بخش نے عقب نما شیشے میں دیکھا۔ ''تم نے میرا نام نہیں لیا۔ اس کا مطلب ہے، میں بالکل اچھی نہیں ہوں۔''

الٰہی بخش نے نظریں جھکا لیں۔ ''کسی کے منہ پر یہ کہنا جھوٹا لگتا ہے۔ اس لئے میں نے آپ کا نام نہیں لیا تھا۔''

''تو تم مجھے اچھا سمجھتے ہو۔ مجھ سے محبت کرتے ہو؟''

''جی سادی بی بی!''

سادی شیشے میں اس کے عکس کو بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ ''ایک بات اور۔ آدمی ہر کسی سے برابری کی محبت تو نہیں کرتا، کسی سے کم، کسی سے زیادہ ہوتا ہے، یہ بتاؤ، میرا کون سا نمبر ہے۔ مجھ سے کتنی محبت کرتے ہو تم؟''

''یہ بتانا تو ناممکن ہے بی بی، محبت آدمی نہ من سیر چھٹانک میں کرتا ہے، نہ گز فٹ، انچ میں۔ سچ یہ ہے کہ میں خدا اور اس کے پیارے رسولؐ سے عشق کرنا چاہتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ انسان تو بس سیڑھیاں ہیں۔''

سادی نے دیکھا تھا کہ اس کی محبت کے نام پر الٰہی بخش کے چہرے پر رنگ دوڑ گیا تھا۔ ''یہ باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔'' اس نے کہا۔ ''اور میں اس محبت کی بات بھی نہیں کر رہی تھی......''

''محبت تو بس محبت ہوتی ہے ـــــ کسی سے بھی ہو۔'' الٰہی بخش نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔

''میں پوچھ رہی ہوں کہ تم نے کبھی کسی لڑکی سے بھی محبت کی ؟''

''ایک بات کہوں، برا تو نہیں مانیں گی سادی بی بی؟''

''کہو۔''

''یہ تو بہت ذاتی نوعیت کی بات ہے۔ نہ تو کسی سے پوچھتے ہوں، نہ کسی کو بتاتے ہیں۔ اور آپ کو مجھ سے ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔''

''کیوں۔ کیا حرج ہے اس میں۔''

''بس یہ اچھی بات نہیں۔''

''میں تو بس سمجھنا چاہ رہی ہوں کہ محبت کیسی ہوتی ہے۔ تم نے منع کیا ہے تو آئندہ ایسی بات نہیں کروں گی۔''

الٰہی بخش نے شیشے میں اسے غور سے دیکھا۔ ''برا تو نہیں مانیں آپ؟''

''نہیں، غلط بات پر تم مجھے ٹوک سکتے ہو۔ یہ حق میں نے تمہیں دیا ہے۔''

الٰہی بخش حیرت میں ڈوب گیا۔

☆

''گڈ مارننگ، الٰہی بخش!''

''گڈ مارننگ، سادی بی بی!''

اس صبح الٰہی بخش کو احساس ہوا کہ سادی بہت خوش ہے۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اس کی آواز میں چہکار تھی۔ وہ ادھر اُدھر کی باتیں کرتی رہیں۔

''آج آپ بہت خوش ہیں سادی بی بی؟'' الٰہی بخش نے پوچھا۔

''میں ہر صبح بہت خوش ہوتی ہوں۔''

''لیکن آج ہمیشہ سے زیادہ خوش ہیں۔''

''ہاں، آج موسم بہار کا پہلا گلاب کھلا ہے۔''

الٰہی بخش کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں بھینچ لیا۔ اسے یاد ہی نہیں تھا۔ کب سے اسے گھر یاد نہیں آیا تھا۔ نہ گھر، نہ اپنے علاقے کے موسم۔ فٹ پاتھ پر تھا تو وہ ہمیشہ ایبٹ آباد کو یاد کرتا رہتا ہے۔ اب... اب اسے خیال بھی نہیں آیا کہ بہار آ گئی ہے۔

''کیا بات ہے، تم اداس ہو گئے۔''

''بہار نے اداس کر دیا ہے۔ کاش... میں اپنی طرف کی بہار آپ کو دکھا سکتا۔ ہمارے ہاں بہت بڑے گلاب کھلتے ہیں۔ ایسے کہ ہاتھوں کے پیالے کو ایک ہی گلاب بھر دے۔''

تمہیں گھر یاد آتا ہے تو چھٹی لے کر کچھ دن کے لئے چلے کیوں نہیں جاتے۔''

''دل ہی نہیں چاہتا جانے کو۔''

کچھ دیر خاموش رہی۔ پھر سادی نے کہا۔ "میری ایک بات مانو گے۔"

"کیوں نہیں۔ آپ کہیں تو۔"

"مجھے ڈر ہے کہ نہیں مانو گے اور شدید برا بھی مان جاؤ گے۔"

اس پر الٰہی بخش چوکنا ہو گیا۔ "میں تو نوکر آدمی ہوں سادی بی بی، پھر ایسی کوئی بات ہے تو مجھ سے کہیں ہی نہیں۔"

"کہنی بھی ضروری ہے۔"

"ذرا گاڑی سائیڈ میں روکو۔" سادی نے فرمائش کی۔

الٰہی بخش نے موقع دیکھ کر گاڑی ایک طرف لگا دی۔ لیکن وہ اندر ہی اندر پریشان تھا کہ ایسی کون سی بات ہے، جس کے لئے گاڑی رکوائی گئی ہے۔ "جی سادی بی بی؟" اس نے شیشے میں سدی کے عکس کو دیکھتے ہوئے کہا۔

سادی نے اپنے پرس میں سے کچھ نوٹ نکالے اور اس کی طرف بڑھائے "یہ لو، اس کے بعد میں تم سے کچھ کہوں گی۔"

الٰہی بخش نے بے ساختہ ہاتھ بڑھا کر نوٹ تھام لئے۔ مگر پھر وہ پرسکون ہو گیا۔ "یہ... کس لئے سادی بی بی؟"

"میں چاہتی ہوں کہ تم بہت اچھی پینٹ شرٹ، بہت اچھے شوز خریدو۔ میں چاہتی ہوں کہ کل صبح تم نئے کپڑے پہن کر باہر آؤ۔"

الٰہی بخش کے چہرے کی رنگت متغیر ہو گئی "سادی بی بی، پیسے میرے پاس بھی ہیں۔ پوری تنخواہ بچ جاتی ہے میری۔ کوئی خرچ ہے ہی نہیں۔"

"میں جانتی ہوں، لیکن یہ میری خواہش ہے۔"

"مجھے افسوس ہے سادی بی بی، یہ میں نہیں کر سکتا۔" الٰہی بخش نے نوٹ پچھلی سیٹ پر گرا دیئے۔

"کیوں نہیں کر سکتے؟"

"میں نے قمیص پتلون کبھی پہنی نہیں۔ مجھے عجیب سا لگے گا۔ تماشا بننے کا احساس ہو گا مجھے۔ یہ مجھ سے نہیں ہو گا سادی بی بی۔"

"مان جاؤ نا!"

"نہیں مان سکتا سادی بی بی، آپ یہ پیسے رکھ لیں" الٰہی بخش نے عاجزی سے کہا۔

"اتنی سی بات میری نہیں مان سکتے؟" سادی روہانسی ہو گئی۔

"میں مجبور ہوں سادی بی بی!" یہ کہہ کر الٰہی بخش نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

اس کے بعد پورے راستے خاموشی رہی۔ کالج آنے پر سادی اتری اور اس نے معمول کے مطابق الٰہی بخش کو خدا حافظ کہا۔ لیکن اس کا لہجہ بجھا بجھا سا تھا۔

واپس آتے ہوئے خود الٰہی بخش بہت دل گرفتہ تھا۔ یہ احساس اسے ستا رہا تھا کہ اس نے سادی بی بی کا دل دکھایا ہے۔ بات اتنی بڑی بھی نہیں تھی۔ بس وہ بوفق نہیں بننا چاہتا تھا اور وہ یوں بجھ گئی تھی، جیسے اس کے انکار سے اسے دلی تکلیف ہوئی ہو۔

اس روز وہ دس منٹ پہلے ہی کالج پہنچ گیا۔ وہ گاڑی کے باہر کھڑا انتظار کرتا رہا۔ سادی بی بی آئی تو اس نے اس کے لئے دروازہ کھولا۔ سادی خاموشی سے گاڑی میں بیٹھ گئی۔ الٰہی بخش نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنے کے بعد عقب نما شیشے میں دیکھا۔ لیکن سادی کا چہرہ اسے نظر نہیں آیا۔ بالآخر الٰہی بخش سے رہا نہیں گیا۔ "سادی بی بی، ناراض ہیں مجھ سے؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں الٰہی بخش ناراضی کیسی۔ ہر شخص اپنی مرضی کا مالک ہوتا ہے۔"

"میں تو زندگی میں کبھی اپنی مرضی نہیں کر سکا۔" الٰہی بخش نے تلخی سے سوچا۔ تو اب اس کے ساتھ کیا اپنی مرضی کرنی، جس سے دل کا، روح کا رشتہ جڑا ہے۔ اس نے بریک لگاتے ہوئے گاڑی سائیڈ میں روک دی۔ پھر اس نے پلٹ کر کہا۔ "لایئے... آپ کی خوشی کی خاطر میں آپ کی بات

مانوں گا۔“

”یہ تو زبردستی والی بات ہوئی۔“ سادی نے افسردگی سے کہا۔ ”میں تو تمہیں خوش دیکھنا چاہتی تھی۔“

الٰہی بخش کو شرمندگی ہوئی۔ واقعی، یہی بات ہنسی خوشی مان لینے میں کیا برائی تھی۔ ”سادی بی بی، میں شرمندہ ہوں۔“ اس نے دھیرے سے کہا ”اور یقین کریں، میں خوشی سے یہ بات مان رہا ہوں۔“

اسی وقت الٰہی بخش کی نظر پڑی۔ روپے پچھلی سیٹ پر وہیں پڑے تھے، جہاں اس نے گرائے تھے۔ سادی نے انہیں چھوا بھی نہیں تھا۔ اور خود اس نے بھی دھیان نہیں دیا تھا۔ سادی نے پیسے اٹھا کر اسے دیئے۔ اس نے بغیر گنے جیب میں رکھ لئے۔

باقی سفر میں بھی سادی اسی جگہ بیٹھی رہی، الٰہی بخش کو احساس تھا کہ وہ اب بھی ناراض ہے، لیکن گھر پہنچ کر گاڑی سے اترنے سے پہلے سادی نے کہا۔ ”شکریہ الٰہی بخش!“ الٰہی بخش کھل اٹھا۔ اسے لگا کہ اس سے کوئی گناہ سرزد ہوا تھا۔ اور اب اس کا کفارہ قبول کر لیا گیا ہے۔

☆

پینٹ شرٹ کی خریداری الٰہی بخش کے لئے بڑا مسئلہ تھا۔ اس کا اسے تجربہ نہیں تھا۔ سادی کا خیال نہیں ہوتا تو وہ خالی ہاتھ ہی واپس آ جاتا۔

اگلی صبح اس کے لئے آزمائش کی صبح تھی۔ وہ دیر تک گاڑی صاف کرتا رہا۔ سادی کے آنے سے دس منٹ پہلے وہ اپنے کوارٹر میں گیا اور کپڑے بدل کر یوں باہر نکلا، جیسے کہیں چوری کر کے آ رہا ہو۔ اس نے چوروں ہی کی طرح اِدھر اُدھر دیکھا۔ اتفاق سے کرم چاچا بھی موجود نہیں تھا اور سادی آ چکی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ پہلے آئی تھی۔

وہ اسے دیکھ کر مسکرائی۔ ”السلام علیکم الٰہی بخش!“ یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے سلام کیا تھا، کیا یہ کوئی خاص دن ہے۔ الٰہی بخش نے سوچا۔

”وعلیکم السلام بی بی!“ الٰہی بخش نے اس کے لئے دروازہ کھولا۔

”سالگرہ مبارک الٰہی بخش!“ سادی نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

الٰہی بخش کی سمجھ میں پہلے تو کچھ بھی نہیں آیا اور جب بات سمجھ میں آئی تو اسے زبردست ذہنی جھٹکا لگا۔ اس نے تاریخ یاد کرنے کی کوشش کی لیکن اسے کچھ یاد نہ آیا۔ بالآخر اس نے سادی سے پوچھا۔ ”آج کیا تاریخ ہے سادی بی بی!“

”22 اپریل۔“

الٰہی بخش کو حیرت ہوئی۔ یہ واقعی اس کی سالگرہ کا دن تھا۔ اسے خود یاد نہیں رہا تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ جہاں کا تھا، وہاں نخروں چونچلوں کو اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔ پھر بھی اسے بہت اچھا لگا کہ سادی نے اسے، تنی اہمیت دی۔ مگر حیرت اپنی جگہ تھی کہ سادی کو معلوم کیسے ہوا۔

اس نے یہ بات سادی سے ہی پوچھ لی۔

”تم نے ہی بتائی تھی یہ تاریخ۔“

”میں نے۔“ الٰہی بخش نے حیرت سے کہا۔

”ہاں، میں تم سے تمہارے متعلق پوچھتی رہتی ہوں۔ مجھے تو بہت کچھ معلوم ہے تمہارے بارے میں۔ تمہارا پتا بھی ہے میرے پاس۔“

الٰہی بخش کو احساس ہوا کہ وہ بہت زیادہ باتیں کرتا رہا ہے۔ لیکن نہیں ... باتیں تو سادی کرتی تھی۔ بلکہ وہ سوال بہت کرتی تھی ... وہ بس جواب دیتا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ واقعی اس کے بارے میں بہت کچھ جانتی ہے یعنی ... یعنی وہ اس کی پروا کرتی ہے۔

اس پر الٰہی بخش نے دل ہی دل میں خود کو ڈپٹ دیا۔ خوش فہمی پالنے کی اس کے پاس گنجائش نہیں تھی۔ زمین اور آسمان کبھی نہیں ملتے۔ ہاں، آسمان نوازش کے بادلوں سے زمین کی سیرابی کا سامان ضرور کرتا رہتا ہے۔

اس روز دونوں چپ تھے۔ اپنی اپنی سوچ میں گم۔ لیکن پھر بھی نہ جانے کیوں، وہ خاموشی خاموشی نہیں لگ رہی تھی۔

الٰہی بخش نے گاڑی روکی۔ سادی نے اترنے سے پہلے اسے خوب صورت پھول دار کاغذ میں لپٹا ہوا ایک پیکٹ دیا۔ ''یہ تمہاری سالگرہ کا تحفہ ہے۔''

''شکریہ سادی بی بی، لیکن اس کی ضرورت نہیں تھی۔ آپ نے میری سالگرہ یاد رکھی۔ ورنہ ہم لوگ خود بھی اپنی سالگرہ یاد نہیں رکھتے۔''

''تحفوں کی اپنی ایک اہمیت ہوتی ہے الٰہی بخش۔'' سادی نے کہا ''تحفوں سے محبت بڑھتی ہے۔''

یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔ الٰہی بخش اس بات پر غور کرتا رہا۔ ''ٹھیک کہتی ہو سادی بی بی، اس لئے تو اللہ اپنے بندوں کو تحفوں سے نوازتا رہتا ہے لیکن بندوں کی محبت تو نہیں بڑھتی پھر بھی۔ کم از کم میرے جیسے بدنصیب بندوں کی۔''

پہلی بار باپ کی بات کا مفہوم اس کی سمجھ میں آیا تھا۔

☆

دوپہر کو وہ سادی کو کالج سے واپس لایا تو بیگم صاحبہ ان کے باہر کھڑی کرمو سے کچھ بات کر رہی تھیں۔ انہوں نے الٰہی بخش کو جو اس حلیے میں دیکھا تو ان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ پھر ان کی پیشانی پر شکنیں ابھر آئیں۔ ''یہ تم ہو الٰہی بخش۔ ادھر تو آؤ ذرا۔'' انہوں نے پکارا۔

الٰہی بخش سمجھ گیا کہ عزت افزائی کے فوراً بعد بے عزتی کا لمحہ بھی آ گیا ہے۔ یہ بھی رب کی عنایت ہے کہ سر غرور سے اٹھنے نہ پائے اور سر میں کوئی سودا کچھ جگہ نہ بنائے۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا بیگم صاحبہ کی طرف بڑھا۔

''یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے الٰہی بخش؟'' بیگم صاحبہ نے کڑے لہجے میں اس سے پوچھا۔

''میں سمجھا نہیں بیگم صاحبہ؟''

''پینٹ شرٹ پہن کر بابو بننے کا شوق کب سے ہو گیا تجھے؟'' بیگم صاحبہ نے زہریلے لہجے میں کہا۔

''مجھے ایسا کوئی شوق نہیں ...... نہ کبھی ہو گا۔ لیکن ......'' الٰہی بخش کا لہجہ سخت ہونے لگا۔

اسی وقت کتابیں ہاتھ میں لئے سادی بھی آ گئی۔ ''کیا بات ہے امی؟''

الٰہی بخش نے سر گھما کر اسے دیکھا۔ وہ اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ اس کی نگاہوں میں التجا تھی۔ الٰہی بخش موم ہو گیا۔

''تمہیں کیا ضرورت ہے بیچ میں بولنے کی۔'' بیگم صاحبہ سادی پر الٹ پڑیں۔

''ضرورت اس لئے ہے کہ میرا ڈرائیور ہے۔''

''میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ اس کیلئے وردی ضروری ہے۔ وردی ہو تو آدمی کو اوقات یاد رہتی ہے۔ اب تم ہی دیکھو، یہ ڈرائیور لگتا ہے کہیں سے؟''

''مجھے اس سے کوئی غرض نہیں امی، وردی کو میں نے ہی منع کیا تھا۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں، جو لباس چاہے پہنے۔ بس مجھے تماشا نہیں بننا۔''

''سادی ...... سادی ...... تم نہیں جانتیں۔ کم اوقات آدمی جب اپنی اوقات بھولتا ہے تو سر پر چڑھ کر بیٹھ جاتا ہے۔'' بیگم صاحبہ کے لہجے میں بے بسی اور جھنجلاہٹ تھی۔

''میں اپنی اوقات نہیں بھولا بیگم صاحبہ، نہ کبھی بھولوں گا۔'' الٰہی بخش نے تحمل سے کہا۔ ''مجھے یاد ہے کہ میں فٹ پاتھ پر بیٹھنے والا پینٹر ہوں۔ میں کبھی آپ کے سر نہیں چڑھوں گا۔''

''تو پھر یہ کپڑے کیوں پہنے تو نے۔ اس لباس میں سادی کی گاڑی کیوں لے کر گیا؟''

''میں کہہ رہی ہوں امی کہ مجھے انہیں کوئی اعتراض نہیں۔'' سادی نے غصیلے لہجے میں کہا'' اور الٰہی بخش صرف مجھ کو جواب دہ ہے۔ اگر آپکو اختلاف ہے تو آپ بے شک پاپا سے بات کرلیں۔ مجھے کوئی دوسرا ڈرائیور ملے گا تو پھر بھی یہی کچھ ہوگا۔ بات صرف الٰہی بخش کی نہیں۔''

''ٹھیک ہے آج اس سلسلے میں بات ہوگی۔ پھر دیکھوں گی۔ تم بھی بہت آپے سے باہر ہورہی ہو'' بیگم صاحبہ نے سادی کو لتاڑا'' اچھا اب اندر جاؤ پلیز۔''

سادی پاؤں پٹختی ہوئی اندر چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد بیگم صاحبہ الٰہی بخش کی طرف مڑیں۔'' دیکھو الٰہی بخش، یہ تمہارا روزی کا معاملہ ہے۔ میں اس میں کوئی خرابی نہیں کرنا چاہتی۔ یہ بہت گناہ کا کام ہے۔ لیکن ''

''میں بہت عاجزی سے آپ سے ایک عرض کروں'' الٰہی بخش نے ان کی بات کاٹ دی۔'' سچ یہ ہے کہ میں فٹ پاتھ کی مزدوری میں بہت خوش تھا۔ اپنی اوقات میں خوش رہنے والا بندہ جو ٹھہرا۔ اور رزق دینے والا اللہ ہے۔ آپ اس معاملے میں میرے ساتھ کوئی رعایت نہ کریں۔''

''تو پھر یہاں کیوں نوکری کررہے ہو۔ چلے جاؤ فٹ پاتھ پر'' بیگم صاحبہ نے جل کر کہا'' میں تمہیں فارغ کردیتی ہوں۔''

''بات آپ کی نہیں، صاحب کی ہے۔ صاحب جی فٹ پاتھ والوں کو عزت دینے والے ہیں۔ ان سے میں انکار نہیں کرسکتا۔ آپ ان سے بات کر کے مجھے فارغ کرادیں۔ میں ہنسی خوشی چلا جاؤں گا۔''

''بہت چالاک ہوتے ہو تم غریب لوگ۔'' بیگم صاحبہ نے زہریلے لہجے میں کہا۔'' اتنی تنخواہ چھوڑ کر ہنسی خوشی چلے جاؤ گے۔ مگر وہ بے وقوف شیخ صاحب جو مل گئے ہیں تو خوب عیش کرو۔''

الٰہی بخش کا چہرہ تمتما اٹھا۔'' تنخواہ کی بات نہیں۔ میں تین وقت کی روٹی پر بھی یہاں نوکری کرسکتا ہوں۔ صاحب جی کہہ کر تو دیکھیں۔''

''نہ وہ کہیں گے، نہ تم جاؤ گے۔''

''چلیں آج میں خود بات کرلیتا ہوں صاحب جی سے کہ مجھے آزاد کردیں۔''

بیگم صاحبہ گڑبڑا گئیں۔ جانتی تھیں کہ اس معاملے میں شیخ صاحب سخت ہوجائیں گے۔ وہ احسان ماننے والے آدمی تھے۔ ان کی خبر بھی لے لیں گے۔'' تمہیں اس کی ضرورت نہیں الٰہی بخش!'' انہوں نے نرم لہجے میں کہا۔'' بس اپنی اوقات میں رہو۔ آئندہ ان کپڑوں میں گاڑی نہ چلانا۔ اب اپنے کوارٹر میں جاؤ۔''

الٰہی بخش اپنے کوارٹر میں چلا گیا۔

☆

الٰہی بخش نے وہ پینٹ شرٹ اور جوتے اپنے صندوق میں رکھ دیے۔ اس نے عہد کیا کہ اب وہ انہیں کبھی نہیں پہنے گا۔ ایک لمحے کو اس نے سوچا کہ انہیں جلا دے۔ لیکن اس نے فوراً ہی اس خیال کو رد کر دیا۔ وہ تو ساوی کی عنایت کی نشانیاں تھیں۔ وہ تو سنبھال کر رکھنے والی چیزیں تھیں۔

اسے اس تحفے کے بارے میں بہت تجسس تھا، جو ساوی نے اسے دیا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ رات کو سوتے وقت دیکھے گا کہ ساوی نے اسے کیا دیا ہے، مگر شام تک اس کا ضبط جواب دے گیا۔ اس نے اپنے کوارٹر کا دروازہ اندر سے بند کیا اور بڑی نزاکت سے پیکٹ کے اوپری کاغذ کو کھولنے لگا۔ اس طرح کہ وہ پھٹے بھی نہیں۔

پیکٹ سے ایک کارڈ بھی منسلک تھا۔ اس پر لکھا تھا: الٰہی بخش کے لئے سالگرہ کی دلی مبارک باد اور نیک خواہشات اور خلوص و محبت کے ساتھ۔ ساوی الٰہی بخش نے کارڈ کو ایک طرف رکھ دیا۔ پھر اس نے پھول دار کاغذ بھی وہیں رکھ دیا۔

کاغذ ہٹنے کے بعد اندر سے ایک پیکٹ نکلا۔ اسے پیکٹ کو کھولا تو ایک پیکنگ برآمد ہوئی۔ پیکنگ میں ہلکے رنگ کی ایک بہت خوبصورت بوتل نکلی، جس میں زرد رنگ کا کوئی سیال بھرا ہوا تھا۔ وہ خوشبو تھی انگریزی خوشبو۔ الٰہی بخش نے بوتل کے منہ پر لگے ہوئے کور کو ہٹایا۔ وہ اسپرے تھا۔

الٰہی بخش چند لمحے محبت سے اسے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے بوتل کے ٹاپ کو دبایا۔ سیال کی پھوار اس پر گری۔ اس کا پورا کوارٹر مہک گیا۔ وہ بہت بھینی ... اور دلربا خوشبو تھی۔ الٰہی بخش نے چوروں کی طرح ادھر ادھر دیکھا۔ اسے ڈر تھا کہ خوشبو کوارٹر سے باہر نکل جائے گی لیکن وہ اسے روک بھی نہیں سکتا تھا اور بولتی باتیں کرتی وہ خوشبو کسی کے کانوں میں پڑ گئی تو ... یہ کیسا خطرناک تحفہ دیا ہے ساوی نے۔

اسے محاورہ یاد آیا کہ عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے۔ لیکن عشق کو تو اس نے بڑی کامیابی سے چھپا لیا تھا۔ کسی کو پتا نہیں چل سکا تھا کہ اسے ساوی سے عشق ہے۔ مگر اب وہ پریشان تھا کہ اس خوشبو کو چھپانا، اس کے لئے آسان نہیں تھا۔

اس نے بوتل کو کور لگا کر اس کی پیکنگ میں رکھا۔ اب وہ خوشبو کے تحلیل ہونے کا منتظر تھا۔ عشق اور عام خوشبو میں یہی فرق ہے۔ عام خوشبو تو ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن عشق کبھی ختم نہیں ہوتا۔ اسی لئے وہ بالآخر پکڑا جاتا ہے۔

مگر وہ خوشبو کچھ مختلف تھی۔ الٰہی بخش کو محسوس ہوا کہ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ خوشبو تیز ہوتی جا رہی ہے۔ جب وہ خوشبو پھیلی تو منہ بند کلی کی طرح تھی اور اب جیسے خوشبو کی وہ کلی کھل رہی تھی۔ جانے پھول بنے گی تو کیا حال ہوگا۔ الٰہی بخش نے سوچا۔

وہ خوشبو میں گھرا بیٹھا خوشبو کے تحلیل ہونے کا انتظار کرتا رہا۔ جانے کتنی دیر ہو گئی۔ اسے احساس بھی نہیں ہوا کہ شام ڈھل چکی ہے اور کوارٹر میں اندھیرا ہو گیا ہے۔ پھر دروازے پر ہونے والی ہلکی سی دستک نے اسے چونکا دیا۔ وہ اس چور کی طرح گھبرا گیا، جسے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا گیا ہو۔ وہ سوچ میں پڑ گیا کہ اس تحفے کو کہاں چھپائے۔ گھبراہٹ میں کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

دروازے پر دوبارہ دستک ہوئی۔

الٰہی بخش نے پھول دار کاغذ، کارڈ اور پیکنگ کو جلدی جلدی بکس میں رکھا۔ اتنی دیر میں دروازے پر تیسری دستک ہو چکی تھی۔ بکس بند کر کے وہ اٹھا تو اسے یہ احساس ہوا کہ خوشبو کی آواز تو اور تیز ہو گئی ہے۔ وہ خوشبو کی شیشی تو چھپ سکتا ہے لیکن اس خوشبو کا گلا تو نہیں گھونٹ سکتا، جو پورے کوارٹر میں پھیلی ہوئی تھی۔ وہ دروازے پر گیا۔ چوتھی دستک نسبتاً بلند تھی۔ ''کون ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''دروازہ کھولو۔ میں ہوں ساوی۔''

الٰہی بخش کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ ساوی ... اور یہاں! وہ پتھر کا بت بن گیا۔ ساکت و جامد!

''دروازہ کھولو الٰہی بخش!''

الٰہی بخش نے دروازہ کھول دیا۔ ساوی ہوا کے جھونکے کی طرح اندر آ گئی۔ ''کیا بات ہے، سو رہے تھے؟'' اس نے پوچھا۔

''نن ... نہیں ... جج ... جی ہاں۔''

''کوارٹر میں اندھیرا کر رکھا ہے۔ لائٹ کیوں نہیں جلائی؟''

''بس آنکھ لگ گئی تھی۔''

''سوری، میں نے تمہیں ڈسٹرب کیا۔''

''ارے نہیں سادی بی بی۔ آپ بتائیں۔ کہیں چلنا ہے۔''

''نہیں، کہیں جانا نہیں ہے۔'' سادی نے کہا ''میں تم سے ملنے آئی ہو۔ اپنا کوارٹر نہیں دکھاؤ گے۔''

''کیوں نہیں سادی بی بی ... یہ آپ لوگوں ہی کا دیا ہوا ہے۔'' الٰہی بخش نے کہا۔ ''لیکن پھر بیگم صاحب کہیں گی میں اپنی اوقات بھول رہا ہوں۔''

''میں تم سے امی کی معذرت کرنے آئی ہوں۔'' سادی نے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ الٰہی بخش نے آگے جا کر لائٹ آن کر دی۔

''امی نے تمہاری بہت بے عزتی کی۔ لیکن تم مائنڈ نہ کرو۔ امی ایسی ہی ہیں۔ وہ تو پاپا کو بھی نہیں بخشتیں۔'' وہ کہتے کہتے رک گئی ''ارے ... یہ خوشبو!''

الٰہی بخش نے چوروں کی طرح نظریں جھکالیں۔

''کیسی لگی تمہیں؟''

''بہت اچھی ہے سادی بی بی!'' الٰہی بخش نے کہا۔ وہ کہنا چاہتا تھا ... مگر بولتی بہت ہے۔ لیکن اس نے یہ بات نوک زباں پر روک لی۔

''میں دراصل تم سے معافی مانگنے آئی ہوں۔'' سادی نے کہا ''میری بات ماننے کی وجہ سے تمہاری اتنی بے عزتی ہوئی ...''

''ایسی باتیں نہ کریں سادی بی بی، آپ نہیں جانتیں۔ میں نے زندگی بھر یہی کچھ دیکھا ہے، یہی کچھ بھگتا ہے۔ کراچی سے تو مجھے محبت اسی لئے ہے کہ مجھے سب سے زیادہ عزت اور محبت یہیں سے ملی ہے۔ یہاں آپ جیسے بڑے لوگوں سے بھی برابری کا احساس ملا ہے مجھے۔ ورنہ ایبٹ آباد میں، میں کیا تھا۔ جلاہے کی اولاد، جسے سادات کو بھی تعظیم دینی تھی اور خوانین کو بھی۔ میری تو اپنی نظروں میں بھی کوئی عزت نہیں تھی وہاں، آپ مجھے شرمندہ نہ کریں۔ میں نے برا نہیں مانا، کراچی میں صرف بیگم صاحبہ کا سلوک ہی ایسا ہے، جس سے مجھے گھر یاد آ جاتا ہے۔''

''پھر بھی میں تم سے شرمندہ ہوں۔''

''اب ایسی بات نہ کیجئے گا۔''

سادی اب کمرے کا جائزہ لے رہی تھی۔ ''اپنا کمرہ بہت صاف ستھرا رکھتے ہو تم۔'' اس نے ستائشی لہجے میں کہا۔ پھر وہ کتابوں کی چھوٹی سی الماری کی طرف بڑھی۔ ''ارے واہ ... کتابیں تو اچھی خاصی ہیں تمہارے پاس۔''

''بس جی سادی بی بی، یہی ایک شوق ہے میرا۔''

''اچھا شوق ہے۔ کتابوں سے دوستی ہو جائے تو آدمی تنہائی میں بھی اکیلا نہیں ہوتا۔''

''ٹھیک کہتی ہیں آپ!''

سادی وہاں کھڑی کتابوں کے عنوان دہراتی رہی ... ''سڑک واپس جاتی ہے، شکست، برف کا پھول، ایک وائلن، سمندر کے کنارے، طوفان کی کلیاں، ایک گدھے کی سرگزشت، گدھے کی واپسی، گدھا نیفا میں، درد کی نہر ... کرشن چندر بہت پسند ہیں تمہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''جی سادی بی بی، سب لکھنے والوں سے زیادہ۔''

''اور یہ اس طرف شعری مجموعے ہیں۔'' سادی بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ ''سیف الدین سیف کا خم کاکل، ناصر کاظمی کا برگ نے اور دیوان، قتیل شفائی کا گجر، ساحر لدھیانوی کا پرچھائیاں اور گاتا جائے بنجارہ ... حبیب جالب، احمد ندیم قاسمی، واہ بھئی تمہارا ذوق بہت اچھا ہے۔''

''ذوق کا تو نہیں معلوم سادی بی بی، بس شاعری مجھے بے خود کر دیتی ہے۔''

''نسلی عاشق جو ٹھہرے۔'' سادی نے اس کی بات دہرائی۔ پھر بولی ''شاعروں میں کون زیادہ پسند ہے تمہیں؟''

''پہلے ساحر بہت اچھے لگتے تھے۔ اب لگتا ہے، ناصر کاظمی نے صرف میرے لئے شاعری کی ہے۔''

نیچے ابن صفی کی کتابیں رکھی تھیں۔ سادی نے حیرت سے اسے دیکھا ''کہاں کرشن چندر، شاعری اور کہاں ابن صفی!''

''کبھی اداس ہوں، دل بوجھل ہو تو ابن صفی کو پڑھ لیتا ہوں۔ ہر ملال ڈھل جاتا ہے۔''

سادی اسے یوں دیکھ رہی تھی، جیسے پہلی بار دیکھ رہی ہو۔ کیا یہ وہی شخص ہے۔ جلا ہوا الٰہی بخش، فٹ پاتھ پر بیٹھنے والا پینٹر اور اس کا ڈرائیور۔ اس وقت الٰہی بخش کا چہرہ اسے بہت روشن لگ رہا تھا، وہ سوچ رہی تھی ایسے تو پڑھے لکھے، دولت مند خاندانی لوگ بھی نہیں ہوتے۔

الٰہی بخش نے اس کی نظروں کی تپش سے گھبرا کر نظریں جھکالیں۔

سادی کی توجہ ایک کتاب نے کھینچ لی۔ پہلی بارش۔ ناصر کاظمی، اس نے کتاب باہر نکالی۔ کتاب کو دیکھنے کے بعد وہ بولی۔ ''کیسی خوبصورت کتاب ہے۔''

''جی ہاں، صرف خوب صورت چھپی نہیں ہے۔ شاعری بھی خوب صورت ہے۔ اب تک مجھے سب سے اچھی یہی کتاب لگی ہے۔''

''تم نے پڑھی ہے؟''

''جی ہاں، پڑھی تو ہے، لیکن ابھی تک غزل کا پہلا شعر تک نہیں سمجھ سکا ہوں۔ لگتا ہے، اسے سمجھنے میں پوری زندگی لگے گی۔''

سادی کے دل میں اشتیاق پیدا ہوا۔ اس نے پہلی غزل نکال لی اور بہ آواز بلند مطلع پڑھا ''میں نے جب لکھنا سیکھا تھا۔ پہلے تیرا نام لکھا تھا۔ واہ۔ بہت اچھا شعر ہے۔ لیکن الٰہی بخش، یہ مشکل تو نہیں کہ اسے سمجھ نہ سکو۔''

''لفظوں کا معاملہ تو آسان ہے۔ میں اس شعر کی روح کو سمجھنا چاہتا ہوں۔''

''مجھے تو یہ شعر بہت سادہ اور آسان لگا ہے۔''

''تو مجھے سمجھا دیجئے۔''

سادی سوچ میں پڑ گئی۔ پھر بولی۔ ''اب سمجھ میں آتا ہے کہ سمجھنے سے زیادہ کسی کو سمجھانا مشکل ہے۔ ویسے میرا خیال ہے کہ شاعر کا اشارہ اپنے محبوب کی طرف ہے۔''

''یہ تو میں بھی سمجھتا ہوں۔ لیکن میری تسلی نہیں ہوتی۔ یہ کون سے محبوب کی بات ہو رہی ہے، یہ سمجھ میں نہیں آتا۔ ویسے سادی بی بی، یہ پہلی بارش مسلسل غزل ہے۔ یوں کہئے کہ غزل کا جسم ہے اور روح نظم کی ہے۔ لہٰذا، الگ سے ایک شعر کو سمجھنے کے بجائے ملا کر سمجھنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ دیکھیں تو۔

میں نے جب لکھنا سیکھا تھا
پہلے تیرا نام لکھا تھا
میں وہ اسم عظیم ہوں، جس کو
جن و ملک نے سجدہ کیا تھا
میں وہ صبر صمیم ہوں جس نے
بار امانت سر پہ لیا تھا
تو نے کیوں مرا ہاتھ نہ پکڑا
میں جب رستے سے بھٹکا تھا
پہلی بارش بھیجنے والے
میں ترے درشن کا پیاسا تھا

سادی بڑی توجہ سے سن رہی تھی۔ الٰہی بخش کی آواز میں۔ اس کی لہجے میں نہ جانے کیا تھا کہ سادہ سے وہ اشعار دل میں اترتے جارہے تھے۔ ذہن میں ایسے سوال، ایسے اسرار ابھار رہے تھے، جنہیں وہ کچھ بھی نہیں پا رہی تھی۔

اچانک اسے احساس ہوا کہ اس کے سامنے ایک بالکل مختلف الٰہی بخش کھڑا ہے۔ وہ اب محض وجیہہ اور خوبرو دیہاتی نہیں، ایک خوبصورت اور معصوم روح کا، لک ایک عالم بھی تھا، جس کا سینہ علم عشق سے معمور تھا!

''اسم عظیم تو سمجھ میں آتا ہے، سادی بی بی'' الٰہی بخش کھوئے ہوئے لہجے میں کہہ رہا تھا ''لیکن یہ صبر صمیم کیا ہے۔ اور بار امانت کیا ہے؟''

سادی کو محسوس ہوا کہ ان سوالوں کے جواب اسے بھی کھو چکے ہیں۔ ''الٰہی بخش یہ کتاب مجھے دو گے۔ میں اس کا مطالعہ کرنا چاہتی ہوں۔''

''کیوں نہیں، لے جایئے'' الٰہی بخش نے بدستور کھوئے ہوئے لہجے میں کہا۔

''دو تین دن میں واپس دے دوں گی۔''

الٰہی بخش بری طرح چونکا ''یہ تو میرے خیال میں اس کتاب کی توہین ہے۔'' وہ بولا ''ایک بات کہوں، آپ برا تو نہیں مانیں گی؟''

''کہو، میں برا نہیں مانوں گی۔''

''یہ کتاب اس وقت نہ لے کر جایئے۔ میں کل آپ کو یہ کتاب دے دوں گا۔''

''ٹھیک ہے۔ اس میں برا ماننے کی تو کوئی بات نہیں۔'' سادی نے کہا۔ ''اچھا، الٰہی بخش، اب میں چلتی ہوں۔ شب خیر۔''

''شب بخیر سادی بی بی۔''

وہ چلی گئی تو الٰہی بخش کو اپنا کوارٹر ویران لگنے لگا، جیسے بہار آ کر رخصت ہو گئی ہو۔ لیکن خوشبو کی آواز بلند ہو گئی تھی۔ وہ اپنے شباب پر تھی۔

☆

اگلے روز الٰہی بخش سادی کو کالج چھوڑ کر آیا اور ناشتہ کرنے کے بعد باہر چلا گیا۔ واپس آیا تو وہ کرم دین کے کوارٹر میں چلا گیا۔ کرم دین کئی دن سے کہہ رہا تھا کہ گھر بھیجنے کے لئے خط لکھوانا ہے۔ الٰہی بخش نے اس کا خط لکھ دیا۔

دوپہر کو وہ سادی کو کالج سے لینے کے لئے گیا تو بہت خوش اور مطمئن تھا۔ سادی آئی۔ اس نے دروازہ کھولا۔ سادی بیٹھ گئی۔ الٰہی بخش نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنے کے بعد ڈیش بورڈ پر رکھا ہوا لفافہ اٹھایا اور پلٹ کر سادی کی طرف بڑھایا۔ ''یہ لیجئے سادی بی بی!''

سادی نے کچھ کہے بغیر لفافہ لیا اور اس میں موجود چیز نکالی۔ وہ ناصر کاظمی کا شعری مجموعہ پہلی بارش تھا۔ وہ کھل اٹھی۔

''یہ آپ کی کتاب ہے۔ آپ کے لئے'' الٰہی بخش نے کہا ''آپ کو تحفہ دینے کی تو میری اوقات نہیں۔ جو چاہیں سمجھ لیں۔''

''واہ۔ میں تو اسے تحفہ ہی سمجھوں گی۔'' سادی نے کہا ''اور یہ اوقات والی باتیں نہ کیا کرو مجھ سے۔''

''حقیقت تو حقیقت ہی ہے سادی بی بی، اور میں اسے بدلنا بھی نہیں چاہتا۔''

''میں تمہارا شکریہ نہیں ادا کروں گی۔ لیکن کاش تمہیں بتا سکتی کہ اس تحفے سے مجھے کتنی خوشی ہوئی ہے۔''

الٰہی بخش بھی خوشی سے سرشار ہو گیا۔ اس کا تحفہ حسن کی بارگاہ میں قبول ہو گیا تھا۔

☆

خوشبو کے سفر میں دن گزرتے رہے۔ سادی میں ایک نمایاں تبدیلی نظر آئی۔ اس کی شوخی ختم ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے مزاج میں سنجیدگی آ گئی تھی اور وہ اپنی عمر سے بڑی لگنے لگی تھی۔ الٰہی بخش جانتا تھا کہ ماں باپ کے جھگڑوں کا وہ بہت زیادہ اثر لیتی ہے۔

اب ڈرائیو کے دوران وہ گفتگو بھی کم کرتی تھی۔ البتہ اس کا رویہ اب بھی پہلے جیسا ہی تھا۔ لہجے میں وہی مٹھاس، انداز میں وہی اپنائیت۔

''مرد کتنے خوش قسمت ہوتے ہیں اور عورتیں کتنی پابند۔''

الٰہی بخش کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہنا چاہتی ہے۔ ''یہ خیال کیوں آیا آپ کو؟''

''اپنے گھر میں، اپنے علاقے میں تمہیں عزت اور سکھ نہیں ملا تو تم کتنی آسانی سے گھر چھوڑ آئے۔ تمہاری جگہ کوئی لڑکی ہوتی تو وہ ایسا نہیں کر سکتی تھی۔''

''آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ لیکن پھر بھی یہاں عورتوں کو ہمارے ہاں کے مقابلے میں بہت زیادہ آزادی ہے۔''

سادی کسی سوچ میں پڑ گئی۔ پھر اس نے کہا۔ ''الٰہی بخش، تم پر میرا زور تو نہیں۔ لیکن چاہتی ہوں کہ تم میری ایک بات مان لو۔''

''کہیں سادی بی بی۔''

''میں چاہتی ہوں کہ تم یہ ڈرائیوری چھوڑ دو۔ کوئی اور نوکری کرو۔ پرائیویٹ امتحان دو اور کم از کم بی اے کرو۔''

الٰہی بخش نے نظریں اٹھا کر عقب نما میں دیکھا تو سادی نظریں چرانے لگی۔ ''اور ۔۔۔؟'' اس نے پوچھا۔

''اور تم اپنا رہن سہن، اپنا طرز زندگی بدلو اور یہیں کے ہو رہو۔ کوشش کر کے اپنا گھر بناؤ، چاہے ابتدا میں وہ جھونپڑی ہو۔ پھر اپنا گھر بساؤ۔''

الٰہی بخش حیرت سے اسے دیکھتا رہا۔

''میں تمہیں کسی بلند مقام پر دیکھنا چاہتی ہوں الٰہی بخش، اس لئے کہ تم چھوٹے آدمی نہیں ہو۔ میں چاہتی ہوں کہ تم کسی شہری لڑکی سے شادی کرو۔ کچھ بن کر دکھاؤ۔ ایسا کرو کہ جنہوں نے تمہیں حقیر سمجھا ہے، تمہاری عزت کرنے پر مجبور ہو جائیں۔''

''آپ کی بات کا جواب طویل ہوگا۔ میں ڈرائیو کرتے ہوئے کیسے جواب دے سکتا ہوں'' الٰہی بخش نے بے بسی سے کہا۔

وہ اس وقت کالج سے گھر جا رہے تھے۔ ''ٹھیک ہے۔ تم گاڑی دائیں جانب موڑ لو'' سادی نے کہا۔ پھر وہ اسے ہدایات دیتی رہی۔ بالآخر اس نے ایک ریسٹورنٹ کے سامنے گاڑی رکوا دی۔ ''چلو گاڑی لاک کرو۔ یہاں ہم سکون سے بات کر سکیں گے۔''

''لیکن سادی بی بی، دیر ہو جائے گی۔ بیگم صاحبہ پریشان ہوں گی۔'' الٰہی بخش نے احتجاج کیا۔

''ان کے پاس اتنی فرصت نہیں۔'' سادی نے تلخی سے کہا۔ ''آؤ میرے ساتھ۔''

ہچکچاتا ہوا الٰہی بخش اس کے ساتھ ریسٹورنٹ میں چلا گیا۔ اندر نیم تاریکی تھی۔ خنک ماحول میں بہت دھیمی لائٹس روشن تھیں۔ سادی ایک فیملی کیبن کی طرف بڑھ گئی۔ ان کے بیٹھتے ہی ایک باوردی ویٹر مینیو لئے ہوئے آ گیا۔ اس نے ایک ایک مینیو کارڈ دونوں کی طرف بڑھا دیا۔

الٰہی بخش کی سمجھ میں نہیں آیا کہ مینیو کارڈ کا کیا کرے۔ سادی کی دیکھا دیکھی اس نے بھی اسے کھول لیا۔ وہ چھوٹی سی کتاب سی تھی۔ اس میں کھانوں اور مشروبات وغیرہ کی تفصیل درج تھی۔ ''پہلے پانی لے آؤ'' سادی نے ویٹر سے کہا۔

الٰہی بخش مرعوب ہو گیا۔ ویٹر کی وردی اسے احساس کمتری میں مبتلا کرنے کے لئے کافی تھی۔

''کیا کھاؤ گے الٰہی بخش؟'' سادی نے پوچھا۔

''سادی بی بی ۔۔''

''پلیز ۔۔ یہاں مجھے سادی بی بی نہ کہو۔'' سادی نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''صرف سادی کہو۔ ورنہ ویٹر مجھے نہ جانے کیا سمجھے گا۔''

''بہت مشکل کام ہے۔'' الٰہی بخش ہچکچایا۔

"میری خاطر کرنا ہوگا۔" سادی نے کہا۔ پھر پوچھا۔ "کیا کھاؤ گے؟"

"کھانا تو گھر پر ہی کھاؤں گا۔ سادی بی بی...." وہ کہتے کہتے رکا۔ "میرا مطلب ہے سادی۔" اسے سادی کہنا عجیب لگا لیکن اچھا بھی۔ اس کے اندر خود اعتمادی پیدا ہونے لگی۔

"نہیں الٰہی بخش... کھانا یہیں کھائیں گے۔"

"تو جو جی چاہے، منگالیں۔"

ویٹر ٹھنڈے پانی کی بوتل اور گلاس لے کر آیا تھا۔ سادی نے اسے آرڈر نوٹ کرایا۔ وہ چلا گیا۔

"سادی بی بی....!"

"پھر وہی بی بی کا دم چھلا۔" سادی نے چڑ کر کہا۔ "تم مجھے ذلیل کراؤ گے۔"

"نہیں.... ایسا نہیں ہوگا۔ بس عادت سی ہو گئی ہے نا۔" الٰہی بخش نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ "لیکن سادی بی بی... نہیں سادی، آپ مجھے گناہ گار بنا رہی ہیں۔"

"میرا نام لینا گناہ ہے تمہارے لئے۔" سادی نے اس پر آنکھیں نکالیں۔

"ہاں جی، میرے نزدیک تو یہ گناہ ہی ہے۔"

"تم آخر سمجھتے کیا ہو مجھے؟"

"بس سادی آپ بلند ہیں.... بہت اونچی۔ آپ آسمان ہیں، میں زمین ہوں۔"

"اسی لئے تو کہتی ہوں کہ میں تمہیں کسی بلند مقام پر.... بڑا آدمی دیکھنا چاہتی ہوں۔ پھر تم مجھے سادی کہو گے اور تمہیں پروا بھی نہیں ہوگی۔"

"ایسا تو کبھی نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ میں یہ نہیں چاہتا۔" وہ کچھ اور بھی کہتا۔ لیکن ویٹر کھانا لے آیا تھا۔ سادی نے ہاتھ کے اشارے سے اسے منع کر دیا۔

ویٹر کھانا رکھ کر چلا گیا۔ الٰہی بخش کو چھری کانٹے اور نیپکن دیکھ کر وحشت ہونے لگی۔ سادی نے پلیٹ اپنے سامنے رکھ کر اس نے نظریں اٹھائیں تو الٰہی بخش ویسے ہی بیٹھا تھا۔ "کیا بات ہے کھانا شروع کرونا۔ ہاں کباب بھی لے لو۔"

"میں جس طرح کھانا کھاؤں گا، اس میں آپ کی بے عزتی ہوگی۔"

"میں تمہیں سکھا دوں گی۔ مجھے دیکھو۔" یہ کہہ کر سادی نے نیپکن سامنے پھیلایا اور چھری کانٹا سنبھال لیا۔

الٰہی بخش نے بھی اس کی تقلید کی۔

"بہت مشکل لگ رہا ہے؟" سادی نے پوچھا۔

"نہیں، لیکن اچھا نہیں لگ رہا ہے۔"

"کیوں؟"

الٰہی بخش کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا۔ "کھانا کھانا ہمیشہ میرے لئے بہت بڑی خوشی ہوتی ہے۔ کھانا کھاتے ہوئے میرا رواں رواں خدا کا شکر ادا کرتا ہے لیکن آج میں دونوں سے محروم ہو گیا ہوں.... خوشی سے بھی اور شکر سے بھی۔"

"اس لئے کہ یہ تمہارے لئے اس طرح کھانا کھانے کا پہلا موقع ہے.... اور یہ احساس تمہیں ستا رہا ہے۔ اس کی عادت ہو جائے گی تو کھانا کھاتے ہوئے خوش بھی ہو گے اور خدا کا شکر بھی ادا کرو گے۔"

"نہیں سادی، میں اس طرح کھانا کھانے کا عادی بھی ہو گیا تو مجھے یہ احساس رہے گا کہ میں دوسروں کو دکھانے، خوش کرنے کے لئے اس طرح

کھا رہا ہوں۔ ایسے میں خوش ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور شکر کا خیال بھی دل میں نہیں آ سکتا۔ میں آپ کی بات نہیں کرتا لیکن میری حد تک یہ بات سچ ہے۔''

سادی بھی سوچ میں پڑ گئی۔ پھر بولی۔ ''میں تمہیں خوش دیکھنا چاہتی ہوں۔ تم جس طرح چاہو، کھانا کھاؤ۔ اس میں مجھے بے عزتی محسوس نہیں ہو گی۔''

الٰہی بخش نے چھری کانٹا پلیٹ میں رکھا، اور ہاتھ سے کھانا کھانے لگا۔ سادی نے نظریں اٹھا کر دیکھا تو اسے اس کے چہرے پر طمانیت نظر آئی۔

''باہر واش روم ہے۔ جا کر ہاتھ دھو آؤ۔'' کھانے کے بعد سادی نے کہا۔

الٰہی بخش ہاتھ دھو کر واپس آیا تو ویٹر آ چکا تھا، اور برتن سمیٹ رہا تھا۔ ''اب کافی لے آؤ پلیز۔'' سادی نے اس سے کہا۔

الٰہی بخش اپنی جگہ بیٹھ گیا تو سادی نے اس سے کہا۔ ''اب ہم باتیں کریں گے۔ میں تمہارے جواب کی منتظر ہوں۔''

''سادی! آپ مجھے بلند دیکھنا چاہتی ہیں، میرے متعلق، اپنائیت سے سوچتی ہیں، مجھے اس پر فخر ہے۔'' الٰہی بخش نے گہری سانس لے کر کہا۔

''آپ چاہتی ہیں کہ جو مجھے حقیر سمجھتے ہیں، وہ بھی میری عزت کریں۔ جبکہ میرا ایمان ہے کہ عزت دینے والا اللہ ہے اور میں جانتا ہوں کہ اس نے مجھے میری اوقات سے زیادہ دی ہے۔ جہاں تک بلند مقام کا تعلق ہے تو آپ دنیاوی مقام کی اور اس سے مختلف زندگی کی بات کرتی ہے۔ میرے نزدیک اہمیت اس طویل زندگی میں بلند مقام حاصل کرنے کی ہے، جو کبھی ختم نہیں ہو گی۔ مجھے افسوس اس بات کا ہے کہ میں اس میں بھی کوئی بلند مقام حاصل نہیں کر سکوں گا۔ مجھ میں ایسی کوئی وصف نہیں، کوئی خوبی نہیں، میرا عمل بھی ایسا نہیں، طرز زندگی بھی ایسا نہیں، اور اس دنیا کی زندگی میں، میں جو کچھ بھی ہوں، اس حیثیت میں، میں بہت خوش رہا ہوں۔ خوش اور مطمئن۔ یہی سب سے بڑی بات ہے۔ آپ چاہتی ہیں کہ میں اپنا لباس، رہن سہن بدلوں اور یہیں رہ جاؤں۔ تو سادی، میں اپنی اصل سے ناتا توڑنے والا نہیں۔ میں اپنے گھر سے، اپنی زمین سے روٹھ کر آیا ہوں۔ مگر مجھے وہیں جانا ہے، وہاں رہنے کے لئے میرا رنگ سازی کا اور ڈرائیونگ کا ہنر کافی ہے۔ وہاں کلرک کا کوئی مستقبل نہیں۔ میں تو مٹی سے اٹھنے والا آدمی ہوں، جسے آسمان کی حاجت تو ہو سکتی ہے، لیکن اس تک پہنچنے کی خواہش نہیں ہو سکتی۔ میں جہاں ہوں، وہیں ٹھیک ہوں سادی۔''

سادی اس کی باتیں بڑی افسردگی سے سن رہی تھی۔ ''پھر بھی آدمی کو آگے بڑھنے اور کچھ کرنے کی لگن تو ہونی چاہئے۔''

''یہ لگن مجھ میں ہے سادی۔ لیکن میری منزل یہ دنیا نہیں، وہ دنیا ہے اور مجھے یہ معلوم نہیں کہ اس سلسلے میں کیا کرنا چاہئے۔ یہی میرا دکھ ہے۔''

''لیکن جتنا عرصہ اللہ نے مقرر کر دیا، وہ اس دنیا میں گزارنا ہی ہے اور اس دنیا کا تعلق بھی اس دنیا سے ہے۔''

''یہی تو میں بھی کہتا ہوں۔'' الٰہی بخش نے زور دے کر کہا۔ ''اس دنیا میں یہاں کی دولت، مرتبہ اور مقام تو کام نہیں آئے گا۔ فکر تو ہمیں کچھ اور کرنی چاہئے۔''

سادی لاجواب ہو گئی۔ ویٹر کافی لے آیا تھا۔ سادی نے کافی بنائی اور ایک پیالی الٰہی بخش کی طرف بڑھا دی۔

''سادی، آپ مجھ سے ناراض تو نہیں ہے نا۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ مجھ سے کبھی ناراض ہوں۔''

''میں تم سے کبھی نہیں ناراض نہیں ہوں گی الٰہی بخش۔ مجھے افسوس ہے کہ تم نے میری خواہش رد کر دی لیکن مجھے خوشی ہے کہ زندگی کے بارے میں تمہارا ایک پختہ نظریہ ہے اور تم اس سلسلے میں بہت پراعتماد بھی ہو۔ ایسے لگتے تو نہیں تھے تم۔ یقین کرو، میری نظروں میں تم اور بڑے ہو گئے ہو۔''

''دیکھیں سادی، میں ایک اور آسان طریقے سے آپ کو سمجھاتا ہوں۔ آپ مجھ سے کہیں کہ میں اپنا نام بدل دوں۔ تو کیا یہ ممکن ہے۔ یہ تو ماں باپ کی دی ہوئی چیز ہے۔ میری شناخت ہے۔ میں کسی شہری لڑکی سے شادی کروں تو وہ مجھے اس نام سے پکارتے ہوئے شرمندہ ہو گی۔ لیکن مجھے اپنے نام سے شرمندگی نہیں ہوتی۔ میں کسی کی خاطر اپنی اصل تو نہیں بدل سکتا۔''

"ٹھیک کہتے ہو۔"

"اب میں آپ سے کہتا ہوں کہ سادی کہ آپ خود کو دیہاتی بنائیں۔ کسی گاؤں میں جا کر رہیں وہاں کی عورتوں کی طرح۔ جو کام وہاں عورتیں کرتی ہیں، آپ بھی کریں۔ اپنا لباس، اپنا رہن سہن، اپنا طرز زندگی وہاں کا کرلیں تو کیا یہ ممکن ہے؟"

"تم یقین نہیں کرو گے، میں ایسا کر سکتی ہوں۔" سادی نے پر زور لہجے میں کہا۔ "لیکن میں بااختیار نہیں۔ مجھے ایسا کرنے نہیں دیا جائے گا اور پھر آدمی نیچے سے اوپر جانے کی کوشش تو کر سکتا ہے، اوپر سے نیچے کون آئے گا۔"

"یہ اوپر اور نیچے کا تصور بھی اپنا اپنا ہے، اوپر سے نیچے آنا آسان ہوتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ سادی، کہ جو جہاں ہے، وہیں کے لئے ہے اور وہیں ٹھیک ہے۔"

"ٹھیک ہے الٰہی بخش۔"

بیرا بل رکھ کر گیا تھا۔ سادی نے طشتری پر سو کا ایک نوٹ رکھ دیا۔ "آؤ چلیں۔"

اس دن کے بعد سادی بالکل بدل کر رہ گئی!

الٰہی بخش محسوس کرتا تھا کہ تبدیلی اس میں بھی آئی ہے۔ لیکن سادی تو وہ پہلے والی سادی رہی ہی نہیں تھی۔ یہ نہیں کہ اس کے رویے میں کوئی تبدیلی آئی ہو۔ گاڑی میں وہ اب بھی اس کونے میں بیٹھتی تھی۔ اس کا چہرہ دیکھنے کے لئے الٰہی بخش کو صرف عقب نما کی طرف نظر اٹھانا پڑتی تھی لیکن اب عقب نما میں اسے مختلف منظر دیکھنے کو ملتا تھا۔ اسے کسی گہری سوچ میں ڈوبی سادی نظر آتی۔ اس کی پیشانی پر سوچ کی لکیریں مستقل ہو گئی تھیں۔ وہ اپنی عمر سے بڑی لگنے لگی تھی۔

سب سے بڑی بات یہ کہ اب وہ بہت کم سخن ہو گئی تھی۔ ان کے درمیان بات کم ہی ہوتی تھی۔

پھر انہی دنوں بیگم صاحبہ شیخ صاحب سے ناراض ہو کر اپنی والدہ کے گھر چلی گئیں۔ ان دنوں سادی یوں شرمسار نظر آتی تھی جیسے اس میں اس کا قصور ہو۔ اور تو اور اظہر بابا بھی اداس رہنے لگا۔ دس بارہ دن بعد شیخ صاحب انہیں لے آئے لیکن گھر کی فضا پہلے جیسی نہیں ہوئی۔ ادھر سادی کے امتحان سر پر آ گئے تھے۔ وہ ان کی تیاری میں بھی مصروف ہو گئی تھی۔

امتحان کے بعد چھٹیاں ہو گئیں۔ کالج جانا موقوف ہوا۔ ایک ہفتہ گزرتے گزرتے الٰہی بخش کو بے کاری کا احساس ستانے لگا مگر پھر ایک دن صبح دس بجے سادی باہر آئی۔ الٰہی بخش اس وقت باغیچے میں کرمو کے پاس بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ سادی نے اشارے سے اسے بلایا۔

الٰہی بخش لپک کر اس کے پاس گیا "جی سادی بی بی۔"

"کوئی مصروفیت تو نہیں تمہیں؟"

"میں تو بے کار بیٹھے بیٹھے تنگ آ گیا ہوں۔"

"تو گاڑی نکالو۔ مجھے اپنے ایک دوست سے ملنے جانا ہے۔"

"ابھی لایا سادی بی بی!"

"تم گاڑی صاف کرو۔ مجھے تیاری میں آدھا گھنٹہ لگے گا۔"

آدھے گھنٹے بعد سادی باہر آئی تو بہت اچھی لگ رہی تھی۔ الٰہی بخش نے اس کے لئے دروازہ کھولا اور پھر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا۔ "کہاں چلنا ہے سادی بی بی؟"

"ناظم آباد۔"

الٰہی بخش اب تک راستوں اور علاقوں سے باخبر ہو چکا تھا۔ اسے سادی کی ہدایت کی ضرورت نہیں تھی۔

''دو سال بعد میں اس دوست سے مل رہی ہوں۔'' سادی نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔

الٰہی بخش نے سر اٹھا کر عقب میں دیکھا۔ وہ اپنے مخصوص کونے میں بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھوں میں چمک تھی۔

''شاہد نام ہے اس کا۔ بہت اچھا لڑکا ہے۔ کل اس نے فون کیا تھا۔ میں نے سوچا، آج کل فرصت ہے۔ مل ہی لوں۔''

الٰہی بخش کو عجیب سا لگا۔ لڑکی کا دوست لڑکا! وہ جہاں کا تھا، وہاں لڑکی اور لڑکے کے درمیان کوئی تعلق نہیں ہوتا سوائے محبت کے۔ اور اس صورت میں وہ چھپ چھپ کر ملتے تھے۔ دوستی تو لڑکوں کی لڑکوں سے اور لڑکیوں کی لڑکیوں سے ہوتی ہے۔ اس نے خود کو وہ سمجھایا، جو کبھی سادی کو سمجھایا تھا، جو جہاں ہے وہیں کے مطابق ہے، وہیں کے لئے ہے اور وہیں ٹھیک ہے، شہر میں ایسا ہی ہوتا ہوگا۔

اچانک اس کے دل میں پھانس سی چبھی، کون جانے، سادی اس لڑکے شاہد سے محبت کرتی ہو۔ یہاں نام دوستی کا ضرور ہوتا ہوگا لیکن لڑکے اور لڑکی میں تو ایک دوسرے کے لئے خاص کشش ہوتی ہے۔ کہا کچھ بھی جائے 'ایسا ہے بھی تو تجھے کیا۔' اس نے خود کو ڈپٹ دیا۔ 'تو اپنا کام کئے جا۔ سادی سے بے طلب محبت کرتا رہ اسے خوش کرنے کی کوشش کر۔'

''یہاں سے داہنی جانب لے لو الٰہی بخش!'' سادی نے کہا۔

وہ ناظم آباد پہنچ چکے تھے۔ اب سادی ہدایت دے رہی تھی۔ ذرا دیر بعد اس نے ایک بنگلے کے سامنے گاڑی رکوا دی۔ ''اب تم واپس چلے جاؤ۔'' سادی نے اترتے ہوئے کہا۔ ''چار بجے مجھے لینے کے لئے آجانا۔ یہ بیل دے دینا'' اس نے بٹن کی طرف اشارہ کیا۔

''بہت بہتر سادی بی بی!''

سادی نے بٹن پر انگلی رکھ دی تھی۔ الٰہی بخش نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ اس کے دل میں سادی کی آرزو نہیں تھی۔ کوئی طلب نہیں تھی۔ لیکن وہ اس شاہد کو دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔

☆

ٹھیک چار بجے الٰہی بخش وہی بٹن دبا رہا تھا۔

چند لمحے بعد ایک خوش پوش اور خوش شکل اور جوان لڑکے نے گیٹ کھولا۔ اسے دیکھتے ہی الٰہی بخش کے دل میں رقابت کی ایک تند لہر اٹھی۔

''سعدیہ کو لینے آئے ہو؟'' لڑکے نے پوچھا۔

''جی ہاں!''

''ابھی آتی ہے وہ۔'' یہ کہہ کر لڑکا اندر چلا گیا۔

الٰہی بخش کو احساس بھی نہیں ہوا کہ وہ اس سے اپنا موازنہ کر رہا ہے۔ احساس ہوا تو اس نے خود کو روکا۔ اس کا اس سے کیا جوڑ۔

اسی لمحے سادی باہر آ گئی۔ لڑکا بھی ساتھ ہی آیا تھا۔ ''اچھا شاہد، خدا حافظ۔''

الٰہی بخش نے سادی کے لئے پچھلا دروازہ کھول دیا تھا۔ ''خدا حافظ سعدیہ'' لڑکے نے کہا۔ ''پھر کب آؤ گی؟''

''جب موقع ملا۔'' سادی نے مسکراتے ہوئے کہا اور گاڑی میں بیٹھ گئی۔

راستے میں سادی نے پوچھا۔ ''امی نے تم سے کچھ پوچھا تو نہیں تھا؟''

''جی نہیں۔'' الٰہی بخش نے بجھے بجھے لہجے میں کہا۔

''جب بھی پوچھیں تو کہنا کہ نورین کے ہاں گئی ہوں۔ شاہد کا نام نہ لینا۔''

''کیوں سادی بی بی؟'' الٰہی بخش نہ چاہتے ہوئے بھی پوچھ بیٹھا۔

"خواہ مخواہ جھک جھک کریں گی امی۔"

"ماں باپ سے پوچھے بغیر کسی سے ملنا تو بری بات ہے سادی بی بی؟"

"ہاں بری بات تو ہے لیکن پوچھوں تو اجازت نہیں ملے گی۔"

الٰہی بخش چپ ہو گیا لیکن اسے دلی تکلیف ہوئی۔ وہ سادی کو بہت اچھا، بہت بلند دیکھنا چاہتا تھا۔

اسے پتہ نہیں معلوم تھا کہ اس کے لئے اذیت ناک وقت شروع ہو گیا ہے۔ سادی تقریباً ہر ہفتے شاہد کے ہاں جانے لگی تھی۔ ادھر الٰہی بخش کے خود سے مباحثے شروع ہو گئے تھے۔ وہ خود کو سمجھاتا کہ یہ عشق کی آزمائش ہے۔ اور اسے کیا لینا۔ سادی اس کے لئے تو نہیں ہے۔ یہ اس کی قربت، ایک التفات کی نظر، کوئی میٹھی بات۔ یہ تو اس کے احسانات ہیں، جن کا وہ کبھی صلہ نہیں دے سکتا۔ وہ عشق کر سکتا ہے اس سے اور کیے جائے گا۔

وہ پانچواں یا چھٹا موقع تھا کہ وہ اسے گھر واپس لے جانے کے لئے آیا تھا، اس روز سادی اکیلی باہر نکلی اور وہ روہانسی لگ رہی تھی۔

"الٰہی بخش، چلا گاڑی، جلدی سے مجھے یہاں سے لے چلو۔"

الٰہی بخش نے گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھائی۔ "کیا بات ہے سادی بی بی، خیر تو ہے؟" اس نے پرتشویش لہجے میں پوچھا۔

"بس میں آئندہ یہاں نہیں آؤں گی۔"

الٰہی بخش نے چونک کر آئینے میں دیکھا۔ سادی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ "کیا ہوا۔ بات کیا ہے؟"

"اس نے...... اس نے مجھ سے بدتمیزی کی۔"

الٰہی بخش کے وجود میں سناٹے تیر گئے۔ بلا ارادہ اس نے بریک پر دباؤ ڈالا اور گاڑی سائیڈ میں روک دی۔ "کیا ہوا۔ کیا کہا اس نے؟" اسے خود بھی اپنی آواز اجنبی لگی۔

"آج گھر میں کوئی نہیں تھا۔" سادی اس کی بدلتی کیفیت سے بے نیاز کہتی رہی۔ "اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور" آگے اس سے کچھ کہا نہیں گیا۔

الٰہی بخش کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔ اس نے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا۔ اس بار سادی اس کی کیفیت سے بے خبر نہیں رہی۔ وہ سہم گئی۔ "الٰہی بخش ادھر دیکھو۔"

الٰہی بخش نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ "جی سادی بی بی!"

"تم کیا کر رہے ہو۔ گاڑی چلاؤ نا۔"

"نہیں سادی بی بی، پہلے اسے بدتمیزی کی سزا دوں گا۔" الٰہی بخش نے دروازہ کھول لیا۔

"تم ایسا کچھ نہیں کرو گے۔" سادی نے سخت لہجے میں کہا۔ "نہ آج نہ آئندہ کبھی۔ نہ شاہد کے ساتھ اور نہ کسی اور کے ساتھ۔"

"لیکن اس نے آپ کے ساتھ بدتمیزی کی ہے......"

"غلطی میری تھی۔ میں خود یہاں آئی تھی۔"

"پھر بھی...... اسے حق نہیں پہنچتا کہ......"

"الٰہی بخش، تم میری بات نہیں مانو گے۔"

الٰہی بخش نے بے بسی سے اسے دیکھا "سادی بی بی......"

"بس، میں جو کہہ رہی ہوں۔ میری وجہ سے تم کبھی کسی پر ہاتھ نہیں اٹھاؤ گے۔ ورنہ میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔"

الٰہی بخش کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ اس نے خاموشی سے انجن اسٹارٹ کیا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔

الٰہی بخش کو یہ اطمینان ہو گیا تھا کہ اب سادی شاہد کے گھر کبھی نہیں جائے گی۔ اس واقعے کے تین ہفتے بعد اچانک سادی نے پھر اس سے گاڑی

نکالنے کو کہا۔

گاڑی گیٹ سے نکالنے کے بعد الٰہی بخش نے پوچھا۔ ''کہاں جائیں گی سادی بی بی؟''

''ناظم آباد۔شاہد کے گھر۔''

الٰہی بخش سناٹے میں آ گیا۔ ''پچھلی بار آپ نے کہا.....''

''ہاں..... میں نے فیصلہ تو یہی کیا تھا لیکن اس نے فون پر اتنی معافیاں مانگیں، اتنا گڑگڑایا۔ میں کیا کرتی۔ میں بھی تو اسے پسند کرتی ہوں۔''

اس اظہار پسندیدگی کے بعد کچھ کہنے کی گنجائش نہیں تھی۔ پھر بھی الٰہی بخش نے کہا ''اس نے آپ کے ساتھ بدتمیزی کی تھی۔''

''وہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں!'' الٰہی بخش کا دل برا ہونے لگا۔ مگر فوراً ہی تکدر دور بھی ہو گیا۔ سادی نے جو بات کی تھی، وہ کوئی خراب، بگڑی ہوئی لڑکی ہی کر سکتی تھی۔ مگر وہ جیسی بھی سہی، اسے تو اس سے محبت کرنا تھی، اور اچھوں سے محبت کرنا تو کچھ مشکل بھی نہیں ہوتا۔

وہ سادی کو واپس لینے گیا تو سادی اداس تھی۔ لیکن وجہ نہ اس نے بتائی نہ الٰہی بخش نے پوچھی۔ الٰہی بخش عشق میں سراپا تسلیم ہونے کے مرحلے سے گزر رہا تھا۔

☆......☆......☆

امتحان کا نتیجہ نکل آیا تھا۔ سادی نے فرسٹ ڈویژن لی تھی۔ اس کا داخلہ یونیورسٹی میں ہو گیا۔ اب الٰہی بخش اسے لانے لے جانے کے لئے یونیورسٹی جاتا تھا۔ یونیورسٹی اتنی بڑی تھی، جیسے پوری دنیا اور الٰہی بخش کو وہ بہت مختلف دنیا لگی۔ وہاں کا ماحول بہت آزادانہ تھا۔ لڑکے لڑکیاں بے حجابانہ ساتھ گھومتے تھے، بے فکری سے گھاس پر بیٹھے یا کینٹین میں کھاتے پیتے نظر آتے۔

الٰہی بخش کا بوجھل دل اور بوجھل ہونے لگا۔

یونیورسٹی میں ایک بس اسٹاپ تھا، جہاں پتھر کی بینچیں تھیں۔ بس کا انتظار کرنے والے تو وہاں کم ہی بیٹھتے تھے لیکن ہر وقت دو چار جوڑے بیٹھے گپ شپ کرتے نظر آتے۔ یونیورسٹی میں ایک اور بات کالج سے مختلف تھی۔ کالج کی طرح وہاں مقررہ وقت پر چھٹی نہیں ہوتی تھی۔ کسی دن تین بجے، کسی دن ایک بجے اور کسی دن گیارہ بجے ہی چھٹی ہو جاتی تھی۔ سادی ہر روز اسے وقت بتاتی کہ کب اسے لینے آنا ہے اور جگہ اس نے بس سٹاپ ہی مقرر کی تھی۔

ابتدا میں الٰہی بخش نے محسوس کیا کہ سادی یونیورسٹی میں خود کو اجنبی محسوس کرتی ہے۔ وہ سہمی سہمی نظر آتی۔ اس کی چال میں بھی اعتماد نہ ہوتا۔ الٰہی بخش اس بات کو سمجھ سکتا تھا۔ وہ پہلی بار کراچی آیا تو اس کا بھی یہی حال تھا۔ سادی بھی جیسے کالج کے گاؤں سے ایک دم یونیورسٹی کے شہر میں آ گئی تھی۔ ایک ہفتے میں اس نے چند لڑکیوں سے دوستی کر لی۔ کبھی کبھی اس کی کوئی سہیلی بھی گاڑی میں اس کے ساتھ ہی بیٹھ جاتی۔ اور راستے میں کہیں اتر جاتی۔

دو مہینے ہو گئے تو سادی کے انداز میں اعتماد آ گیا۔ پھر ایک دن الٰہی بخش اسے لینے پہنچا تو بس اسٹاپ پر سادی کو ایک لڑکے کے ساتھ بیٹھے دیکھا۔ دونوں قریب بیٹھے بڑے بے تکلفی سے ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے۔

گاڑی رکی تو سادی اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''آؤ ریاض، تمہیں میں راستے میں ڈراپ کر دوں گی۔''

''نہیں سادی شکریہ۔ مجھے کسی سے ملنا ہے۔'' لڑکے نے کہا۔

''اچھا، خدا حافظ۔ کل ملیں گے۔'' سادی نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

چار پانچ دن بعد الٰہی بخش کو لگا کہ زندگی کی رفتار بہت تیز ہو گئی ہے۔ لیکن نہیں زندگی کی رفتار تو سست ہو گئی تھی۔ البتہ سادی بہت تیز دوڑ رہی تھی۔ اس روز وہ ایک اور لڑکے کے ساتھ بیٹھی ملی۔ اس لڑکے کا نام عمر تھا۔ چند روز بعد اس کی رشید سے دوستی ہوئی۔ اور اس کے بعد اس کے

دوستوں کی تعداد اتنی تیزی سے بڑھنے لگی کہ الٰہی بخش کے لئے لڑکوں کے نام یاد رکھنا ممکن نہیں رہا لیکن اس دوران بھی وہ ہفتے پندرہ دن میں شاہد سے ملنے ضرور جاتی تھی۔

چھ ماہ کے اندر سادی بالکل بدل کر رہ گئی لیکن اس کے دو معمول نہیں بدلے تھے۔ صبح وہ تیار ہو کر آتی تو اسے گڈ مارننگ کہتی اور وہ گاڑی میں اسی مخصوص کونے میں بیٹھتی۔ الٰہی بخش کبھی عقب نما میں اسے دیکھتا تو دل مسوس کر رہ جاتا۔ اس کے چہرے پر اب وہ پہلے والی تازگی اور رونق نہیں رہی تھی۔ آنکھوں میں بھی چمک نہیں تھی۔ آنکھوں کے نیچے حلقے پڑ گئے تھے۔

الٰہی بخش کا ایمان تھا کہ میلی نظروں سے چہروں کے گلاب مرجھا جاتے ہیں!

پھر ایک روز الٰہی بخش سادی کے بتائے ہوئے وقت پر اسے لینے پہنچا تو وہ موجود نہیں تھی۔ الٰہی بخش کی سمجھ میں نہ آیا کہ اب کیا کرے۔ اس نے گاڑی ایک طرف کچے میں لگا دی اور یہ سوچ کر انتظار کرنے لگا کہ شاید چھٹی میں دیر ہو گئی ہے۔

پانچ منٹ بعد ایک لڑکی اس طرف گزری۔ وہ سادی کی سہیلیوں میں سے تھی۔ الٰہی بخش کو اس کا نام تو معلوم نہیں تھا لیکن وہ چہرے سے اسے جانتا تھا۔

"اے۔۔۔ تم سعدیہ کے ڈرائیور ہو نا؟" لڑکی نے پوچھا۔

"جی ہاں۔"

"اس کا انتظار کر رہے ہو؟"

"جی۔"

"وہ تو جا چکی ہے۔"

الٰہی بخش کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ "آپ کیسے کہہ رہی ہیں؟"

"ارے، وہ میرے سامنے عمر کی موٹر سائیکل پر بیٹھ کر گئی ہے۔ آج اس نے کوئی کلاس اٹینڈ نہیں کی۔ وہ تو دس بجے ہی چلی گئی تھی۔"

الٰہی بخش کو اب بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔ "مجھے تو انہوں نے اسی وقت بلایا تھا۔ میں تو ان کا انتظار کروں گا جی۔"

"تمہاری مرضی، میں نے تمہیں بتا دیا۔ اب تم جانو۔" یہ کہہ کر لڑکی آگے بڑھ گئی۔ اس وقت سوا ایک بجا تھا۔ سادی نے اس روز اسے ایک بجے بلایا تھا۔ الٰہی بخش کشمکش میں پھنس گیا۔ عقل کہتی تھی کہ سادی جا چکی ہے۔ اس کی سہیلی کو جھوٹ بولنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ لہٰذا اسے واپس چلے جانا چاہئے۔ لیکن دل نہیں مانتا تھا۔ اسے یہیں انتظار کرنا چاہئے۔

اسی کشمکش میں تین بج گئے۔ جب سادی اسے ایک بجے بلاتی تو وہ کھانا کھا کر نہیں آتا تھا۔ بلکہ کھانا واپس جا کر کھاتا تھا۔ چنانچہ اس کا بھوک سے بھی برا حال ہو گیا۔ مگر وہ بھوک کی وجہ سے انتظار سے دست کش نہیں ہوا۔ البتہ تین بجے اسے یہ یقین ہو گیا کہ سادی واپس جا چکی ہے۔ بلکہ ممکن ہے، وہ گھر بھی پہنچ گئی ہو۔ بالآخر وہ واپس چل دیا۔

کار کو گیٹ میں داخل ہوتا دیکھتے ہی کرموچاچا بیگم صاحبہ کو اطلاع دینے کے لئے لپکا۔ بیگم صاحبہ نے سختی سے اسے ہدایت کی تھی کہ گاڑی آتے ہی انہیں مطلع کرے۔

الٰہی بخش نے گاڑی پورچ میں کھڑی کی اور باہر آیا۔ اسی وقت بیگم صاحبہ باہر آ گئیں۔ "سادی کو ساتھ نہیں لائے؟"

الٰہی بخش جواب دینے ہی والا تھا کہ بیگم صاحبہ نے مزید کہا۔ "تمہارے جانے کے دو منٹ بعد سادی نے فون کیا تھا کہ ایک اضافی پیریڈ کی وجہ سے دیر ہو جائے گی۔ ممکن ہے، چار بج جائیں۔ تم نکل چکے تھے۔ تمہیں کیسے بتایا جا سکتا تھا۔ لیکن اتنا انتظار کیا اور پھر بھی تم سادی کو لئے بغیر چلے آئے۔" ان کا لہجہ سخت ہو گیا۔

الٰہی بخش سناٹے میں آ گیا۔ پھر بھی وہ بہت تیزی سے سوچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ سادی کی سہیلی نے بتایا تھا کہ وہ دس بجے عمر کے ساتھ چلی گئی

تھی اور وہ اب تک گھر نہیں پہنچی تھی۔ بیگم صاحبہ کا کہنا تھا کہ سادی نے ساڑھے بارہ بجے فون کر کے بتایا تھا کہ اسے یونیورسٹی سے دیر ہو جائے گی۔
اب وہ بیگم صاحبہ کو اصل بات تو نہیں بتا سکتا تھا۔

''بولتے کیوں نہیں؟ جواب دو'' بیگم صاحبہ کے سخت لہجے نے اسے چونکا دیا۔

''مجھے تو معلوم نہیں تھا بیگم صاحبہ، پھر بھی میں نے تین بجے تک بی بی کا انتظار کیا۔''

''تمہیں نہیں معلوم تھا تو تمہیں قیامت تک اس کا انتظار کرنا چاہئے تھا۔''

الٰہی بخش کہنا چاہتا تھا کہ اس صورت میں تو اسے رات یونیورسٹی میں ہی گزارنا پڑتی لیکن اس نے یہ بات کہی نہیں۔ ''غلطی ہو گئی بیگم صاحبہ!'' اس نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

اب تو بیگم صاحبہ برس پڑیں۔ ''یہ غلطی نہیں، غیر ذمے داری ہے اور غیر ذمے داری حرام خوری ہوتی ہے۔'' ان کے لہجے میں بلا کی نفرت تھی۔

اسی لمحے سادی بھی آ گئی۔

مگر بیگم صاحبہ اس کی موجودگی سے بے خبر اپنی کہتی رہیں'' اور کیوں نہ کرو حرام خوری۔ بے وقوف جو مل گئے ہیں تمہیں۔ دن میں دو بار ڈرائیو کرتے ہو اور تین بار مفت کی روٹیاں توڑتے ہو۔ رہنے کا ٹھکانہ میسر ہے۔ تنخواہ بڑے سرکاری افسروں کی لیتے ہو۔ حرام منہ کو لگے گا تو حرام خوری تو ہو گی!''

سادی اس دوران تین بار ماں کو پکار چکی تھی۔ اب اس نے ماں کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔ ''بس کریں امی، آپ ناحق اسے برا بھلا کہہ رہی ہیں۔'' اس نے نظریں اٹھا کر الٰہی بخش کو دیکھا، جس کا چہرہ ستا ہوا تھا۔ ''اس میں الٰہی بخش کی تو کوئی غلطی نہیں۔''

''غلطی کیسے نہیں۔ اسے وہیں تمہارا انتظار کرنا چاہیے تھا۔''

''اس صورت میں، میں گھر آ جاتی اور یہ وہیں بیٹھا انتظار کرتا رہتا۔ پھر کیا ہم اسے لینے کے لیے کسی کو بھیجتے۔''

بیگم صاحبہ لاجواب ہو گئیں۔ لیکن وہ ہار ماننے والی نہیں تھیں۔ ''ہاں۔ ایسا ہی ہوتا اور یہی بہتر تھا۔'' وہ الٰہی بخش کی طرف مڑیں۔ ''تمہیں احساس نہیں کہ میرے شوہر نے تمہیں میری بیٹی کی ذمے داری سونپی ہے۔ اور یہ بڑی ذمے داری ہے۔''

'کیسی ذمے داری!' الٰہی بخش نے سوچا۔ 'میں تو اسے غلط راستے پر جانے سے روک بھی نہیں سکتا۔' لیکن اس نے منہ سے کچھ نہیں کہا۔

''امی، آپ بلاوجہ اسے برا بھلا کہہ رہی ہیں۔'' اس بار سادی نے سخت لہجے میں کہا۔ ''میں نے فون کیا تھا، اور مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ الٰہی بخش گاڑی لے کر نکل چکا ہے۔ میں نے آپ سے کہہ دیا تھا کہ اب میں اپنے طور پر آ جاؤں گی۔ الٰہی بخش نے تو بس یہ غلطی کی کہ تین بجے تک میرا انتظار کرتا رہا۔''

''ہاں۔ آنا تھا تو پہلے ہی آ جاتا۔''

''اب میں آپ کے سامنے اسے کہہ رہی ہوں کہ مقررہ وقت پر میں نہ ملوں تو صرف پندرہ منٹ میرا انتظار کرے۔ پھر گاڑی لے کر چلا آئے۔'' سادی الٰہی بخش کی طرف متوجہ ہوئی۔ ''تم نے کھانا نہیں کھایا ہو گا۔''

''نہیں جی سادی بی بی۔ مجھے بھوک ہے بھی نہیں۔''

بیگم صاحبہ پاؤں پٹختی ہوئی اندر چلی گئیں۔ سادی نے کہا۔ ''تم کھانا نہیں کھاؤ گے تو میں سمجھوں گی کہ مجھ سے ناراض ہو۔''

''میں آپ سے کہہ چکا ہوں کہ میں آپ سے ناراض ہو ہی نہیں سکتا۔''

''خیر دیکھیں گے۔'' سادی نے بے نیازی سے کہا۔ ''لیکن کھانا تمہیں کھانا پڑے گا۔ میں جمیلہ کے ہاتھ کھانا بھجوا رہی ہوں۔''

''بہت شکریہ سادی بی بی!'' الٰہی بخش نے کہا اور اپنے کوارٹر کی طرف چل دیا۔

☆......

ہر آنے والا دن گزرے ہوئے دن سے زیادہ اذیت ناک تھا۔

ہر تیسرے چوتھے دن وہ خالی گاڑی لے کر واپس آتا۔ سادی کبھی عمر کے کبھی جمیل کے اور کبھی کسی کے ساتھ جا چکی ہوتی۔ گھر میں وہ یہی کہتی کہ اضافی پیریڈ کی وجہ سے دیر ہوگئی یا لائبریری میں مطالعہ کر رہی تھی۔ الٰہی بخش اذیت میں تھا کہ سادی غلط راستے پر جا رہی ہے اور وہ محض تماشائی بنا سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ عشق کا بھی تو کچھ فرض ہوتا ہے۔ عشق اپنے محبوب کو تباہ ہوتے ہوئے دیکھنے کا نام نہیں۔

ایک روز الٰہی بخش نے سادی سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ یونیورسٹی لے جاتے ہوئے اس نے عقب نما میں سادی کو دیکھا جو کسی سوچ میں گم تھی۔ ''سادی بی بی، آپ کو یاد ہے آپ نے مجھے اختیار دیا تھا کہ غلط بات پر آپ کو ٹوک سکتا ہوں۔''

سادی نے عقب نما میں اسے دیکھا۔ ''ہاں مجھے یاد ہے۔''

''وہ حق اب بھی میرے پاس ہے؟''

''کیوں نہیں ہوگا۔''

''میں نے سوچا، ممکن ہے آپ نے چپکے سے وہ حق مجھ سے واپس لے لیا ہو۔''

''یہ کیوں سوچا تم نے؟''

''آپ بہت بدل گئی ہیں سادی بی بی، میں آپ کو ٹوکنا چاہتا ہوں، کیونکہ آپ غلط راستے پر جا رہی ہیں۔''

''میں سمجھی نہیں۔''

''یہ لڑکوں کے ساتھ دوستی، ان کے ساتھ جانا، پڑھائی چھوڑ دینا یہ سب غلط ہے۔ آپ کے لئے نقصان دہ ہے۔''

سادی نے چونک کر اسے دیکھا۔ ''تمہیں کیسے معلوم ہوا؟''

الٰہی بخش کی نظریں جھک گئیں۔ ''میں نے کبھی کسی سے نہیں پوچھا۔ ہر بار کوئی نہ کوئی خود ہی بتا دیتا ہے۔''

''سنا تم نے سچ ہے۔'' سادی نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''لیکن اس میں حرج کیا ہے۔''

''بدنامی بھی ہوتی ہے اور عزت بھی کم ہو جاتی ہے۔ لڑکیوں کی عزت تو کانچ کے برتن کی طرح ہوتی ہے۔''

''تو تمہاری نظروں میں میری عزت کم ہوگئی ... یا بالکل ہی ختم ہوگئی؟'' سادی نے عقب نما میں اسے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''میری بات اور ہے سادی بی بی، میرے لئے آپ اب بھی پہلے جیسی ہیں ... اور ہمیشہ ایسی ہی رہیں گی۔ بلند اور پاکیزہ۔ میں دنیا کی بات کر رہا ہوں۔ پھر آدمی محبت تو بس ایک ہی آدمی سے کرتا ہے۔ ایک وقت میں اتنے لوگوں سے تو محبت نہیں ہو سکتی۔''

''تو میں ان سب سے محبت نہیں کرتی، محبت تو مجھے بھی بس ایک ہی شخص سے ہے ... اور ہمیشہ رہے گی البتہ دوستی میں حرج نہیں سمجھتی۔''

الٰہی بخش کو یہ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی کہ وہ کون ہے۔ وہ جانتا تھا کہ شاہد کی بدتمیزی کے باوجود سادی نے اس سے ملنا نہیں چھوڑا ہے۔

الٰہی بخش جو کچھ کہنا چاہتا تھا، اس میں اسے حجاب آ رہا تھا لیکن وہ کہنا بھی ضروری تھا۔ ''سادی بی بی، مرد اور عورت کے درمیان دوستی ممکن نہیں۔ صرف ایک ہی رشتہ یا تعلق ہو سکتا ہے۔ غلط طریقے سے ہو یا صحیح طریقے سے۔''

''میں بہت پریشان اور دکھی ہوں الٰہی بخش۔ امی اور پاپا کی زندگی میرے سامنے ہے۔ اور میں ایسی زندگی نہیں گزارنا چاہتی۔ میں اپنی زندگی کا فیصلہ امی اور پاپا پر نہیں چھوڑ سکتی۔ وہ تو اپنے لئے درست فیصلہ نہیں کر سکے، میرے لئے کیا کریں گے۔ الٰہی بخش، یہ درست ہے کہ میں کسی سے محبت کرتی ہوں۔ بلکہ...'' وہ کہتے کہتے رکی۔ پھر بولی۔ ''الٰہی بخش میں نے ایک بات سمجھ لی ہے۔ شادی اپنے اختیار میں ہوتی ہے، محبت نہیں۔ مجھے جس سے محبت ہوئی، میں جانتی ہوں کہ اس کے ساتھ میری شادی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ میرے بس میں ہوتا تو میں اس محبت کو دل سے نکال دیتی لیکن اس پر میرا اختیار نہیں۔ اب میں اتنے لڑکوں سے دوستی کرتی ہوں تو انہیں پرکھنے کے لئے شاید کوئی ایسا مل جائے جو مجھے سمجھ سکے اور جسے میں سمجھ

سکوں۔ ایسے شخص کے ساتھ محبت کے بغیر بھی زندگی گزاری جاسکتی ہے۔ بس یہی جستجو ہے میری۔"

"آپ نے جو بات کہی، وہ بھی پوری نہیں کہی سادی بی بی۔" الٰہی بخش نے کہا۔ "انسان کا اختیار نہ محبت پر ہے نہ شادی پر۔ جوڑے تو اوپر آسمانوں پر طے ہوتے ہیں اور لڑکوں سے ملنے میں یہ برائی ہے کہ کسی بھی وقت کوئی آپ کے ساتھ بدتمیزی کرسکتا ہے۔ آپ کو نقصان پہنچ سکتا ہے سادی بی بی!"

"تم اس کی فکر نہ کرو۔" سادی نے سرد لہجے میں کہا "تم جسے بدتمیزی کہتے ہو، وہ کوئی ایسی بڑی بات نہیں۔ تھوڑا بہت تعلق تو کسی سے بھی کر رکھا جا سکتا ہے، اس سے عزت پر تو کوئی حرف نہیں آتا۔"

اس کے بعد کچھ کہنے کی گنجائش نہیں تھی، الٰہی بخش خاموش ہو گیا۔

اس رات الٰہی بخش کو بہت دیر تک نیند نہیں آئی۔ وہ سادی کے بارے میں سوچتا رہا۔ سادی کے الفاظ اس کی سماعت میں گونجتے رہے۔ 'تم جسے بدتمیزی کہتے ہو، وہ کوئی ایسی بڑی بات نہیں۔ تھوڑا بہت تعلق تو کسی سے بھی رکھا جا سکتا ہے۔ اس سے عزت پر تو کوئی حرف نہیں آتا۔'

یہ کیا ہو گیا ہے سادی کو۔ وہ سوچتا رہا، اسے عزت اور آبرو کے فرق کا احساس نہیں رہا۔ وہ کن گہرائیوں میں گرتی جا رہی ہے۔ کس حد تک گر چکی ہے۔ وہ اسے روک بھی تو نہیں سکتا تھا۔ اس کے پاس اختیار کوئی نہیں۔ وہ بس اس کے لئے دعا کرسکتا ہے۔ مسلسل دعا!

اس نے اپنے دل کو ٹٹولا۔ وہاں سادی کا مقام اور مرتبہ اب بھی وہی تھا۔ اس میں رتی بھر بھی فرق نہیں پڑا تھا۔ یہی تو عشق ہے۔ اس کے دل میں کسی نے کہا۔ عشق کی عزت غیر مشروط ہوتی ہے۔ اس کا عمل اور کردار سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اس میں صرف خوبیاں اور احسان یاد رکھے جاتے ہیں۔

ان سے اس کی کروں شکایت کیا؟
شیشۂ دل پہ بال بھی تو نہیں

اس کے بعد اس کے وجود میں عجیب سی طمانیت اتر گئی۔ وہ بے فکر اور پھر بے خود ہو گیا۔ بہت عرصے کے بعد اس رات سادی پہلے کی طرح اس کے پاس آئی اور وہ دیر تک اس سے باتیں کرتا رہا۔ اس کی سمجھ میں آگیا کہ قربت کیسی کثافت پیدا کرتی ہے اور دوری میں کتنی لطافت اور سرشاری ہوتی ہے۔ وہ عشق کے عین کو سمجھنے کے مرحلے میں داخل ہو رہا تھا۔

☆

اس روز الٰہی بخش سادی کو چھوڑ کر واپس آرہا تھا۔ وہ بہت مطمئن اور پرسکون تھا۔ اچانک نجانے کہاں سے گاڑی کے عین سامنے مجذوب نمودار ہو گیا۔ اس نے گھبرا کر پوری قوت سے بریک پر پیر مارا۔ گاڑی بروقت رک گئی۔

الٰہی بخش نے مجذوب کو حیرت سے دیکھا، جو بہت خوش نظر آرہا تھا۔ مجذوب پہلی ملاقات کے بعد بھی دو تین بار اسے نظر آچکا تھا۔

"نیچے آجا۔ ہوا کا گھوڑا بہت اڑالیا۔" مجذوب نے اسے پکارا۔ "بس اب زمین پر آجا۔"

الٰہی بخش دروازہ کھول کر کار سے اترا۔ وہ بہت مؤدب تھا "جی بابا؟"

"یہ گھوڑا بہت اچھا لگنے لگا ہے نا؟" مجذوب نے کار کی طرف اشارہ کیا۔ "عادی ہو گیا اس کا؟"

"اچھا تو لگتا ہے بابا۔ سواری جو اس کی ہے۔"

"واپسی کا حکم آگیا ہے۔ سنا تو نے؟ تیاری کرلے!"

الٰہی بخش حیران رہ گیا "میں..... میں کیسے جاسکتا ہوں؟"

"جیسے آیا تھا۔"

"پر بابا، زنجیر تو ابھی ٹوٹی نہیں!"

"میں نے واپسی کی بات کی ہے۔ رہائی کی نہیں۔"

"میں سمجھا نہیں بابا۔"

"زنجیر اب بھی موجود ہے۔ بس لمبی کر دی گئی ہے۔" مجذوب نے کہا "اور واپسی کا حکم ہو گیا ہے۔"

الٰہی بخش گنگ ہو کر رہ گیا۔ ہونٹ لرزتے رہے۔ لیکن منہ سے کچھ نہ نکلا۔

مجذوب کو غصہ آ گیا "سب معلوم ہے۔" اس نے گرج کر کہا "تو نافرمان ایسے نہیں جائے گا۔ خود بھی ذلیل ہو گا اور دوسرے کو بھی کرائے گا۔"

"میں ۔۔ میں۔۔۔" الٰہی بخش نے کہنے کی کوشش کی۔

"مگر جانا تو ہے۔ تو چاہے یا نہ چاہے۔" مجذوب آگے بڑھ گیا "جا تیرا خدا حافظ" اس نے پلٹ کر کہا۔ پھر کڑک کر نعرہ لگانے والے انداز میں چلایا "جا۔۔۔ چلا جا۔"

☆

پھر ایک دن الٰہی بخش کے لئے واپسی کا حکم ہو گیا۔

سادی کے معمولات اب بھی وہی تھے۔ ہفتے میں دو بار الٰہی بخش یونیورسٹی سے خالی گاڑی لاتا تھا۔ مگر اس کی اذیت ختم ہو گئی تھی۔ اب وہ راضی برضا تھا۔ شاید اپنے دل کو بوجھ ہلکا کرنے کے بعد اسے سکون آ گیا تھا۔

وہ اتوار کا دن تھا۔ شیخ صاحب بھی گھر پر تھے۔ گھر کے سب لوگ کسی تقریب میں جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ شام کے وقت کرمو الٰہی بخش کے کوارٹر میں آیا "بیگم صاحبہ تجھے اندر بلا رہی ہیں بیٹے۔"

الٰہی بخش اندر چلا گیا۔ بیگم صاحبہ اپنے کمرے میں تھیں۔ وہ سنگھار میز کے سامنے بیٹھی تیاری کر رہی تھیں۔ زیورات کے کئی سیٹ مسہری پر بکھرے ہوئے تھے۔ الٰہی بخش دستک دے کر کمرے میں گیا تو انہوں نے پلٹ کر اسے دیکھا "آؤ الٰہی بخش، ایک کام ہے تم سے۔"

"حکم کریں بیگم صاحبہ۔"

"پھول والوں کی دکان دیکھی ہے نا تم نے؟" الٰہی بخش نے اثبات میں سر ہلایا۔

"وہاں سے گجرے اور پھول لانے ہیں۔" انہوں نے تفصیل سے اسے سمجھایا، اور پرس سے سو روپے نکال کر اسے دیئے۔

"ابھی لایا بیگم صاحبہ۔"

الٰہی بخش پھول لینے چلا گیا۔ واپس آیا تو گھر کی فضا بھی بدلی ہوئی تھی۔ گھر میں قدم رکھتے ہی اسے اس بات کا احساس ہو گیا۔ بیگم صاحبہ کے کمرے سے اونچی آوازیں آ رہی تھیں۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ اس نے بیگم صاحبہ کے کمرے کے دروازے پر دستک دی اور اندر چلا گیا۔

اندر گھستے ہی اس کے احساس کی تصدیق ہو گئی۔ کمرے میں تمام نوکر اور گھر کے تمام لوگ موجود تھے۔ نوکروں کے چہرے ستے ہوئے تھے اور مالکوں کے چہرے سرخ ہو رہے تھے۔

"میں پھول لے آیا بیگم صاحبہ۔" الٰہی بخش نے کہا۔

"اور انگوٹھی کا کیا کیا؟"

"کون سی انگوٹھی بیگم صاحبہ؟"

"وہی جو تم مسہری سے اٹھا لے گئے تھے!"

اب الٰہی بخش کا چہرہ بھی تمتما اٹھا ”میں تو مسہری کے قریب گیا بھی نہیں تھا!“ اس نے احتجاج کیا ”وہاں دیکھا تھا کہ آپ کے زیورات مسہری پر بکھرے ہوئے ہیں۔“

خود سے بتادو تو اچھا ہے، ورنہ میں پولیس میں رپورٹ کردوں گی۔ وہ سچ اگلوانا جانتے ہیں۔“

”بیگم صاحبہ، آپ مجھے چور سمجھتی ہیں؟“ الٰہی بخش کے لہجے میں حیرت اور دکھ تھا۔

”میں تو شروع ہی سے تمہیں چور اور بے ایمان سمجھتی ہوں۔“

”تو پھر آپ کو مجھے ملازم رکھنا ہی نہیں چاہیے تھے!“

”میں نے تو نہیں رکھا تمہیں۔ شیخ صاحب کو بھی منع کیا تھا!“

”بس تو اب مجھے پولیس کے حوالے کردیں۔ جو میں نے کیا نہیں، وہ تو میں موت کے فرشتے کے سامنے بھی تسلیم نہیں کروں گا۔“ الٰہی بخش نے کہا اور کمرے میں موجود ایک ایک چہرے کو غور سے دیکھا۔ شیخ صاحب کے چہرے پر ندامت اور آنکھوں میں معذرت تھی۔ سادی کے ہونٹ لرز رہے تھے۔ پتا چل رہا تھا کہ وہ صرف باپ کے لحاظ سے زبان کو قابو میں رکھنے کی کوشش کر رہی ہے۔ جمیلہ اور کرمو کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

”میں یہی کروں گی۔ اس وقت تو شادی میں جانا ہے۔ واپسی تک میری انگوٹھی مجھے مل جانی چاہیے، ورنہ تم حوالات میں ہی ہوگے!“

”بس بیگم صاحبہ، بہت ہوگیا۔ شیخ صاحب بولے ”میں آپ سے کہہ چکا ہوں کہ ہمارے ملازمین میں کوئی بھی ایسا نہیں ہے۔ مگر آپ ساری حدیں پھلانگتے جارہی ہیں۔“

”تو پھر میری انگوٹھی کہاں گئی؟“

”اپنی چیز کا آدمی خود ذمے دار ہوتا ہے۔ بجائے انگوٹھی تلاش کرنے کے آپ نے دوسروں کو چور بنانا شروع کردیا۔

”بس اب پولیس ہی یہ مسئلہ حل کرے گی۔“

”آپ اپنا یہ شوق بھی پورا کریں۔“ شیخ صاحب نے سرد لہجے میں کہا ”میں پولیس کے سامنے اس شبہ کا اظہار کروں گا کہ کسی نوکر کو پھنسانے کے لئے آپ نے خود ہی انگوٹھی کہیں چھپادی ہے!“

”آپ... آپ...“ بیگم صاحبہ گنگ ہوگئیں۔

”اور دیکھ لیجئے گا، انگوٹھی آپ کے کمرے میں ہی سے ملے گی اور اب آپ شادی کو تو بھول جائیں۔ دل چاہے تو ابھی پولیس کو بلالیں، ورنہ بہتر یہ ہے کہ انگوٹھی کو کمرے میں ہی تلاش کرلیں۔“ شیخ صاحب نوکروں کی طرف متوجہ ہوئے ”تم لوگ جاؤ، میں تم سے معافی چاہتا ہوں۔“

الٰہی بخش کرمو اور جمیلہ کمرے سے نکل آئے۔ اندر بیگم صاحبہ کہہ رہی تھیں ”سنیں... شادی میں دیر ہوجائے گی۔“

”میں نے کہا نا کہ شادی کو بھول جائیے۔ اب پہلے یہ مسئلہ حل ہوگا۔ جس طرح آپ پسند کریں۔“

بیگم صاحبہ جانتی تھی کہ اب شیخ صاحب ماننے والے نہیں۔ ”ٹھیک ہے، میں دیکھ لیتی ہوں لیکن میں بتارہی ہوں کہ یہ آپ کے چہیتے الٰہی بخش کی حرکت ہے۔“

پانچ منٹ کے اندر انگوٹھی ڈریسنگ ٹیبل کی دراز میں پڑی مل گئی۔ بیگم صاحبہ کا بس چلتا تو اسے چھپا دیتیں۔ لیکن شیخ صاحب ان کے سر پر مسلط تھے ”اب سوچیں کہ پولیس کو بلاتیں تو اس وقت آپ کی کیا پوزیشن ہوتی؟“ شیخ صاحب نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔

”ایسی خاص بات نہیں، غلطی انسان ہی سے ہوتی ہے۔“ بیگم صاحبہ نے بے پروائی سے کہا۔

”آپ کو معلوم ہے کہ کسی پر تہمت لگانا کتنا بڑا گناہ ہے؟“ سادی بولی۔

"اب تم مجھے اخلاق نہیں پڑھاؤ!" بیگم صاحبہ نے جھنجلا کر کہا۔

"آپ کو خود چل کر ان سے معافی مانگنا چاہیے۔" شیخ صاحب نے کہا۔

یہ بات آپ ہی سوچ سکتے ہیں!"

"سوچنے کی بات نہیں۔ میں اس پر عمل کراؤں گا۔" شیخ صاحب نے زور دے کر کہا" ورنہ ابھی میں خود آپ کا میکے جانے کا شوق پورا کروں گا۔ مجھے صرف اتنا بتائیں کہ آپ شادی میں جانا چاہتی ہیں یا اپنے میکے؟" شیخ صاحب نے اس لہجے سے رخسانہ بیگم خوب واقف تھیں "چلئے" انہوں نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔

☆

الٰہی بخش اپنے کوارٹر میں بیٹھا الجھ رہا تھا۔ اسے یہ دکھ تھا کہ عشق سے پہلے وہ بہت خوددار ہوا کرتا تھا مگر اب وہ بہت کچھ سن کر پی جاتا تھا۔ پچھلی بار بیگم صاحبہ نے اسے حرام خور کہا تھا۔ الٰہی بخش کا اپنا ایک ضابطہ اخلاق تھا۔ اس کی رو سے وہ کسی کو مطلع کئے بغیر بھی یہاں سے جا سکتا تھا۔ اتنا کچھ سننے کے بعد اس کی یہ ذمے داری نہیں تھی کہ نوکری چھوڑنے کا اعلان کرے اور پھر جائے۔

لیکن اتنا کچھ ہونے کے بعد بھی اس کے دل میں یہاں سے جانے کا خیال نہیں آیا تھا۔ شیخ صاحب بلاشبہ بہت اچھے انسان تھے اور وہ ان کا احترام کرتا تھا لیکن ان کے احترام میں وہ اس توہین کو نہیں پی سکتا تھا، البتہ سادی کے عشق میں اتنی قوت تھی کہ وہ اسے جانے نہیں دے رہا تھا۔

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے جا کر دروازہ کھولا اور حیران رہ گیا" سر جی آپ؟" اس نے بیگم صاحبہ کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں الٰہی بخش!" شیخ صاحب نے کہا اور رخسانہ بیگم کی طرف دیکھا۔

"انگوٹھی مل گئی ہے الٰہی بخش!" بیگم صاحبہ نے کہا" میری ڈریسنگ ٹیبل کی دراز میں تھی۔"

"بڑی خوشی کی بات ہے بیگم صاحبہ!" الٰہی بخش نے خشک لہجے میں کہا۔

"بس؟" شیخ صاحب نے کڑے لہجے میں رخسانہ بیگم صاحبہ سے کہا" یہی کہنے کے لئے یہاں آئی ہیں آپ؟"

"دیکھئے شیخ صاحب، آپ مجھ سے یہ امید نہ رکھیں کہ میں ایک نوکر سے معافی مانگوں گی۔" رخسانہ بیگم صاحبہ نے کڑے لہجے میں کہا۔

شیخ صاحب کچھ کہنے ہی والے تھے مگر ان سے پہلے ہی الٰہی بخش بول اٹھا" سر جی، معافی سے تو میں شرمندہ ہوں گا۔ اس کی ضرورت نہیں مگر گستاخی معاف، میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

"کہو الٰہی بخش!"

”سر جی، پہلے میرے باپ نے رزق حلال پر میری پرورش کی، پھر مجھے اس کی تلقین کی۔ اللہ گواہ ہے سر جی، میں نے کبھی چوری، بے ایمانی، حرام خوری نہیں کی۔ انسان ہوں، لاعلمی میں تو خطا ہو سکتی ہے مگر میں ہمیشہ ان چیزوں سے بچتا رہا۔ ایک بار پہلے بیگم صاحبہ مجھے حرام خور کہہ چکی ہیں۔ میں صرف اس لئے نوکری چھوڑ کر نہیں گیا کہ آپ کا احسان مانتا ہوں۔ آپ کی عزت کرتا ہوں۔ آج انہوں نے مجھے بلاوجہ چور اور بے ایمان کہہ دیا اور یہ بھی کہا کہ یہ شروع ہی سے مجھے ایسا سمجھتی ہیں۔ اب آپ بتائیں، اس صورت میں میرا یہاں کام کرنا مناسب ہے؟“

شیخ صاحب نے ملامت بھری نظروں سے بیوی کو دیکھا ”آپ کو اپنی زیادتی کا احساس بھی نہیں؟“

بیگم صاحبہ کے چہرے پر بڑی سی بگھرگئی ”مجھے احساس ہے۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کہوں گی۔“ یہ کہہ کر وہ پلٹیں اور گھر کی طرف چلی گئیں۔

شیخ صاحب چند لمحے مجرم بنے سر جھکائے کھڑے رہے۔ پھر انہوں نے کہا کہ ”بیٹے الٰہی بخش، میں شرمندہ ہوں۔ انشاء اللہ آئندہ ایسی کوئی حرکت نہیں ہوگی۔“

”سر جی، مجھے شرمندہ نہ کریں۔ میں آپ کو شرمندہ نہیں دیکھ سکتا۔ میرے لئے یہ مر جانے کے برابر ہے۔“

شیخ صاحب بھی پلٹ کر چلے گئے۔ الٰہی بخش کوارٹر میں چلا آیا۔

وہ شاید دستک ہی کا دن تھا۔ شیخ صاحب کے جانے کے کوئی ایک گھنٹے بعد پھر دستک ہوئی۔ اس بار دروازے پر کرمو تھا ”بیٹے، تمہیں سادی بی بی نے بلایا ہے۔“

الٰہی بخش کہنا چاہتا تھا کہ اب میں گھر میں قدم رکھ کر ایک بار اور چور نہیں بننا چاہتا۔

لیکن اس کے اندر سے کسی نے ملامت بھرے لہجے میں کہا، سادی کا حکم ٹالے گا۔ اپنی توہین کا بدلہ اس سے لے گا!

”تم جاؤ کرمو بابا، میں ابھی آتا ہوں۔“ الٰہی بخش نے کہا۔

پانچ منٹ بعد الٰہی بخش بنگلے میں داخل ہوا تو وہاں سناٹا تھا۔ بات سمجھ میں آنے والی تھی۔ سب لوگوں کو شادی میں جانا تھا مگر سادی کیوں نہیں گئی؟“

اس نے سادی کے کمرے کے دروازے پر دستک دی ”آجاؤ الٰہی بخش!“ اندر سے سادی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

الٰہی بخش کمرے میں داخل ہوا۔ سادی مسہری پر بیٹھی تھی۔ اس کی متورم آنکھوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ روتی رہی ہے۔ اسے اس حال میں دیکھ کر الٰہی بخش کا دل کٹنے لگا۔ ”یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے سادی بی بی؟“ اس نے دل گرفتگی سے کہا۔ ”اور آپ شادی میں بھی نہیں گئیں؟“

”اتنا کچھ ہو جانے کے بعد جا سکتی تھی؟“ سادی نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

”کچھ بھی تو نہیں ہوا سادی بی بی، دیکھیں، میں تو دکھی نہیں، بلکہ خوش ہوں۔“

”یہ تو تمہاری بڑائی ہے، جو اللہ نے تمہیں دی ہے۔ لیکن میں تم سے شرمندہ ہوں الٰہی بخش، میں امی کی طرف سے تم سے معافی مانگتی ہوں۔“

”مجھے گناہ گار نہ کریں سادی بی بی؟“

”امی انسان نہیں ہیں!“

”ایسا نہ کہیں، وہ آپ کی ماں ہیں۔ بہت محترم ہیں آپ کے لئے۔“ الٰہی بخش نے کہا پھر پوچھا ”میرے لئے کیا حکم ہے سادی بی بی؟“

”یہاں آؤ... میرے قریب۔“

الٰہی بخش مسہری کے قریب چلا گیا۔

”یہاں بیٹھو.... میرے پاس“ سادی نے مسہری کی طرف اشارہ کیا۔

”سادی بی بی، یہ میرا مقام نہیں۔“

''یہی تو دشواری ہے کہ تمہیں اپنے مقام کا علم نہیں۔ بہر حال میرا حکم تو نہیں ٹال سکتے۔''

الٰہی بخش بڑھا اور مسہری پر ٹک کر بیٹھ گیا۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ کوئی غیر معمولی بات ہونے والی ہے۔

''تم آج نوکری چھوڑ کر چلے کیوں نہیں گئے؟'' سادی نے پوچھا۔

''بس سادی بی بی، جی نہیں چاہا ایسا کرنے کو۔''

''اپنی عزت کا خیال نہیں تمہیں؟''

''کچھ چیزیں عزت سے بڑی ہوتی ہیں سادی بی بی!''

''ہو سکتا ہے تمہیں بڑی لگتی ہوں۔ حقیقت میں نہ ہوں گی۔''

''جب تک مجھے بڑی لگیں گی، میرے لئے تو بڑی ہی رہیں گی۔''

''ٹھیک کہتے ہو۔'' سادی نے آہ بھر کے کہا ''جانتے ہو، میں نے تمہیں کیوں بلایا ہے؟''

''نہیں سادی بی بی، جاننا چاہتا ہوں۔''

''میں چاہتی ہوں کہ تم مجھ سے محبت کرو۔''

الٰہی بخش گڑبڑا گیا۔ اس بات کا تو اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اس کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ وہ عشق کا سارا فلسفہ بھول گیا ''میں آپ سے محبت کرتا ہوں سادی بی بی!''

''ایسی یہ محبت نہیں، وہ محبت کرو جو عام لوگ کرتے ہیں!'' سادی کی آواز لرز رہی تھی ''میں چاہتی ہوں کہ تم مجھ سے محبت کرو۔'' سادی اس کی طرف کھسکی اور اس کا ہاتھ تھام لیا۔ الٰہی بخش یوں اچھل کر مسہری سے اٹھا، جیسے وہاں کسی بچھو کو دیکھ لیا ہو''یہ کیسے ممکن ہے سادی بی بی؟ آپ بہت بلند اور پاکیزہ ہیں۔''

سادی بھی اٹھ کھڑی ہوئی ''جیسا تم سمجھتے ہو، میں ویسی نہیں میں انسان ہوں۔

میری خواہشات بھی انسانی ہیں۔ میں گوشت پوست کی بنی ہوئی ہوں۔''

''میرے لئے آپ وہ ہیں، جو میری نظر میں ہیں۔ میرے لئے اہمیت صرف اس بات کی ہے۔''

سادی اس سے لپٹ گئی۔ ''میں جانتی ہوں تم میرا حکم نہیں ٹال سکتے۔''

الٰہی بخش نے نرمی سے اسے علیحدہ کر دیا''وہ حکم مانوں گا، جو آپ ہوش مندی کے عالم میں دیں گی۔ اس وقت آپ ہوش میں نہیں ہیں اور آپ تاوان کیوں ادا کرنا چاہتی ہیں۔ ؟ جبکہ میں طلب نہیں کر رہا ہوں!''

''یہ بخش تمہاری بے عزتی کی قیمت نہیں، میری خواہش بھی ہے۔'' سادی بپھر گئی ''تم نہیں جانتے، میں تم سے محبت کرتی ہوں۔''

''محبت؟'' الٰہی بخش نے حقارت سے کہا ''اسے محبت نہیں، کچھ اور کہتے ہیں۔ میں وہ لفظ زبان پر بھی نہیں لا سکتا۔''

''میں تم سے شادی نہیں کر سکتی۔ تمہیں وقتی طور پر حاصل کر سکتی ہوں۔''

''سادی بی بی، میں جا رہا ہوں۔ یہ سمجھ لیں کہ آیا ہی نہیں تھا۔'' یہ کہ کر الٰہی بخش دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

''الٰہی بخش!''

الٰہی بخش نے پلٹ کر دیکھا ''جی سادی بی بی!''

''تمہیں میرا حکم ماننا پڑے گا، ورنہ میں شور مچا دوں گی۔ کہوں گی کہ تم مجھ سے بدتمیزی کر رہے تھے۔''

''سادی بی بی، آپ نے یہ الزام لگایا تو میں اس سے انکار نہیں کروں گا۔ خدا حافظ!''

وہ باہر نکل آیا۔ سعدی کی خواہش میں ڈوبی، لرزتی ہوئی آواز دور تک اس کا پیچھا کرتی رہی لیکن اس نے نہیں سنا۔ وہ یہ آواز اپنی سماعت میں، اپنی یادداشت میں محفوظ نہیں رکھنا چاہتا تھا۔

اپنے کوارٹر میں پہنچ کر اس نے اپنی تمام چیزیں سمیٹ کر صندوق میں رکھیں اور کرمو چاچا کے پاس چلا گیا "چاچا، میرا روانگی کا حکم آ گیا ہے۔" اس نے کہا۔

"جانتا ہوں بیٹے، اب تو یہاں نہیں رہ سکتا۔ بیگم صاحب نے بڑی زیادتی کی تیرے ساتھ۔"

"چاچا صبح صاحب کو بتا دینا کہ میں اب یہاں کام نہیں کر سکتا تھا، اس لئے چلا گیا ہوں۔ ان سے کہنا، مجھے معاف کر دیں۔ میری ہر غلطی معاف کر دیں۔"

"تو کیا ابھی جائے گا؟"

"ہاں چاچا۔ اب یہاں رات گزارنا ٹھیک نہیں۔"

"کہاں جائے گا بیٹے؟"

"کینٹ جاؤں گا چاچا۔ شاید رات کی کوئی گاڑی مل جائے۔"

"میں تجھے چھوڑنے چلوں گا۔"

"نہیں چاچا، اب میں چلتا ہوں۔"

"بیٹا... میرے گھر سب کو سلام دعا پہنچا دینا۔ اللہ تجھے حفاظت سے گھر پہنچائے۔"

کرمو دین گیٹ تک الٰہی بخش کو چھوڑنے آیا۔

واپسی کا حکم اوپر ہی سے ہوا تھا۔ الٰہی بخش کو رات کو گاڑی مل گئی۔ صبح ہوتے ہوتے وہ حیدر آباد سے نکل چکا تھا۔

زندگی کا ایک اور باب مکمل ہو چکا تھا!

☆

الٰہی بخش جیسے ہی گھر میں داخل ہوا، اس کے باپ نے اس کی ماں سے کہا "دیکھ... ایسے ہوتے ہیں سعادت مند بیٹے!"

الٰہی بخش نے حیرت سے باپ کو اور پھر ماں کو دیکھا کہ شاید اس پر طنز کر رہے ہیں۔ لیکن ان کے ہونٹوں پر خیر مقدمی مسکراہٹ کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ پھر پیر بخش نے بڑھ کر محبت سے اسے لپٹا لیا۔ اس کے بعد ماں نے اسے پھر سے چھوٹا سا بچہ بنا دیا۔

سکون سے بیٹھے تو اس سے پوچھا "آپ میری سعادت مندی کی بات کر رہے تھے۔ میں نے ایسا کیا کیا... ؟"

"میں نے چار دن پہلے خط ڈالا، تو پانچویں دن آ گیا۔ خط پہنچتے ہی چل پڑا ہوگا!"

الٰہی بخش مسکرا کر خاموش ہو گیا۔ خط تو اس تک پہنچا ہی نہیں تھا، اس سے پہلے ہی حکم ہو گیا تھا۔

پہلے تین دن تو معلومات اَپ ٹو ڈیٹ ہونے میں نکل گئے کس کے ہاں بچہ ہوا، کون فوت ہوا، کون باہر چلا گیا، کس کی شادی ہوئی، کس کی طلاق ہوئی، پھر جو فوت ہوئے ان کے ہاں دعا کے لئے جانا تھا۔ ایک ہفتے بعد اسے سکون سے بیٹھنے کا موقع ملا۔ اچانک اسے خیال آیا تو اس نے باپ سے پوچھا "آپ نے خط لکھ کر مجھے کیوں بلایا تھا؟"

"خط میں وجہ بھی لکھ دی تھی۔"

"خط تو مجھے ملا ہی نہیں ابا!"

ماں اس کے پاس آ بیٹھی ”بیٹے، تیری شادی کا ارادہ کیا ہے۔“

”تیری کیا مرضی ہے بخشو؟“

”میری مرضی اب، جو تمہارا جی چاہے، کرو۔ پر ابا پیسے کی ضرورت بھی ہوگی۔“

”وہ تو ہوگی۔ پر تو فکر نہ کر سب ہو جائے گا۔“

”میں اس لئے کہہ رہا ہوں ابا کہ میرے پاس دس ہزار روپے ہیں۔“ الٰہی بخش نے صندوق سے رقم نکال کر باپ کے دامن میں ڈال دی۔

”اتنے پیسے!“ بڈھے پیر بخش کی آنکھیں پھیل گئیں۔

”اچھی نوکری تھی ابا...... اور خرچہ کوئی نہیں تھا۔“

”تو شادی کی فکر نہ کر۔ آگے کی سوچ۔ کچھ کر لے اس رقم سے۔ نوکری کی آزار سے بچ۔“

”شادی کے بعد سوچوں گا ابا۔ تم یہ پیسا اپنے پاس رکھو۔ ضرورت پڑے تو خرچ کر لینا۔ آگے اللہ مالک ہے۔“

گھر آ کے الٰہی بخش بہت خوش تھا۔ سب سے بڑی خوشی یہ تھی کہ اس کی راتیں خوب صورت ہو گئی تھیں۔ سادی ہر رات اس کے پاس آ جاتی تھی۔ سادی کی وہ آخری حرکت، بس کا ہر نقش، ہر آواز اس کے ذہن سے محو ہو چکی تھی۔ الٰہی بخش کے نزدیک وہ عشق کی آزمائش تھی۔ جس میں رب نے اسے سرخرو کیا تھا۔

دس دن کے بعد ڈاکیے نے اسے خط لا کر دیا۔ لفافے پر سادی کی تحریر دیکھ کر اس کا دل بے حال ہو گیا۔ اس نے جلدی سے لفافہ چاک کیا۔ اندر ایک اور لفافہ تھا۔ وہ ابا کا بھیجا ہوا خط تھا۔ ساتھ ایک چھوٹا سا رقعہ بھی تھا۔ اس نے بے تابی سے اسے پڑھا۔ رقعہ القاب و آداب سے محروم تھا۔

”تمہارے جانے کے بعد اگلے روز یہ خط آیا تھا۔ پیچھے تمہارا گاؤں کا پتا لکھا تھا۔ امی کہہ رہی تھیں کہ واپس کر دو، یہ تمہیں مل جائے گا۔ مگر مجھے اعتبار نہیں تھا۔ اور کیا پتا، خط اہم ہو، اسی لئے میں اسے رجسٹری کر رہی ہوں۔ امید ہے، اب تم تک ضرور پہنچ جائے گا۔ تمہاری سادی۔

نوٹ۔ معذرت کسی بات کی نہیں کر رہی ہوں۔ تم مجھے معاف بھی نہ کرنا۔“

الٰہی بخش نے ابا کا خط کھولا بھی نہیں۔ سادی کے مختصر سے رقعے کو اس کے لفافے میں رکھ کر اس نے اسے صندوق میں رکھ دیا جو اسے بہت پیارا ہو گیا تھا۔ اس میں سادی کی دی ہوئی خوشبو، سادی کے دلائے ہوئے پینٹ شرٹ اور جوتوں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔

☆

حاجرہ بیوی بن کر اس کے گھر میں آئی تو زندگی کا ایک اور باب شروع ہو گیا۔

شادی کے آٹھویں دن ابا نے اس کے دیے ہوئے پیسے اس کے ہاتھ میں رکھ دیئے "لے بیٹے، اب اس سے تو کوئی کاروبار کر لے۔"

"پر کروں کیا ابا؟"

"کچھ بھی کر لے۔ یہ رقم کم نہیں، بہت اچھا کاروبار کر سکتا ہے تو۔"

الٰہی بخش تھوڑی دیر سوچتا رہا۔ پھر بولا "ابا، فروٹ کی دکان ڈال لوں؟"

"جو مناسب سمجھ، کر۔"

الٰہی بخش نے منڈیاں چوک پر، جہاں جناح آباد کو روڈ جاتا ہے، دکان لی اور فروٹ کا کام شروع کر دیا۔ کام اس نے بڑے پیمانے پر شروع کیا تھا۔ وہ ہری پور، خان پور بلکہ راولپنڈی تک سے مال لاتا تھا۔

جس پیمانے پر اس نے کام شروع کیا تھا، کوئی اور ہوتا تو تھوڑے ہی عرصے میں کہیں سے کہیں پہنچ جاتا۔ لیکن وہ الٰہی بخش تھا۔ لوگ کہتے تھے، ایسا کاروباری، ایسا دکاندار انہوں نے کہیں نہیں دیکھا۔ دکان پر وہ دو طرح کا کام کرتا تھا۔ ایک وہ کھلا پھل بیچتا۔ دوسرے اور دکان دار اس سے پھلوں کی پیٹیاں لے جاتے۔ اس دوسرے کام میں بچت کم تھی لیکن اس کی دکان صرف اسی کے زور پر چلتی رہی، ورنہ وہ قلاش ہو جاتا۔ حالانکہ پھل بیچنے میں زیادہ منافع ہوتا ہے۔ لیکن الٰہی بخش کا مزاج، اس کا طریق کار ایسا تھا کہ اس میں منافع ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

الٰہی بخش جب اپنی دکان کے لیے پھلوں کی کوئی پیٹی کھولتا تو اچھے پھل ایک طرف کر دیتا۔ ہر پیٹی میں خراب پھل بھی ہوتے ہیں۔ کسی میں کم اور کسی میں زیادہ۔ الٰہی بخش خراب پھل کبھی نہیں بیچتا تھا۔

ایک بار ایک عورت پھل خریدنے آئی اور آلو بخارے کا بھاؤ تاؤ کرنے لگی تو الٰہی بخش نے کہا "بہن، میں دام کم نہیں کرتا۔ اس سے کم قیمت پر کہیں ملے تو لے لو۔"

آلو بخارے خوب پکے ہوئے اور اچھے خاصے تھے۔ عورت للچائی نظروں سے انہیں دیکھتی رہی پھر بولی "سامنے والی دکان سے بارہ آنے سیر مل رہے ہیں!"

"تو وہاں سے لے لو بہن، میں روپے سے کم نہیں دوں گا۔"

"اور یہ لوکاٹ کیسے دیے ہیں؟"

"یہ دس آنے سیر ہیں۔"

عورت نے دیکھا، وہ صاف ستھرے پکے ہوئے لوکاٹ تھے۔ یقیناً چن کر رکھے گئے تھے۔ اسی لمحے دوسری طرف اسے لوکاٹ کا ایک اور ٹوکرا نظر آیا۔ اس میں بہت پکے ہوئے گلنے کی حد تک داغ دار لوکاٹ تھے "یہ کیسے دے رہے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"یہ بیچنے کے لئے نہیں ہیں بہن!"

"واہ.... یہ کیا بات کی تم نے؟ دکان پر تو ہر چیز بیچنے کے لئے ہوتی ہے؟"

"جو چیز خود مجھے اچھی نہیں لگتی، وہ میں بیچتا نہیں۔ جو خود نہیں کھا سکتا، وہ دوسروں کو نہیں کھلاتا۔"

عورت ہنسنے لگی "تو پھر یہ مجھے مفت دے دو۔"

"ہاں مفت دے سکتا ہوں۔ مگر مفت دوں گا تو اپنی مرضی کے آدمی کو دوں گا، جسے میرا دل چاہے دوں گا۔"

"چلو یہ تو اچھی بات ہے کہ جو چیز تمہیں اچھی نہیں لگتی، وہ نہیں بیچتے لیکن میں اپنی مرضی سے یہ خریدنا چاہوں تو پھر؟"

"تب اور بات ہے۔ لیکن انہیں بیچ کر مجھے خوشی نہیں ہوگی۔"

''تو تم ایسے پھلوں کا کرتے کیا ہو؟''

''کچھ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں، جو پھل خرید نہیں سکتے۔ یہ پھل میں انہیں دے دیتا ہوں۔ ان کے بچے بھی پھل کھا لیتے ہیں۔ پھر بھی بچ جائیں تو بکریوں، گایوں بھینسوں کے آگے ڈال دیتا ہوں۔ یوں وہ خراب پھل بھی کارآمد ہو جاتے ہے۔''

''اچھا یہ لوکاٹ مجھے کیا بھاؤ دو گے؟''

الٰہی بخش سوچ میں پڑ گیا ''سامنے والی دوکان پر لوکاٹ کیا سیر ہے؟'' اس نے پوچھا ''آٹھ آنے''

الٰہی بخش نے عورت کو بغور دیکھا۔ وہ متوسط طبقے کی معلوم ہوتی تھی ''چلو میں تمہیں اچھے والے لوکاٹ آٹھ آنے سیر دے دیتا ہوں۔ غریبوں کا کام خراب مت کرو۔ لیکن آئندہ میری دکان پر آ کے یہ پنچایت نہ کرنا۔''

یہ تھا الٰہی بخش کے کاروبار کا اسٹائل۔ پھر وہ بامروت بھی تھا اور متواضع بھی۔ ادھار میں بھی اس کا پیسہ پھنسا رہتا تھا۔ دکان پر کوئی اس سے ملنے آتا تو وہ پھلوں سے اس کی تواضع بھی کیا کرتا۔ اکثر لوگ تو پھل کھانے کے ارادے سے ہی اس سے ملنے آ جاتے۔ ایسے میں منافع کا کیا سوال تھا۔ بس دکان داروں کو جو مال دیتا تھا، اس کی برکت سے گھر کا خرچ فراغت سے چل رہا تھا۔ الٰہی بخش اس میں بہت خوش تھا۔

الٰہی بخش نے حاجرہ کو بھی ہمیشہ خوش رکھا۔ اللہ نے اولاد کے معاملے میں بھی اسے خوب نوازا۔ پہلے اس کے ہاں مسلسل تین بیٹے ہوئے پھر بیٹی پیدا ہوئی۔ وہ اس کی بڑی لاڈلی تھی۔ الٰہی بخش بہت ذمے دار اور محبت کرنے والا شوہر اور باپ تھا۔ نماز بھی وہ باقاعدگی سے پڑھتا تھا۔ بس رات کا ایک پہر وہ اپنے لیے گزارتا تھا، اپنی ساری کے ساتھ۔ نیند اس کی بہت کم ہو گئی تھی۔ اس کا اثر اس کی صحت پر بھی پڑ رہا تھا۔ وہ اپنی عمر سے بڑا لگنے لگا تھا۔

☆

شادی کے پانچ سال بعد اماں اس کا ساتھ چھوڑ گئیں۔ ابا اس کے بچوں میں گم ہو گئے۔ وہ سب کے حقوق ادا کرتے ہوئے بھی اپنے آپ میں گم رہا۔

وہ اکیلا آدمی اور منڈی بھی جانا اور دکان بھی چلانا۔ وقت کی جیسے قلت ہو گئی تھی۔ اس روز دکان جاتے ہوئے صحن میں اس نے عجیب منظر دیکھا۔ مبشر کو ابا نے کندھے پر چڑھایا ہوا تھا۔ مدثر اور مزمل بھی دادا پر سوار ہونے کی کوشش کر رہے تھے ''مبشر، مدثر، مزمل، یہ کیا کر رہے ہو؟'' اس نے بچوں کو ڈانٹا۔

''او کچھ نہیں پتر۔ کھیل رہے ہیں مجھ سے۔'' پیر بخش نے کہا

''لیکن ابا...''

''تیری ماں کے بعد انہی میں تو میری جان اٹکی ہے۔'' پیر بخش نے کہا ''دیکھ، اب تو میں کام بھی نہیں کرتا۔ پورا وقت ان کے ساتھ گزارتا ہوں۔''

''تمہیں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ابا، میں جو ہوں۔''

''جانتا ہوں پتر۔ پر اب دکان پر آ کر تیرا ہاتھ بھی بٹایا کروں گا میں۔''

''اس کی ضرورت نہیں ابا'' الٰہی بخش نے کہا ''بس اب تم پوتوں کو سنبھالو۔''

پیر بخش نے پوتوں کو بڑی محبت سے دیکھا اور مبشر کو سینے سے بھینچ لیا ''یہ مبشر تو میری جان ہے۔ پتا ہے، تو چھوٹا سا تھا تو ایسا ہی تھا۔''

الٰہی بخش، باپ کو محبت بھری نظروں سے دیکھتا رہا۔ پھر بولا ''چلتا ہوں ابا۔ آج منڈی نہیں جانا تھا، اس لیے اتنا وقت بھی مل گیا۔''

پیر بخش نے پیچھے سے اسے پکارا ''پتر... آج مبشر کی بسم اللہ کرانی ہے۔''

الٰہی بخش بیٹا" اچھا ابا.... اتنا بڑا ہو گیا یہ!" اس کے لہجے میں حیرت تھی، پھر اس نے بہت نرم، محبت بھرے لہجے میں کہا" ابا.... آج اسے بھی پہلا اور آخری سبق پڑھا دینا۔" وہ گھر سے نکل گیا۔

☆

وقت دھیرے دھیرے دبے پاؤں گزرتا رہا۔ کچھ چیزیں الٰہی بخش کبھی نہیں بھولا۔ اپنی کچھ محرومیوں کی اس نے تلافی کرنے کی کوشش کی بچوں کے ذریعے ....بچوں کے نام رکھنے کے معاملے میں بھی اس نے روایت سے بغاوت کی۔ مدثر، مزمل، اور مبشر شاید وہ نام حرف م سے اس کی محبت کا اظہار تھے۔ اور شاید بیٹوں کے شہری انداز کے نام اس نے اس لئے بھی رکھے تھے کہ ان کی زندگی میں کوئی سادی آئے تو کم از کم نام کی رکاوٹ موجود نہ ہو۔

دینی تعلیم تو خیر لازمی تھی، مگر اس نے انہیں انگریزی اسکول میں داخل کرایا۔ وہ انکے لئے ہمیشہ نیکر اور پینٹ بڑے شوق سے لاتا۔ لیکن مبشر کے سوا کوئی اسکی توقعات پر پورا نہیں اترا۔ حافظ قرآن تو سب ہو گئے لیکن مبشر کے سوا کسی نے پڑھ کر نہیں دیا۔ الٰہی بخش کو اسکا غم بھی نہیں تھا۔ خوشی اللہ نے اسے مبشر کے ذریعے دے دی تھی اور وہ ناشکرا نہیں تھا۔ مدثر اور مزمل نے اسکول چھوڑے تو وہ انہیں دکان پر لے گیا۔ وہ اسکا ہاتھ بٹانے لگے۔

الٰہی بخش کا خیال تھا کہ ابا یہ سب کچھ نہیں سمجھ سکے گا۔ لیکن وہ غلطی پر تھا۔ پیر بخش کی دانش کو سمجھ کر بھی وہ نہیں سمجھ سکا تھا۔

بچوں کے بعد ماسٹر جی ہی تھے، جو پیر بخش کے سنگی تھے۔ حاجرہ کی شادی اور بیوی کی موت کے بعد وہ اکیلے رہ گئے تھے۔ بہت اصرار کے باوجود انہوں نے بیٹی کے ساتھ رہنا گوارا نہیں کیا۔ ہاں، اسے دیکھنے، بچوں سے ملنے وہ آتے رہتے تھے۔ انکے ساتھ وقت گزارنے کا موقع کم ہی ملتا تھا۔

ماسٹر جی نے محسوس کیا تھا کہ پیر بخش کچھ کھویا کھویا سا رہتا ہے۔ ایک دن انہوں نے اس سے پوچھ لیا" کچھ پریشان ہو پیر بخش؟"

"نہیں ماسٹر جی۔ اللہ کا بڑا کرم ہے۔ اس نے بہت خوشیاں دی ہیں۔"

"تو پھر فکر مند کیوں رہتے ہو؟"

"وہ اور بات ہے۔" پیر بخش نے آہ بھر کے کہا" بڑھاپے میں حساب کی فکر تو ستاتی ہی ہے!"

چند لمحے خاموشی رہی پھر پیر بخش نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا" کبھی خیال آتا ہے کہ میں نے بیٹے کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ وہ مجھ سے خوش نہیں ہے۔"

"وہم ہے تمہارا پیر بخش۔"

پیر بخش نے سنا ہی نہیں اپنی کہتا رہا" دیکھو نا، بیٹوں کے نام کیسے رکھے، مدثر، مبشر، مزمل۔"

"تمہاری تربیت کا اثر ہے!" ماسٹر جی بولے" حرف م سے تو عشق ہے اسے!"

"پر نام تو مختلف سے رکھے نا اس نے۔ مجھے بھی اچھے لگے۔ اب سوچتا ہوں، میں نے کیسا نام رکھا تھا اس کا! کبھی اسے شرمندگی بھی ہوئی ہوگی اپنے نام سے۔"

"کیسی باتیں کرتے ہو!" ماسٹر جی نے احتجاج کیا۔

پیر بخش اپنی کہتا رہا" جسے اپنے نام سے خوشی نہیں، شرمندگی ہو، وہ بیٹوں کے نام اپنے نام سے الگ ہی رکھے گا نا!"

"الٰہی بخش نے کبھی بات نہیں کہی۔"

"کہنے والا کب ہے وہ! پھر دیکھو، وہ بچوں کو انگریزی کپڑے پہناتا رہا.... اس نے انہیں انگریزی اسکول میں داخل کرایا.... کیوں؟"

"اس لئے کہ ہر باپ اپنے بچوں کو خود سے آگے دیکھنا چاہتا ہے۔"

"کوئی باپ اپنی اولاد میں نہیں دیکھنا چاہتا۔" پیر بخش نے دوسرا زاویہ پیش کیا۔

"تم کہنا کیا چاہتے ہو پیر بخش کیا بجھ رہے ہو؟"

پیر بخش چند لمحے سوچتا رہا پھر اس نے نظریں اٹھائیں تو ان میں اداسی تھی "مجھے لگتا ہے، نام کی، کپڑوں کی، تعلیم کی کمی سے اس کی کوئی بہت پیاری چیز اس سے چھن گئی تھی، پر اچھا بیٹا ہے نا، کبھی شکایت بھی نہیں کی اس نے!"

ماسٹر جی، پیر بخش کی دانش کے پہلے ہی قائل تھے، اور قائل ہو گئے۔ مگر انہوں نے اس کی سوچ کی حوصلہ افزائی نہیں کی، وہ بولے "کہاں کی سوچ رہے ہو پیر بخش!"

"بس، ماسٹر جی، میرا دل بتاتا ہے۔"

"لیکن مبشر کے سوا کسی نے پڑھائی میں دلچسپی نہیں لی۔"

"مبشر بالکل الٰہی بخش کی طرح ہے۔ بخشو اس سے محبت بھی بہت کرتا ہے۔ مبشر میں جان ہے اس کی۔"

"تو گاؤں میں کیا، مبشر جیسے تو شہر میں بھی دو چار ہی ہوں گے؟" ماسٹر جی کے لہجے میں فخر تھا۔

"وہ مجھے بھی بہت پیارا ہے۔" پیر بخش نے گہری سانس لے کر کہا "دیکھو، پڑھتا بھی ہے اور دکان میں ہاتھ بھی بٹاتا ہے۔"

"چلو اب تو وہ بی اے بھی کرے گا۔ الٰہی بخش کا ارمان پورا ہو جائے گا۔"

☆

مبشر بلاشبہ لاکھوں میں ایک تھا۔ نیک، سعادت مند، اطاعت شعار اور پھر تھا بھی بڑا خوب رو۔ کالج میں سادات گھرانے کی ایک بڑی پیاری لڑکی تھی۔ رابعہ رابعہ نے اسے پہلی ہی نظر میں پسند کیا۔ آہستہ آہستہ پسندیدگی محبت میں تبدیل ہوتی گئی۔

لیکن مبشر نے اسے کبھی اس نظر سے نہیں دیکھا۔ دیکھ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کے لئے تو وہ بہت محترم بہت بلند تھی۔ وہ بی بی تھی۔ باپ اور دادا نے اسے یہی سکھایا تھا۔ وہ تو اس کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

اس روز وہ کالج کی لائبریری میں بیٹھا مطالعہ کر رہا تھا۔ رابعہ آئی، اس کے پاس کھڑی ہوئی اور ٹکٹکی باندھ کر اسے دیکھنے لگی۔ وہ کتاب میں محو تھا اسے پتا ہی نہیں چلا "مبشر... سنو۔" رابعہ نے اسے پکارا۔

مبشر نے سر اٹھا کر اسے دیکھا "جی رابعہ بی بی؟"

"مجھے اسلامک اسٹڈیز کے نوٹس کی ضرورت ہے۔"

وہ اسے تکے جا رہی تھی۔ مبشر پریشان ہو گیا۔

"دے دو نا۔" رابعہ نے اسے تکتے ہوئے کہا "کل واپس کر دوں گی۔"

مبشر نے نوٹس نکال کر اسے دے دیئے۔ عافیت اسی میں تھی کہ رابعہ لائبریری سے چلی گئی۔ مبشر پھر کتاب پر جھک گیا لیکن اب اس سے کچھ پڑھا نہیں جا رہا تھا۔

☆

رابعہ مبشر کے نوٹس سامنے رکھے بیٹھی تھی۔ بظاہر وہ پڑھ رہی تھی لیکن کوئی اس کی کھوئی کھوئی آنکھیں دیکھ لیتا تو سمجھ لیتا کہ وہ اس وقت کہیں اور ہے۔ حقیقت یہ تھی کہ اس کی آنکھوں کے سامنے اس وقت مبشر کا چہرہ تھا۔ وہ از خود رفتگی کے عالم میں تھی۔

لیکن مبشر بے حد شرمیلا لڑکا تھا۔ اس نے کبھی اس کی نگاہوں کی بھی حوصلہ افزائی نہیں کی تھی۔ رابعہ خود بھی بہت شرمیلی لڑکی تھی لیکن اندر کی دھیمی دھیمی آگ اب اس کے لئے ناقابل برداشت ہوئی جا رہی تھی۔ اب وہ خوفزدہ تھی کہ اظہار نہ کیا تو وہ اس آگ میں جل کر بھسم ہو جائے گی۔

محبت کتنی طاقت ور چیز ہے۔ آدمی کو بدل کر رکھ دیتی ہے۔ اس نے پیڈ اپنے سامنے رکھتے ہوئے سوچا۔ پھر وہ لکھنے لگی۔ اس نے مشکل سے دو سطریں لکھی ہوں گی کہ اماں کے پکارنے کی آواز سنائی دی "رابعہ...... رابعہ بی بی، ذرا ادھر آنا۔"

"ابھی آئی امی۔" رابعہ نے بلند آواز میں جواب دیا۔ پھر وہ کمرے سے چلی گئی۔ پیڈ کا کھلا ورق میز پر رکھا تھا اور اس پر قلم دھرا تھا۔

یہی وہ وقت تھا کہ سلیم شاہ بہن کو پکارتا ہوا کمرے میں چلا آیا۔ "رابعہ...... رابعہ بی بی...... کہاں چلی گئی؟" اس نے اِدھر اُدھر دیکھا، پھر میز کے پاس چلا آیا۔ پہلے اس کی نظر مبشر کے نوٹس پر پڑی۔ اوپر مبشر کا نام لکھا تھا۔ پھر اس نے رائٹنگ پیڈ کو دیکھا۔

ڈیئر مبشر! تم نے مجھ پر کیا جادو کر دیا ہے...

اس سے زیادہ سلیم شاہ سے پڑھا نہیں گیا۔ غصے سے اس کا چہرہ تمتمانے لگا۔ تو یہ کھیل کھیل رہی ہے نادان بہن۔ اور وہ کم ذات...... اس نے پیڈ سے وہ صفحہ نوچا اور مٹھی میں بھینچ لیا۔ پھر وہ کمرے سے یوں نکلا جیسے مبشر کے وجود کو روند کر گزر رہا ہو۔

پانچ منٹ بعد رابعہ کمرے میں آئی تو اس نے دیکھا کہ پیڈ کا وہ ورق غائب ہے، جس پر وہ مبشر کو خط لکھ رہی تھی۔ چند منٹ اس نے اس صفحے کو اِدھر اُدھر تلاش کیا۔ پھر بے پروائی سے اپنی جگہ آ بیٹھی۔ اس نے دوبارہ لکھنا شروع کیا...... ڈیئر مبشر

☆

مبشر کالج میں داخل ہوا ہی تھا کہ رابعہ نے اسے آواز دی۔ وہ اس کی طرف چلا گیا۔ رابعہ نے اس کے نوٹس اس کی طرف بڑھائے "یہ لو مبشر۔ بہت شکریہ۔"

"کوئی بات نہیں۔"

رابعہ کی نظریں جھک گئیں۔ اس نے نظریں جھکائے جھکائے کہا "احتیاط سے رکھنا۔ ان میں کچھ رکھا ہے تمہارے لئے؟"

یہ سن کر مبشر کا تو چہرہ فق ہو گیا۔ اس نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ جس وقت سے وہ ڈر رہا تھا، وہ سر پر آ چکا تھا۔

پہلے پیریڈ کے بعد مبشر نے چوروں کی طرح نوٹس کو ٹٹولا تو اس میں رابعہ کا خط رکھا ملا۔ اس نے خط پڑھا اور اس کے باریک باریک پرزے کر ڈالے۔ اس روز کلاس میں اس کا دل ہی نہیں لگ رہا تھا۔ کیا پڑھایا جا رہا ہے، اسے کچھ خبر نہیں تھی۔

چھٹی کے بعد وہ باہر جا رہا تھا کہ لان میں بیٹھی ہوئی رابعہ نے اسے پکارا۔ پہلے تو اس نے سوچا کہ اس کو نظر انداز کر کے نکل جائے مگر اس نے ہمت کر ہی لی۔ سامنا کرنا منہ چھپانے کی نسبت بہتر نتائج لاتا ہے۔ اسے رابعہ کو سمجھانا ہوگا۔

وہ رابعہ کے پاس جا بیٹھا۔ "جی بی بی؟"

"تم نے میرا خط پڑھا؟" رابعہ نے پوچھا۔

"جی، پڑھا۔ اور پھاڑ کر پھینک دیا۔"

"کیوں......؟"

"بی بی، آپ نادانی کر رہی ہیں۔ یہ تباہی کا راستہ ہے۔"

''مگر میں کیا کروں؟'' رابعہ نے بے بسی سے کہا ''میرے اختیار میں کچھ نہیں ہے۔''

''ایسی باتیں نہ کریں۔ اللہ نے آدمی کو اپنا نائب بنایا ہے۔ انسان صرف اللہ کے سامنے بے بس ہے۔''

''تو یہ بھی اسی کی مرضی ہوگی، ورنہ میں بے بس کیوں ہوتی!''

''میں نہیں مانتا۔''

وہ انکار کر رہا تھا۔ رابعہ کی تبدیلی اور آگے بڑھ گئی۔ شرم و حیا رکھی رہ گئی ''میں نے تم سے محبت کی ہے مبشر اور یہ گناہ نہیں!''

''کمال ہے! ہماری سوچوں میں کتنا فرق ہے!'' مبشر کا لہجہ طنزیہ ہوگیا ''میں نے تو ایسا سوچا بھی نہیں لیکن پھر بھی اپنی نظر میں گناہ گار ہو گیا۔ آپ بات سمجھ ہی نہیں رہی ہیں۔ میں خاک ہوں اور آپ آسمان۔ آپ بی بی ہیں بی بی!''

''پڑھے لکھے ہو کر کیسی بیک ورڈ باتیں کرتے ہو!'' رابعہ نے ملامت آمیز لہجے میں کہا ''میں رابعہ ہوں اور تم مبشر۔ ہمارے درمیان کہیں کوئی تفریق نہیں اور عزت تو اللہ کی دی ہوئی ہے۔ اس پر غرور کرنا نازیبا ہے۔''

''میری اور آپ کی سوچ میں بہت فرق ہے بی بی۔''

رابعہ کا دل بھر آیا، وہ گڑگڑانے لگی ''مبشر میں بہت مجبور ہوں۔ تم نہیں سمجھ سکتے۔ میرے اندر کوئی طاقت ہے، جس نے مجھے بے اختیار کر دیا ہے۔''

''تو آپ کو اس سے لڑنا چاہئے۔'' مبشر نے متاثر ہوئے بغیر کہا ''انسان کا تو کام ہی برائی سے لڑنا ہے۔''

مگر یہ برائی نہیں، زندگی کی خوبصورتی ہے۔ محبت گناہ نہیں، عبادت ہے۔'' رابعہ نے تند لہجے میں کہا۔

''دیکھیں بی بی، میں ایک بات واضح کر دوں۔'' مبشر نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ''میرے دل میں ایسی کوئی بات کبھی آ ہی نہیں سکتی۔ میرے ابا اور دادا نے سادات کا احترام کرنا سکھایا ہے مجھے اور یہ بات میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ آپ میرے لئے بہت قابل احترام ہیں۔''

''حیرت ہے، تعلیم یافتہ ہوتے کے باوجود.....''

مبشر نے اس کی بات کاٹ دی ''تعلیم تربیت پر پانی پھیر دے تو وہ تعلیم نہیں رہتی بی بی۔''

''کچھ بھی ہو، میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔''

مبشر کو افسوس ہو رہا تھا کہ اسے اتنی نازک اور پیاری لڑکی سے سخت گفتگو کرنی پڑ رہی ہے۔ اور وہ سادات ہے۔ لہٰذا یہ گناہ ہے۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ یہ سختی ہی اس مستقل عذاب سے نجات دلا سکتی ہے۔ کبھی بڑے گناہ سے بچنے کے لئے چھوٹا گناہ کرنا پڑتا ہے۔ اس نے نہایت بے رخی سے کہا ''مجھے افسوس ہے بی بی۔ میں کبھی اس انداز میں نہیں سوچ سکوں گا۔ آپ کو اپنی سوچ بدل لینی چاہئے، ورنہ مایوسی ہوگی۔'' یہ کہہ کر وہ اٹھا اور گیٹ کی طرف چل دیا۔

رابعہ اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ اس نے اپنے دل کو ٹٹولا۔ وہاں اس ضدی کی تصویر اب بھی ویسے ہی موجود تھی!

☆

اس روز پیر بخش بھی دکان پر آیا ہوا تھا۔ وہ الٰہی بخش کے پاس بیٹھا تھا۔ الٰہی بخش کی نظر سلیم شاہ پر پڑی، جو دکان کی ہی طرف آ رہا تھا، الٰہی بخش تیزی سے اٹھا اور اس کی پیشوائی کے لئے دکان سے نکلا "سلام علیکم باجی۔" اس نے سلیم شاہ کا ہاتھ چوما۔

پیر بخش بھی اٹھ کر کھڑا ہوا "آؤ باجی۔۔۔ بیٹھو۔"

"میں بیٹھنے نہیں آیا ہوں پیرو چاچا۔" سلیم شاہ نے بے رخی سے کہا "میں تمہیں خبردار کر رہا ہوں۔ پھر شکایت نہ کرنا۔"

"ہوا کیا ہے باجی۔۔۔ کچھ کہو تو۔" پیر بخش نے تحمل سے کہا۔

"مبشر کو سمجھا لو چاچا۔ عزت کے لئے ہم جان بھی دے سکتے ہیں ۔۔۔ اور لے بھی سکتے ہیں!" سلیم شاہ نے بے حد خراب لہجے میں کہا۔

"میری سمجھ میں اب بھی نہیں آیا کہ بات کیا ہے۔"

"اتنی عمر ہو گئی پیرو چاچا اور کہتے ہو، سمجھ نہیں آئی۔ نہیں جانتے کہ ایسی باتیں اس سے زیادہ بتائی بھی نہیں جا سکتی۔"

اب پیر بخش سمجھ گیا "دیکھو باجی، تمہیں ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ نسلیں گزر گئیں، ہمارے ہاں نہ آج تک ایسی بات ہوئی ہے، نہ ہی آئندہ کبھی ہوگی۔" اس کے لہجے بلا کا اعتماد تھا۔

"پہلے نہیں ہوئی ہوگی، پر اب ہو رہی ہے۔ لیکن میں ہونے نہیں دوں گا چاچا۔" سلیم شاہ بپھر گیا۔

"میں نہیں مانتا کہ مبشر ایسا کر سکتا ہے۔ دیکھو باجی، خرابی اندر ہو تو اسے باہر ٹھیک نہیں کرتے۔ اس طرح خرابی ختم نہیں ہوتی۔"

الٰہی بخش حیران رہ گیا۔ بابا کیسی بات کر رہا ہے۔ اس کا دل کانپ گیا۔ اس نے جلدی سے مداخلت کی "کیسی بات کرتے ہو ابا؟"

"مجھے پورا بھروسہ ہے مبشر پر۔" پیر بخش نے جھنجلا کر کہا۔

الٰہی بخش گڑگڑانے لگا "ایسی بات نہ کرو ابا۔"

پیر بخش کے لہجے میں نرمی اور عاجزی آ گئی "کیوں نہ کروں پتر۔ اپنی اولاد کا پتا ہے مجھے۔" پھر سلیم شاہ کی طرف مڑا اور بڑی لجاجت سے بولا "آپ اپنی طرف کو سنبھالو باجی، ہماری طرف سے آپ کو شکایت نہیں ہوگی۔"

"مجھے جو سمجھانا تھا، سمجھا دیا چاچا۔ آگے تم ذمے دار ہو۔" سلیم شاہ نے سرد لہجے میں کہا۔

"آپ فکر نہ کرو سلیم شاہ۔" الٰہی بخش نے سلیم شاہ کا ہاتھ تھام کر بڑی محبت سے کہا "میں مبشر سے بات کروں گا۔"

پیر بخش کو اس کی بات اچھی نہیں لگی لیکن اس نے کچھ کہا نہیں۔

سلیم شاہ چلا گیا۔ دونوں اپنی اپنی سوچوں میں اکیلے ہو گئے۔ الٰہی بخش کو باپ پر حیرت ہو رہی تھی۔ یہ اس کا ردعمل تو نہیں لگ رہا تھا۔ پھر اس کی سمجھ میں بات آ گئی۔ دادا باپ سے بڑا ہوتا ہے۔ باپ کی حیثیت سے ساری سختی ختم کر دینے کے بعد دادا بن کر اس کے پاس محبت ہی محبت رہ جاتی ہے، یہی بات ہے۔

☆

اس رات کھانے کے بعد صحن میں الٰہی بخش کے سامنے مبشر مجرموں کی طرح کھڑا تھا۔ پیر بخش بیٹھا حقہ گڑگڑا رہا تھا۔

''ابا تمہاری قسم، میرے دل میں ایسا کوئی خیال بھی کبھی نہیں آیا، جس سے شرمندگی ہو مجھے یا تمہیں۔'' مبشر نے کہا۔

پیر بخش الٰہی بخش پر الٹ پڑا۔ ''تو خواہ مخواہ اس کے پیچھے نہ پڑ پتر۔ میں نے کہا تھا نا!''

''وہ تو ٹھیک ہے ابا۔ پر یہ معاملہ سنگین ہے۔ تم تو جانتے ہو، بات کہیں بھی پہنچ سکتی ہے۔'' الٰہی بخش بولا۔

''تو بی بی کو قائل کرسکتا ہے تو کر۔'' پیر بخش نے کہا۔ ''دیکھ پتر اپنا گھر، اپنے بچے تو باجی لوگوں کو ہی سنبھالنے ہیں نا۔ تو اور میں کیا کرسکتے ہیں!''

''نہ ابا ان کی ذمے داری بھی ہماری ہے۔ یہ تو ہماری آخرت کا سوال ہے۔ ہمیں ہی کچھ کرنا ہوگا۔''

''کیسی بات کرتا ہے پتر۔ جوان بیٹے کو چوڑیاں پہنا کر گھر میں بٹھائے گا کیا؟''

الٰہی بخش کی نگاہوں میں خفیف سی ملامت جھلکی ''مجھے خوب سکھایا ابا۔ اور خود احترام بھول گئے !''

''او نہیں پتر۔ بھول سکتا ہوں کیا۔ پر دوش اپنا نہ ہو تو .....''

''تو بھی سر جھکانا چاہیے ابا۔'' الٰہی بخش نے جلدی سے کہا، پھر وہ مبشر کی طرف مڑا۔ ''تو نے کیا سوچا ہے پتر؟''

''مجھے کیا سوچنا ہے ابا! جو بات تھی، بتادی۔ اب تم حکم کرو ابا۔''

الٰہی بخش چند لمحے سوچتا رہا۔ پھر اس نے سر اٹھاتے ہوئے کہا ''تو کالج جانا چھوڑ دے پتر۔''

پیر بخش بری طرح بھڑکا۔ مبشر کی تعلیم الٰہی بخش کی ہی سب سے بڑی خواہش تھی اور وہ اس سے دستبردار ہو رہا تھا۔ تاہم کوئی ردعمل ظاہر کرنے کے بجائے اس نے پوتے کی طرف دیکھا۔

مبشر نے ایک لمحہ جھجکے بغیر کہا ''ٹھیک ہے ابا، جو حکم تمہارا۔''

''خفا تو نہیں ہے مجھ سے؟'' الٰہی بخش کے لہجے میں افسردگی تھی۔

''کیسی بات کرتے ہو ابا!'' مبشر نے برا مانتے ہوئے کہا ''میں تو تمہاری خوشی میں خوش ہوں۔ ہر بات مانی ہے تمہاری۔ تم نے جو پہنایا پہن لیا تمہاری خاطر ہی تعلیم پر توجہ دی۔ تمہاری مرضی میرے لئے حکم ہے ابا۔''

الٰہی بخش نے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا ''اللہ جی کس منہ سے تیرا شکر ادا کروں۔ کیسی سعادت مند اولاد دی ہے تو نے۔''

''ابا ... ایک بات کہوں؟''

''کہہ پتر۔''

''کالج کے دن تھوڑے ہیں۔ نہیں جاؤں گا تو کوئی حرج نہیں، پر ابا، میرا بی اے کے امتحان کا آخری سال ہے، امتحان تو دے سکتا ہوں نا؟''

''ہاں بیٹے، میں تو بس کالج سے روک رہا ہوں۔ تیرا بی اے کرنا تو میری بہت بڑی خوشی ہے۔''

''شکریہ ابا۔''

مبشر کمرے میں چلا گیا۔ پیر بخش الٰہی بخش کو محبت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا ''تو اس سے بھی اچھا بن گیا پتر، جیسا میں بنانا چاہتا تھا!'' اس کے لہجے میں فخر تھا۔

''اللہ کا شکر ادا کرو ابا۔'' الٰہی بخش نے عاجزی سے کہا۔

☆

لیکن جس بات کو ہونا ہوتا ہے، وہ کسی طرح نہیں رکتی!

اس روز مبشر منڈیوں سے گھر آ رہا تھا۔ وہ گھر سے چند قدم دور تھا کہ اچانک کھیت کی طرف سے رابعہ نکل کر اس کے سامنے آ گئی۔ ''تم نے کالج آنا کیوں چھوڑ دیا مبشر؟'' اس نے پوچھا۔

مبشر نے حیرت اور گھبراہٹ سے اسے دیکھا ''بی بی.....آپ یہاں؟''

''تم کالج نہیں آؤ گے تو میں تم سے ملنے یہاں آ جاؤں گی۔'' رابعہ نے کہا پھر مسکرا کر پوچھا ''کالج آنا کیوں چھوڑ دیا تم نے؟''

''آپ کی مہربانی سے!'' مبشر نے تلخ لہجے میں کہا ''سلیم بھائی نے ابا سے شکایت کی تھی۔ دھمکی بھی دی تھی۔''

''مگر مجھے کوئی نہیں روک سکتا۔''

''مجھ پر رحم کرو بی بی۔ جو تم چاہتی ہو، وہ میں سوچ بھی نہیں سکتا۔'' مبشر گڑگڑانے لگا۔

''ایسی باتیں مت کرو۔ تم مرد ہو۔'' رابعہ نے سخت لہجے میں کہا۔

''یہ کیسی محبت ہے بی بی؟'' مبشر کے لہجے میں فریاد تھی ''آپ نہ صرف مجھے بلکہ میرے ماں باپ اور دادا کو بھی ذلیل کرائیں گی۔ میں کبھی ابا سے نظر نہیں ملا سکوں گا۔''

''میں کیا کروں مبشر، بہت مجبور ہوں میں.....''

خدا کے لیے مجھے بھول جائیے۔ یہ خیال دل سے نکال دیجیے۔''

''کیسے مرد ہو! عورت کے سامنے گڑگڑاتے ہو!''

اسی لمحے اچانک کھیتوں کی طرف سے سلیم نمودار ہو گیا ''میں نے پہلے ہی خبردار کیا تھا مبشر۔ اب میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' اس نے للکارا۔

اس للکار کی گونج گھر کے صحن میں کھڑے پیر بخش نے بھی سنی۔ سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ وہ تیزی سے کمرے کی طرف لپکا، اس نے صندوق میں سے پستول نکالا اور دروازے کی طرف جھپٹا۔

باہر سلیم شاہ نے ریوالور نکال لیا تھا۔ رابعہ کے سامنے گڑگڑانے والا مبشر اس کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے چہرے پر بے خوفی تھی ''میں خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرتا سلیم شاہ!'' اس نے مستحکم لہجے میں کہا ''میں تم سے نمٹ سکتا ہوں لیکن ابا اور دادا کو دکھ نہیں دینا چاہتا۔''

سلیم شاہ نے ریوالور لہرایا ''میں نے سب کو بتا دیا تھا مبشر!''

رابعہ لپک کر مبشر کے سامنے کھڑی ہو گئی ''بے انصافی نہ کر بھائی۔ اس کا قصور نہیں ہے۔''

''رابعہ بی بی! تو ہٹ جا سامنے سے!'' سلیم شاہ نے گرج کر کہا۔

''بھائی، قصوروار میں ہوں۔ میں اس سے ملنے آئی ہوں!''

''تو پھر پہلے تو ہی جا!'' سلیم شاہ نے دانت پیستے ہوئے کہا ''لیکن چھوڑوں گا اسے بھی نہیں!''

سلیم شاہ کا ریوالور والا ہاتھ نیچے آ رہا تھا۔ لبلبی پر انگلی کا دباؤ بڑھ رہا تھا۔ اسی لمحے پیر بخش پستول ہاتھ میں لیے گھر سے نکلا۔ وہ ان کی طرف جھپٹا لیکن اس کے ان تک پہنچنے سے پہلے گولی چلی اور رابعہ دونوں ہاتھوں سے اپنا پیٹ تھامے گرتی چلی گئی۔

سلیم شاہ کی انگلی دوبارہ ٹریگر پر تھی۔ عین وقت پر پیر بخش پوتے کے سامنے آ گیا۔

پیر بخش کا خون دیکھ کر سلیم شاہ کے اوسان خطا ہو گئے۔ وہ اندھا دھند ایک طرف بھاگ کھڑا ہوا۔

☆

پیر بخش زخمی حالت میں اسپتال کے بستر پر پڑا تھا۔ الٰہی بخش نے اس کے کان کے قریب منہ لے جاتے ہوئے کہا "یہ کیا ہو گیا ابا؟"

پیر بخش کی آواز بہت کمزور تھی "یہ تو ہونا تھا پتر۔ اس کے بغیر یہ معاملہ نہیں نمٹتا۔"

"اب کیا کرنا ہے ابا؟"

"سلیم شاہ باجی کہاں ہے پتر؟"

"اپنے گھر پر ہے ابا۔ میں باجی لوگوں کے پیروں میں پڑ گیا تھا کہ وہ ہمارے گھر میں ہی محفوظ رہے گا۔ وہ یقین نہیں کر رہے تھے۔" وہ کہتے کہتے رکا "تم بالکل فکر نہ کرو ابا اسے ہتھکڑی نہیں لگنے دوں گا۔"

"ایک کام کر دے پتر .... میرے پستول کا گھوڑا چڑھا دینا۔"

"یہ کام میں پہلے ہی کر چکا ہوں ابا۔ سب سمجھ میں آ گیا تھا میری۔" الٰہی بخش نے کہا "بلکہ میں نے تو دو فائر بھی کر دیئے!"

پیر بخش کے ہونٹوں پر کمزوری سی مسکراہٹ ابھری "او تو کتنا اچھا پتر ہے الٰہی بخش مجھے معلوم ہی نہیں تھا!"

"تمہاری دعا اور رب کا کرم ہے ابا۔" الٰہی بخش باپ پر اور جھک گیا "ایک بات اور ہے ابا۔" اس نے رازدارانہ لہجے میں کہا "ہر طرف سے چوکس رہنا چاہئے بندے کو۔ یہ بتاؤ، خون تم معاف کرو گے یا مجھے کرنا ہے؟"

پیر بخش نے آہستہ سے کہا "جسے سعادت مل جائے پتر۔" ذرا سے توقف کے بعد وہ بولا "رب عزت دینے والا ہے پتر۔ وہ مجھے اس زخم سے نہیں مرنے دے گا۔"

"میں ڈاکٹر سے پوچھتا ہوں ابا۔"

پیر بخش نے محسوس کیا کہ اس لمحے اس کے اور بیٹے کے درمیان مکمل ہم آہنگی موجود ہے، دونوں ایک ہی انداز میں سوچ رہے تھے۔ دونوں کو ایک ہی فکر تھی۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ یہ قتل نہ رہے، بلکہ قدرتی موت ہو۔ موت سے لڑتے ہوئے پیر بخش کا سینہ فخر کے احساس سے پھول گیا۔ مگر فوراً ہی اس کا دل سجدے میں چلا گیا "سب تیری دین ہے رب۔ بندے کا اپنا تو کچھ بھی نہیں ہوتا۔ پر توصلہ اسے ہی دیتا ہے۔"

ادھر الٰہی بخش ڈاکٹر سے پوچھ رہا تھا "ڈاکٹر صاحب ابا بچ جائیں گے نا؟"

"خون بہت بہہ گیا ہے، حالت خطرے سے باہر نہیں ہے" ڈاکٹر نے صاف گوئی سے کام لیا۔

الٰہی بخش چند لمحے سر جھکائے ہوئے سوچتا رہا۔ پھر اس نے سر اٹھایا تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے "ڈاکٹر صاحب اگر ابا اس زخم کی وجہ سے نہیں، کسی اور سبب سے ختم ہو گئے تو کیا ہو گا۔"

ڈاکٹر نے الجھن بھری نظروں سے اسے دیکھا "میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا!"

"میرا مطلب ہے، پھر یہ قتل کا کیس تو نہیں بنے گا؟"

ڈاکٹر اسے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اسے حیرت تھی۔ باپ موت سے لڑ رہا ہے، بیٹے کی آنکھوں میں آنسو ہیں مگر وہ یہ سوچ رہا ہے کہ یہ قتل کہلائے گا یا نہیں؟ اس نے سر جھٹکتے ہوئے کہا "قانون کا تو مجھے علم نہیں مگر موت کا سبب وہ لکھا جائے گا جو ہو گا۔"

الٰہی بخش نے پرخیال لہجے میں کہا "قدرتی موت پر قتل کا مقدمہ تو نہیں چل سکتا؟"

"مسئلہ کیا ہے؟" ڈاکٹر نے پوچھا "کیا گولی چلانے والا تمہارا رشتے دار ہے؟"

"نہیں ڈاکٹر صاحب۔" الٰہی بخش نے گہری سانس لے کر کہا "ہمارا تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔"

سلیم شاہ کمرے میں چارپائی پر سہما سمٹا بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر پریشانی تھی۔ اشتعال میں گولی چلا دینا اور بات ہے لیکن قاتل کی حیثیت سے تو اپنا سامنا کرنا بھی آسان نہیں ہوتا۔ کجا کہ قانون کا .... ساری دنیا کا سامنا کرنا۔

دروازہ کھلنے کی آواز پر وہ چونکا۔ ہاتھوں پر کھانے کی ٹرے لئے مبشر کمرے میں آیا۔ اس نے ٹرے سلیم شاہ کے سامنے رکھتے ہوئے کہا "روٹی

کھالو شاہ جی۔"

"مجھے بھوک نہیں ہے۔" سلیم شاہ کے لہجے میں بے بسی تھی۔

"پھر بھی دو چار لقمے لے لو۔ یوں بھوکے رہو گے تو کمزور ہو جاؤ گے۔"

سلیم شاہ نے حیرت سے اسے دیکھا "تم لوگ کس دنیا کے انسان ہو؟"

"ابا اور دادا کا پتا نہیں، پر میں اسی دنیا کا ہوں۔"

"ارے۔ تمہارا محبوب دادا میری وجہ سے موت کے خطرے سے دوچار ہے اور تم نے زبردستی مجھے پناہ دی ہے کہ کہیں میں گرفتار نہ ہو جاؤں۔ تم میری مہمان نوازی کر رہے ہو، کھانے کے لئے اصرار کر رہے ہو کہ کہیں کمزور نہ ہو جاؤں میں تو مجرم ہوں، تمہارا بھی اور قانون کا بھی۔ تمہیں غصہ نہیں آتا مجھ پر؟" آخر میں اس کے لہجے میں ملامت آ گئی۔ اس کا جسم شدت جذبات سے لرزنے لگا۔

"میں ..... میں تو پتا نہیں کیا کر دیتا تمہارا!" مبشر نے دانت پر دانت جماتے ہوئے کہا "پر ابا کا حکم نہیں ٹال سکتا۔ ....اچھا تم کچھ کھا لو۔"

سلیم شاہ نے بے دلی سے ایک لقمہ لیا۔ "تمہارے دادا کیسے ہیں؟"

"ان کی حالت اچھی نہیں۔"

"مجھے افسوس ہے۔ غصے نے اندھا کر دیا تھا مجھے۔ اب جو مجھے شرمندگی ہے وہ میں بیان نہیں کر سکتا۔"

"بہت خوبصورت لفظ ہیں شاہ جی!" مبشر نے سادگی سے کہا۔

"رابعہ کہاں ہے؟" سلیم شاہ نے اچانک پوچھا۔

"کسی رشتے دار کے گھر۔ اسے کوئی خطرہ نہیں۔ گولی پیٹ میں نہیں لگی تھی، کلائی کو چھو کر گزر گئی۔"

"پولیس کو تو ......؟"

"کسی کو اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ خوامخواہ بدنامی ہوتی۔"

سلیم شاہ چند لمحے اسے غور سے دیکھتا رہا، پھر بولا "تو تمہیں رابعہ سے کوئی دلچسپی نہیں؟"

"میں نے تمہیں سمجھانے کی کوشش کی تھی اور اب بھی بتا رہا ہوں۔" مبشر نے بے حد تحمل سے کہا "اور میں نے تو بی بی کو بھی سمجھانے کی کوشش کی تھی، پر اس پر تمہیں اختیار نہیں تو میں بے چارہ کیا کر سکتا تھا!"

سلیم شاہ شرمندگی نظر آنے لگا۔ "مجھے واقعی افسوس ہے۔"

"چھوڑو اس بات کو۔" مبشر نے کہا "ابا نے کہلوایا ہے، وقت آنے پر تمہیں یہ کہنا ہو گا کہ دادا نے تم پر فائر کیا تھا۔ تمہیں اپنے بچاؤ میں گولی چلانی پڑی۔"

سلیم شاہ چند لمحے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھتا رہا، پھر اس نے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپایا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

☆

الٰہی بخش دیر سے دروازے پر کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا اور جیب پھولی ہوئی تھی۔ ذرا دیر بعد موقع ملا تو اس نے چوروں کی طرح اِدھر اُدھر دیکھا اور دروازہ کھول کر انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں داخل ہو گیا۔

پیر بخش کا چہرہ دیکھ کر اس کا دل کٹنے لگا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ بہت تکلیف میں تھا۔ اس کے ہونٹ لہولہان ہو رہے تھے۔ شاید تکلیف برداشت کرنے کی کوشش میں وہ انہیں دانتوں سے کاٹ رہا تھا۔

الٰہی بخش کا جی نہیں چاہ رہا تھا کہ اس حال میں اسے چھوڑے مگر فرض بہت بڑا تھا۔ اس نے باپ کے منہ سے منہ لگا کر پکارا۔ "ابا ..... ابا ....."

پیر بخش نے آنکھیں کھول دیں۔

"ابا ..... ڈاکٹر کہتا ہے، تمہاری حالت اچھی نہیں۔ میں کیا کروں ابا؟"

پیر بخش نے کمزور آواز میں کہا "وہ کر جو کرنا چاہیے۔"

"کاغذ پر انگوٹھا لگانا ہے ابا۔"

پیر بخش سے بولا نہیں جا رہا تھا۔ اس نے آنکھوں سے اشارہ کیا۔ الٰہی بخش نے جیب سے انک پیڈ نکال کر کھولا اور باپ کا ہاتھ تھام کر اس کا انگوٹھا پیڈ پر جما کر رکھا۔ پھر اس نے باپ کا انگوٹھا کاغذ پر لگا دیا۔

"روشنائی تو پکی ہے نا۔"

"تم فکر نہ کرو ابا۔ مجھ سے کوئی چوک نہیں ہوگی۔"

"رب ..... میری شرم رکھ لے ....." پیر بخش تڑپ کر گڑ گڑایا "مجھے اس زخم سے نہ مار رب۔" اتنا بولنے سے اس کی حال ایک دم بگڑ گئی۔

دروازہ کھلنے کی آواز سن کر الٰہی بخش نے جلدی سے کاغذ اور انک پیڈ جیب میں رکھ لیا۔ آنے والا ڈاکٹر تھا "تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" اس نے الٰہی بخش سے پوچھا۔

"ڈاکٹر جی ..... ابا کا حال اچھا نہیں ہے۔"

ڈاکٹر نے پیر بخش کو دیکھا اور گھبرا گیا۔ اس نے نرس کو پکارا۔ چند منٹ میں ہنگامی حالات ہو گئے۔

☆

بے شک اللہ ہی دعاؤں کو سننے اور قبول کرنے والا ہے۔

ڈاکٹر نے الٰہی بخش کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "مجھے افسوس ہے!"

"ہوا کیا ڈاکٹر جی؟"

"دل کا دورہ پڑا ..... اور وہ ختم ہو گئے۔"

الٰہی بخش بت بن کر رہ گیا۔ صدمے نے جیسے اس کی جان نکال دی تھی۔ مگر فوراً ہی اسے فرض یاد آیا۔ ابا نے کہا تھا ..... وہ کر جو کرنا چاہیے۔ اس نے بڑی تیزی سے خود کو سنبھالا۔ غم کرنے کو بہت وقت پڑا تھا۔ پہلے معاملات نمٹانے تھے۔ اس نے ڈاکٹر سے پوچھا "آپ سند میں کیا لکھیں گے ڈاکٹر جی؟"

"یہی کہ موت ہارٹ اٹیک کے نتیجے میں ہوئی ہے۔"

"تو مجھے سند بنا دیں ڈاکٹر جی۔"

"بن جائے گا، ایسی جلدی کیا ہے؟"

آنسو اب الٰہی بخش کی آنکھوں سے برس رہے تھے "جلدی ہے ڈاکٹر جی۔ مجھے ابا کو قبر میں اتارنے سے پہلے تمام حالات صاف کرنے ہیں، ورنہ ابا کی روح خفا ہوگی۔ خدا کے لئے ڈاکٹر صاحب......"

ڈاکٹر اس کی وحشت دیکھ کر گھبرا گیا "یہ کام وقت لیتے ہیں مگر خیر — پوسٹ مارٹم ہو جائے تو بتا دوں گا۔"

الٰہی بخش روتا ہوا ایک طرف چلا گیا۔ باہر جا کر اس نے بیٹوں کو اطلاع دی۔

اس کے جانے کے بعد ڈاکٹر نے نرس سے کہا "عجیب بیٹا ہے۔ باپ کے مرنے کا دکھ نہیں۔ سند کی فکر ہے۔ یقیناً بڑی جائیداد ہوگی مرنے والے کی۔"

ادھر الٰہی بخش اب پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا "اب سمجھ میں آیا ابا۔ سب سمجھ میں آ گیا۔ مجھے افسوس ہے ابا۔ نیت، قسمت خراب کرتی ہے، اسی لئے میں قربان نہیں ہو سکا۔"

☆......☆

ایس ایچ او نے کانسٹیبل کو آواز دی "اوے سعیدے...... چائے لے آ جلدی سے۔"

"ابھی لایا سر جی۔" سعیدے نے باہر ہی سے ہانک لگائی۔

ایس ایچ او پاؤں پھیلا کر بیٹھ گیا۔ اسی وقت الٰہی بخش کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے کندھے جھکے ہوئے تھے۔ چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ ایس ایچ او اقبال نے اسے اس حال میں دیکھا تو سنبھل کر بیٹھ گیا "آؤ الٰہی بخش ادھر بیٹھو۔" اسنے کرسی کی طرف اشارہ کیا "کیا حال ہے تمہارے ابا کا؟"

الٰہی بخش نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا "مشکل آسان ہو گئی تھانے دار جی۔"

"انا للہ وانا الیہ راجعون۔ بڑا افسوس ہوا الٰہی بخش۔ اب کیا چاہتے ہو؟"

"میں چاہتا ہوں کہ پرچہ نہ کٹے۔"

"پرچہ تو کٹ چکا ہے، الٰہی بخش۔"

"کیسے؟ مدعی تو میں ہوں!"

"وقت پر کوئی مدعی سامنے نہ آئے تو قانون خود مدعی بن جاتا ہے۔"

الٰہی بخش برہم ہو گیا "قانون کو ایسا کوئی حق نہیں۔ آپ خود بتاؤ، قانون خون معاف کر سکتا ہے کسی کا؟"

"دیکھو الٰہی بخش یہ سب قانون بنانے والے جانیں۔" تھانے دار نے ہمدردی سے کہا "اب تو فیصلہ عدالت میں ہی ہوگا۔"

الٰہی بخش گڑگڑانے لگا "ایک احسان کر دو تھانیدار جی۔ سلیم شاہ کو گرفتار نہ کرنا۔"

"کیسی بات کرتے ہو!" اقبال نے خفا ہو کر کہا "اس نے تمہارے باپ کو مارا ہے!"

"اس نے نہیں مارا تھانیدار جی۔" الٰہی بخش بولا "ابا نے پہلے فائر کئے تھے اس پر۔ دو فائر۔ اس نے تو اپنے بچاؤ میں گولی چلائی تھی۔"

"پستول میں چیک کر چکا ہوں۔ اس سے دو گولیاں چلائی گئی ہیں، پر پستول تو تم نے مجھے لا کر دیا تھا، کیا پتا، وہ فائر تم نے کئے ہوں؟"

"میں ایسا کیوں کروں گا۔ میرا تو باپ مرا ہے جی۔ پر میں بے انصافی نہیں کر سکتا۔ مجھے معلوم ہے کہ سلیم شاہ بے قصور ہے۔"

"مگر میں تو اسے قاتل سمجھتا ہوں۔"

"لیکن تھانیدار جی، میرا ابا اس گولی کے زخم سے نہیں مرا۔ ہارٹ اٹیک ہوا تھا اسے۔" الٰہی بخش نے جیب سے ڈیتھ سرٹیفکیٹ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ اقبال سرٹیفکیٹ پڑھنے لگا۔

پھر تھانے دار جی، ابا نے مرتے وقت اپنی غلطی تسلیم کر لی تھی۔ انہوں نے دو فائر کیے مگر نشانہ خطا ہو گیا۔ سلیم شاہ گولی نہ چلاتا تو خود مارا جاتا۔"

"اس علاقے میں نشانے اتنے کچے نہیں ہوتے الٰہی بخش۔ تم جانتے ہو اور یہ جو تم نے کہا ہے، یہ تمہارا بیان ہے۔ اس کی کوئی قانونی حیثیت نہیں۔"

الٰہی بخش نے جیب سے ایک اور کاغذ نکال کر اس کی طرف بڑھایا "یہ بھی دیکھ لو تھانیدار جی۔ انگوٹھا ابا نے خود لگایا تھا۔ اپنی زندگی میں۔"

اقبال نے وہ اعتراف نامہ بھی پڑھا، پھر الٰہی بخش کی طرف دونوں کاغذ بڑھا دیے "کام تم نے پکا کیا ہے الٰہی بخش لڑکا پہلی پیشی میں ہی چھوٹ جائے گا۔"

"انشاء اللہ!" الٰہی بخش نے بڑے خلوص سے کہا "پر ایک کام تم بھی کر دو تھانیدار جی۔ میں ہاتھ جوڑتا ہوں۔ تم جو خدمت کہو گے، میں کروں گا..."

"او خدمت نہیں چاہیے مجھے۔ تم کام بتاؤ۔" اقبال نے برا مانتے ہوئے کہا۔

"سلیم شاہ کو گرفتار نہ کرنا۔ ہتھکڑی نہ لگانا اسے۔"

اقبال اسے عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگا "تم کیا چیز ہو الٰہی بخش؟"

"گناہ گار بندہ ہوں اپنے رب کا۔ میری شرم رکھ لو تھانیدار جی۔" الٰہی بخش نے پیشانی کے زخم کو انگلی سے سہلاتے ہوئے کہا۔ اسے اپنے معاملے میں باپ کا ایس ایچ او کے سامنے گڑگڑانا یاد بھی آ رہا تھا اور اب وہ اسے سمجھ بھی سکتا تھا۔ مگر اس وقت باپ اسے بہت بے رحم لگا تھا۔ اس نے سوچا تھا۔ ابا کو مجھ سے کوئی محبت نہیں۔ میں بس قربانی کا بکرا ہوں ان کے لئے۔ یہ سب سوچ کر اس کی آنکھیں ندامت کے آنسوؤں سے بھر گئیں۔

ایس ایچ او اقبال کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ پھر وہ سر اٹھا کر بولا "یہ کوئی بڑی بات نہیں۔ تو نے ثبوت ہی ایسے دیے ہیں لیکن میں جانتا ہوں کہ اس معاملے میں بہت گڑبڑ ہے۔ میں تو رگڑ دیتا اسے۔ خدا کی قسم، صرف تیری وجہ سے چھوڑ رہا ہوں۔ جا اسے ہتھکڑی نہیں لگے گی۔"

الٰہی بخش بچوں کی طرح رونے لگا۔ پھوٹ پھوٹ کر۔ پھر اس نے چھت کی طرف سر اٹھاتے ہوئے کہا "تیرا شکر ہے رب تیرا احسان ہے۔"

وہ اٹھا اور جانے لگا۔ دروازے پر پہنچ کر اس نے ایس ایچ او کو پلٹ کر دیکھا "شکریہ تھانے دار جی۔ سلام علیکم۔"

☆

پیر بخش کی موت کے ایک ماہ بعد ماسٹر جی بھی چل بسے۔ اب الٰہی بخش کو احساس ہوا کہ وہ دنیا میں بالکل اکیلا رہ گیا ہے۔ ابا اور ماسٹر جی کے سوا اس کا کوئی دوست نہیں تھا۔ وہ بجھا بجھا رہنے لگا۔

البتہ جس روز مبشر نے بی اے کا امتحان پاس کیا، اس روز وہ بہت خوش ہوا "اب تیرا کیا ارادہ ہے بیٹے؟"

"ڈھنگ کی کوئی نوکری تو ملے گی نہیں ابا۔"

"دیکھ بیٹے، تعلیم نہ عہدے کے لئے حاصل کی جاتی ہے، نہ پیسے کے لئے۔ اس کا مقصد صرف دل اور دماغ کو روشن کرنا اور مہذب بنانا ہونا چاہئے۔"

مبشر مسکرایا "ابا، اجازت دو تو دوکان پر بیٹھ جاؤں؟"

"تو دوکان داری کر سکے گا بیٹے؟"

"کیوں نہیں ابا، میرا تو شروع سے دل تھا کاروبار کا۔"

الٰہی بخش جانتا تھا کہ مبشر نے صرف اسے خوش کرنے کے لئے تعلیم حاصل کی ہے۔ اس کا دل خوشی سے بھر گیا "ٹھیک ہے بیٹے مل بیٹھ کر بات کریں گے اس سلسلے میں۔"

الٰہی بخش اب ہلکا پھلکا ہو گیا تھا۔ وہ دیر میں دوکان پہنچتا اور گلے پر ہی بیٹھا رہتا۔ بیٹے سب کام سنبھالتے تھے مگر مبشر سے گفتگو کے بعد الٰہی بخش نے ان کے کاروبار کے انداز پر غور کرنا شروع کیا۔ پہلے اسے اطمینان نہیں تھا کہ بیٹے کاروبار کے رموز کو سمجھتے ہیں۔ لیکن چند روز میں ہی اس کی غلط فہمی دور ہو گئی اور وہ مطمئن ہو گیا۔

"بیٹے...... یہ سیب تو تیس روپے کلو بیچ رہا ہے!" ایک روز اس نے مزمل کو ٹوکا "پیٹی کتنے کی ہے آجکل؟"

"ساڑھے تین سو کی ابا۔"

"تو بیٹے یہ ستائیس روپے کلو بنتا ہے منافع سمیت!"

"بزار میں سیب چالیس روپے بک رہا ہے ابا۔ صرف ہم تیس روپے بیچ رہے ہیں۔ اس میں پیٹی کے خراب دانوں کا بھی نکل آتا ہے۔ غریبوں کا بھلا بھی ہو جاتا ہے۔ اور دیکھو ابا مہنگائی بھی بہت ہو گئی ہے۔"

الٰہی بخش نے سرد آہ بھرتے ہوئے سر کو تفہیمی جنبش دی "ٹھیک ہے بیٹے۔ اچھا یہ بتا بتوں کے ہاں پھل بھجوا دیئے تھے؟"

"ہاں ابا۔ صرف وہیں نہیں ہر اس جگہ پھل دے دیئے، جہاں تم بھجواتے ہو۔"

اتنی دیر میں ایک دکان دار آ گیا۔ اس نے مدثر سے کہا "مجھے سیب، آلو بخارے اور خوبانی کی ایک ایک پیٹی دے دو۔"

"چاچا، پرانے پیسے لائے ہو کہ نہیں؟" مدثر نے پوچھا۔

"اگلی بار دے دوں گا۔"

"نہیں چاچا، پھر فروٹ بھی اگلی بار ہی لے لینا۔"

"یہ تو تو بڑی بے مروتی کرتا ہے۔" دوکان دار برا مان گیا "تیرے باپ نے کبھی ایسا نہیں کیا میرے ساتھ۔"

"تو ابا کا حساب تم نے آج تک صاف بھی نہیں کیا ہے!" مدثر نے ترکی بہ ترکی کہا۔ "ہم مال منڈی سے مفت نہیں لاتے ہیں۔ نقد پیسہ دیتے ہیں اور پیٹی پر مشکل سے بیس تیس روپے بچتے ہیں۔ تم پیسے نہیں دو گے تو ہمارا کام کیسے چلے گا؟"

"ٹھیک ہے، میں منڈی سے لے لوں گا۔"

"شوق سے لے لو۔ ذرا منڈی کا بھاؤ بھی تو پتا چلے تمہیں۔ یہاں آؤ تو پچھلے پیسے لے کر آنا۔"

دکان دار کے جانے کے بعد الٰہی بخش نے بیٹے سے کہا "بیٹے دے دینا تھا نا مال۔ اپنا پرانا گاہک ہے۔"

"ابا، یہ کوئی غریب آدمی نہیں ہے۔ بس پیسے دبانے کی عادت ہو گئی ہے اسے۔ منڈی جائے گا تو دماغ ٹھیک ہو جائے گا آپ ہی!"

اور مدثر کی بات درست ثابت ہوئی۔ اگلے روز وہ دکاندار پچھلے پیسے دے گیا" کیوں چاچا، منڈی کا بھاؤ دیکھ لیا!" مدثر نے اس سے پوچھا۔

"نہیں، منڈی تو میں گیا ہی نہیں۔"

"جھوٹ مت بولو چاچا۔ تم ہم سے مال خرید کے ہم پر نہیں، خود پر بھی مہربانی کرتے ہو۔"

دکان دار کھسیا کر خاموش ہو گیا۔ پھر ایک دن ایک ملنے والا آیا۔ دیر تک وہ بیٹھا باتیں کرتا رہا۔ الٰہی بخش کا جی چاہا لیکن وہ کچھ بولا نہیں۔ اس کے جانے کے بعد اس نے مزمل سے کہا" بیٹے، علم الدین اتنی دیر بیٹھا، تو نے اس کی خاطر بھی نہیں کی!"

"چائے منگوائی تو تھی ابا۔"

"بیٹے پھل سے بھی اس کی تواضع کر سکتا تھا تو ... دیکھ بری بات ہے۔"

"ابا، یہ ہمارا گھر نہیں، دکان ہے۔ گھر پر ہم ہر طرح کی تواضع کریں گے۔ پر ابا، دکان پر بس چائے کو ہی پوچھ جا سکتا ہے۔ دکان کے مال سے تواضع کریں تو برکت نہیں رہتی۔"

اس روز الٰہی بخش کی طمانیت کی کوئی حد نہیں تھی۔ وہ بے فکر ہو گیا۔ بچے اس سے زیادہ سمجھدار تھے۔ انہوں نے اس کی غلطیوں کی بھی اصلاح کر لی تھی۔ وہ دکان چلا سکتے تھے۔ وہ اپنے پیروں پر کھڑے ہو گئے تھے۔

رقیہ سولہ برس کی ہوئی تو الٰہی بخش نے اس کی شادی کر دی۔ اس بوجھ سے سبکدوش ہونے کے بعد وہ اور ہلکا پھلکا ہو گیا۔ اس کے بعد اسے ایک کام اور کرنا تھا۔ مبشر دکان پر تو بیٹھنے لگا تھا مگر الٰہی بخش مطمئن نہیں تھا۔ اسے سب کچھ از سرِ نو منظم کرنے کی ضرورت کا احساس ہو رہا تھا۔

اس روز اس نے تینوں بیٹوں کو جمع کیا" تم بہت اچھے ہو میرے بیٹو۔ مجھے تم پر فخر ہے" اس نے کہا" آج میں تمہیں جو نصیحت کر رہا ہوں، اسے ہمیشہ یاد رکھنا۔ ایکے میں بڑی طاقت ہے میرے بچو۔ مل کر رہو گے تو تمہاری طاقت زیادہ ہو گی۔ الگ ہو جاؤ گے تو کمزور ہو جاؤ گے۔"

"ہم یہ بات سمجھتے ہیں ابا۔" مبشر بولا۔

"میں چاہتا ہوں کہ تم کاروبار الگ الگ کرو لیکن ہمیشہ ایک ساتھ رہو۔ ایک بات یاد رکھو۔ فساد ہمیشہ عورت سے ہوتا ہے، گھر عورتوں کی وجہ سے ٹوٹتے ہیں مگر عورتیں مردوں کی ذمے داری ہوتی ہیں۔ بیوی کو اپنی مرضی پر چلانا شوہر کا کام ہے۔ ایک ساتھ رہنے کے لئے تمہیں اپنی بیویوں کو قابو میں رکھنا ہو گا۔ نہیں رکھ سکے تو خسارے میں رہو گے ... ہار جاؤ گے۔"

"پر ابا، الگ کاروبار کرنے کی کیا ضرورت ہے؟" مدثر نے کہا۔

"ہاں ابا، ایک دکان ہم لوگوں کے لیے بہت ہے۔"

"تم ابھی کی سوچ رہے ہو۔ میں آگے کی سوچتا ہوں میرے بچو۔ تمہاری شادیاں ہوں گی۔ کنبہ بڑھے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ وقت آئے تو کاروبار میں ساجھا نہ ہو۔"

"پھر ابا، سوچا کیا ہے؟" مبشر نے پوچھا۔

"ایک دکان اور ڈالنی ہے بیٹے۔"

"تب بھی دو بھائیوں کا ساجھا تو ہو گا۔" مدثر نے اعتراض کیا۔

"نہیں بیٹے، میرے ذہن میں نقشہ اور ہے۔ تو ہمیشہ منڈی جاتا ہے۔ فروٹ لانا تیری ذمے داری ہے۔ میں سمجھتا ہوں، تجھے دکان کی ضرورت نہیں۔ تو مال لا کر دیا کرے گا ... اپنے دونوں بھائیوں کو بھی اور دکان داروں کو بھی۔ تجھے ایک سوزوکی دلا دوں گا میں۔ یوں تیری کافی اچھی آمدنی

ہوگی۔ پر یہ بتا، تجھے کوئی اعتراض تو نہیں اس میں؟''

''نہیں ابا، آپ ہمارا بھلا ہی سوچیں گے نا۔'' مدثر بولا، ویسے بھی میرا دل دکان سے زیادہ باہر کے کاموں میں لگتا ہے۔''

''یہ دکان مبشر سنبھالے گا، نئی دکان مزمل چلائے گا۔''

''ٹھیک ہے ابا۔''

''کسی کو کوئی اعتراض تو نہیں؟''

''اعتراض کیسا ابا! آپ کا حکم ماننا ہی تو ہماری زندگی ہے۔'' مزمل نے کہا۔

''مگر میں وجہ ضرور بتاؤں گا۔ مبشر کاروبار میں اب آیا ہے۔ نیا ہے۔ اس کا تجربہ بھی سب سے کم ہے۔ اس کے لئے نئی دکان بھاری ہوگی۔ یہ چلتی ہوئی دکان ہے۔ اسے یہ بڑی آسانی سے سنبھال لے گا۔ پھر میں بھی کبھی کبھار اس کا ہاتھ بٹا دوں گا۔ مزمل چھوٹا سہی مگر دکان کا تجربہ ہے اسے۔ یہ انشاء اللہ آسانی سے نئی دکان جما دے گا۔''

''آپ کا فیصلہ درست ہے ابا۔''

ایک مہینے میں اس فیصلے پر عمل درآمد ہوگیا۔

☆

زندگی ہموار زمین پر بہنے والی ندی کی طرح پر سکون تھی... سکون ہی سکون، طمانیت ہی طمانیت، نماز بھی قائم تھی اور رات کو سادی سے باتیں کرنے کا شغل بھی جاری تھا۔ فرق پڑا تو صرف صحت میں۔ جوڑوں کا درد پچھلے کئی برسوں سے جان کے ساتھ لگا ہوا تھا اور وہ جانتا تھا کہ جان کے ساتھ ہی جائے گا۔

سادی اس کے لئے پہلے جیسی محترم نہیں تھی۔ بلکہ پہلے سے زیادہ محترم تھی۔ آج وہ جو کچھ بھی تھا، اللہ کے کرم کی وجہ سے تھا اور وسیلہ سادی تھی۔ اس ملازمت ہی کی وجہ سے وہ یہ کاروبار کرنے کے قابل ہوا تھا۔ ورنہ جوڑوں کے درد کے باوجود کہیں کام ڈھونڈتا اور کرتا پھرتا۔ یہ سکون اور طمانیت نہ ہوتی۔ بھی نہیں، آخری دن بھی سادی نے اس پر احسان کیا تھا۔ وہ اسے نہ بھگاتی تو وہ عمر بھر اس در پر پڑا رہتا اور ذلت اٹھانے کا عادی ہو جاتا۔ ساری عمر وہ کڑھتا رہتا، دکھی رہتا اور سادی اتنی قریب بھی نہ ہوتی۔

یہ خیال جب بھی آتا، وہ سادی کے لئے شکر گزاری میں ڈوب جاتا۔

مگر اس روز مزمل کی دکان میں بیٹھے بیٹھے اس کی اچانک عجیب ہی حالت ہوگئی۔ گزری ہوئی پوری زندگی اس کی نگاہوں میں پھر گئی، کیا وہ سوچ بھی سکتا تھا کہ کبھی ایسی فراغت کی زندگی گزار سکے گا۔ اسے ایسی محبت کرنے والی خدمت گزار بیوی ملے گی۔ ایسی سعادت مند اولاد ملے گی۔ ایسے حکم ماننے والے بچے! کہتے ہیں کہ نیک اولاد اللہ کا سب سے اچھا تحفہ ہوتی ہے۔ تو اللہ نے اپنے نافرمان بندے کو کیسے کیسے نوازا۔ کیا کیا کچھ عطا کیا اور بندے کو تو شکر کی بھی توفیق نہیں ہوئی۔

بیٹھے بیٹھے الٰہی بخش پر لرزہ طاری ہوگیا۔ بہت عرصے کے بعد باپ کی کہی ہوئی باتیں یاد آئیں۔ وہ کہتا تھا حق یہ ہے کہ شکر ادا کر اور بہتر یہ ہے کہ عشق کر۔ لیکن وہ تو عشق ہی سے گھبرا کر گھر چھوڑ بھاگا تھا۔ پھر بھی اللہ نے کیسے قدم قدم پر اسے سہارا دیا۔ کیسی دستگیری کی اس کی۔ کیسے اس پر عنایت کی بارش کی۔ اور وہ ہے کہ اب تک پہلے جیسا ہے۔ نہ شکر نہ عشق...

اس کے وجود میں جیسے پشیمانی کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے، چنگھاڑنے لگا... جسم کا رواں رواں استغفار کرنے لگا۔ پھر پشیمانی کے سمندر نے آنکھوں کا رخ کیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔

جانے کتنی دیر تک آنکھوں سے آنسو بہتے رہے۔ پھر اچانک اس پر گھبراہٹ طاری ہوگئی۔ اسے لگ رہا تھا کہ اس کا دل بڑا ہوتا جا رہا ہے۔ مسلسل ..... جیسے وہ اس کے جسم سے بھی بڑا ہو گیا ہے ..... پھیلتا جا رہا ہے ..... دور پوری زمین کی حد تک ..... اوپر آسمان کی حد تک ..... اور جیسے دل پوری کائنات پر چھا گیا ہے۔ یہ بہت خوف زدہ کر دینے والا احساس تھا۔ وہ ..... اس کا وجود جیسے حقیر ..... بہت حقیر ذرہ ہو گیا تھا اور دل جیسے کائنات کو نگل رہا تھا۔ اور اس دل کی آواز ..... دھڑکن ..... ہر دھڑکن جیسے اللہ اللہ پکار رہی تھی ..... اور وہ آواز بلند ..... بلند سے بلند تر ہوتی جا رہی تھی۔ حتیٰ کہ اس آواز کے سوا کائنات میں کچھ بھی نہیں رہا۔

اللہ ..... اللہ ..... اللہ ..... اللہ .....

اچانک ایک اور آواز ابھری۔ فلک شگاف آواز ..... اللہ ..... اللہ ھُو۔ اسے احساس ہوا کہ وہ آواز اس کے حلق سے نکلی ہے۔ اس کے وجود میں گونجی ہے اور وہ دھماکے سے پھٹ گیا ہے، اس کا وجود ریزہ ریزہ ہو گیا ہے۔

اس چیخ کے ساتھ ہی وہ پیچھے کی طرف گرا۔ لیکن اللہ ..... اللہ ھُو کا وہ سلسلہ رکا نہیں۔ اس کے حلق سے مسلسل یہ صدا نکل رہی تھی اور اسے اس پر قابو نہیں تھا۔ وہ اس کے اختیار میں نہیں تھی۔

مزمل نے وہ چیخ سنی تو باپ کی طرف لپکا۔ اس نے گرے ہوئے باپ کا سر اپنی گود میں رکھا۔ وہاں اللہ ..... اللہ ھُو کے سوا کوئی آواز نہیں تھی۔ اِدھر اُدھر کے دکان دار بھی جمع ہو گئے۔ ''کیا ہوا ..... یہ کیا ہوا؟'' کسی نے پوچھا۔

''پتا نہیں ابا بیٹھے تھے۔ بس اچانک یہ کیفیت ہو گئی۔'' مزمل نے بتایا۔

کوئی گلاس میں پانی لے آیا اور چھینٹے دینے لگا لیکن الٰہی بخش کی کیفیت نہیں بدلی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ اللہ ..... اللہ ھُو پکارے جا رہا تھا۔ البتہ اس کی آواز بتدریج دھیمی ہوتی جا رہی تھی۔ پھر وہ بالکل ہی معدوم ہو گئی۔ الٰہی بخش بے ہوش ہو چکا تھا۔

کچھ دیر بعد ہوش آیا تو اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں اجنبیت تھی۔ اس نے پھر اللہ ھُو کا فلک شگاف نعرہ لگایا اور اٹھ کر لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے باہر بھاگا۔ مزمل نے اسے روکنے کی کوشش کی۔ لیکن الٰہی بخش نے اسے جھٹک دیا۔ اس وقت وہ بہت توانا، بہت طاقت ور ہو گیا تھا۔

شام تک پورے ایبٹ آباد کو معلوم ہو گیا کہ بانڈہ ونجنگ کا الٰہی بخش دیوانہ ہو گیا ہے۔

☆

شام کو الٰہی بخش خود ہی گھر آ گیا۔ وہ سب پریشان تھے۔ بیٹے اٹھ کر اس کی طرف لپکے اور اسے سہارا دے کر چار پائی تک لائے۔ ''اب کیسی طبیعت ہے ابا؟'' مبشر نے پوچھا۔

''ٹھیک ہوں بیٹے۔''

اتنے میں حاجرہ بھی اندر سے نکل آئی۔ ''کہاں چلے گئے تھے؟''

''پتا نہیں مگر تھی بڑی خوبصورت جگہ۔'' الٰہی بخش نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

مبشر نے ماں کو آنکھوں سے اشارہ کیا کہ وہ ایسے سوال نہ کرے۔ ''ابا ... تم لیٹ جاؤ ...'' مبشر نے کہا۔

الٰہی بخش لیٹ گیا۔ مزمل اس کے پاؤں دبانے لگا۔ ''ماں ... لسی لاؤ ابا کے لئے۔'' مدثر نے کہا۔

لیکن الٰہی بخش نے صرف دو گھونٹ پی کر لسی کا گلاس واپس کر دیا۔ ''کیسا خراب ذائقہ ہے اس کا۔'' وہ بڑبڑایا۔

''کیا محسوس کر رہے ہو ابا؟'' مبشر نے پوچھا۔

''نیند آ رہی ہے اور ٹانگیں بہت دکھ رہی ہیں۔''

بیٹے اس کی بات سمجھ سکتے تھے۔ نہ جانے کہاں کہاں مارا مارا پھرا ہو گا وہ۔ اسے ڈھونڈ ڈھونڈ کر تو ان تینوں کی بھی ٹانگیں دکھ گئی تھیں اور وہ انہیں نہیں ملا تھا۔ یہ اندازہ نہیں کیا جا سکتا تھا کہ وہ کتنا پیدل چلا ہو گا۔ جبکہ وہ جوڑوں کا مریض بھی تھا۔

''ماں ...... ابا کا بستر ٹھیک کر دو۔'' مدثر نے ماں سے کہا۔

الٰہی بخش بستر پر لیٹتے ہی بے خبر ہو گیا۔ سوتے ہوئے وہ بہت پرسکون لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر روشنی تھی۔

اس روز الٰہی بخش کے گھر میں شام ہی سے رات ہو گئی۔ بیٹوں کو بھی اس کی تلاش نے تھکا مارا تھا۔ وہ بھی جلدی سو گئے۔ ایک حاجرہ تھی، وہ جاگ رہی تھی۔ اسے تھکن نہیں تھی۔ لیکن اس کا دل بہت پریشان تھا۔ بیٹے اسے سب کچھ بتا رہے تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔

وہ بیٹھی الٰہی بخش کی ٹانگیں دباتی رہی۔

جانے کتنی دیر بعد الٰہی بخش کسمسایا۔ ''بہت گرمی ہے۔'' وہ بڑبڑایا۔

''باہر صحن میں بستر بچھا ہے۔ چلو ... وہاں سو جاؤ۔''

''صحن میں۔'' الٰہی بخش نے کہا۔ پھر اس کا پورا جسم لرزنے لگا۔ ''نہیں ... وہاں تو آسمان ہے۔ مجھے اس سے ڈر لگتا ہے۔''

''آسمان سے ڈر لگتا ہے۔ آسمان تو ہمیشہ سے ہے'' حاجرہ نے دہرایا۔

''ہمیشہ سے ہے۔ لیکن اب بہت قریب آ گیا ہے۔ میرا دل آسمان کو چھونے لگا ہے اب۔''

حاجرہ کی تشویش بڑھ گئی۔ وہ تو سمجھ رہی تھی کہ اب وہ ٹھیک ٹھاک ہے لیکن وہ تو اب بھی دیوانوں کی سی باتیں کر رہا تھا۔ ''تمہیں ہوا کیا تھا؟'' اس نے پوچھا۔

چند لمحے خاموشی رہی۔ پھر الٰہی بخش نے کہا۔ ''کچھ بھی نہیں۔ یہ میرا دل بڑا ہونے لگا تھا۔ ... ہوتا جا رہا تھا۔ پھر وہ میرے سینے سے نکل گیا۔ پوری زمین، پورے آسمان تک پھیل گیا۔ بلکہ اس سے بھی آگے نکل گیا۔ مجھے بہت ڈر لگ رہا تھا۔ پھر مجھے ہوش نہیں رہا۔ کیا ہوا، مجھے کچھ یاد نہیں۔'' وہ کہتے کہتے رکا۔ ''مجھے اب بھی ڈر لگ رہا ہے حاجرہ!''

''وہ وہم تھا تمہارا، ایسا ہو جاتا ہے۔'' حاجرہ نے اسے تسلی دی۔

''وہ وہم نہیں تھا حاجرہ!'' الٰہی بخش نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ ''لیکن تم نہیں سمجھو گی۔''

حاجرہ کچھ نہیں بولی۔ اسے بھی خوف آنے لگا تھا۔

"حاجرہ! سنو ذرا یہاں سر رکھو۔" الٰہی بخش نے اچانک کہا اور اس کے سر کو اپنے سینے کی طرف کھینچنے لگا۔

"نہیں ..... سنو تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

"بے وقوف عورت تم غلط سمجھ رہی ہو۔" الٰہی بخش نے غصے میں کہا۔ "میں کہہ رہا ہوں، تم میرے دل سے کان لگا کر سنو۔"

حاجرہ کچھ نہیں سمجھی لیکن وہ بہت سہم گئی تھی۔ اس نے الٰہی بخش کے سینے پر کان رکھ دیا۔ "کیا ..... کیا بات ہے۔"

"کوئی آواز نہیں سنائی دے رہی؟"

"ہاں ..... دھڑکن کی آواز ہے۔ دل تو دھڑکتا ہے نا۔"

"کوئی اور آواز نہیں؟" الٰہی بخش کے لہجے میں مایوسی تھی۔ "میں ہاتھ رکھ کر سنوں تو کچھ اور سنائی دیتا ہے۔"

"لو..... ہاتھوں کے بھی کان ہوتے ہیں کیا۔"

"ہاں ہوتے ہیں۔ تو تمہیں کوئی اور آواز نہیں..... "

اسی لمحے حاجرہ کا جسم لرزنے لگا۔ پہلے اس نے وہم سمجھا۔ مگر پھر اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ جو کچھ سن رہی ہے، حقیقت ہے۔ الٰہی بخش کا دل دھڑک رہا تھا۔ لیکن دھک دھک کی بجائے وہاں سے اللہ اللہ کی آواز آ رہی تھی۔ اس پر لرزہ طاری ہو گیا۔

"کیا ہوا ..... کیا ہوا حاجرہ؟" الٰہی بخش نے پوچھا۔

"تمہارے دل سے اللہ اللہ کی آواز آ رہی ہے۔"

"یہی تو مجھے لگ رہا تھا۔ میرے ہاتھ نے بھی یہی سنا تھا۔ تو یہ سچ ہے۔"

ہاں جی، یہ سچ ہے۔

الٰہی بخش نے حاجرہ کا ہاتھ تھام لیا۔ "حاجرہ میری بات غور سے سنو، تم نے ٹھیک کہا تھا۔ یہ سب وہم ہے۔ نہ میرا دل بڑا ہوا تھا ..... آسمان اور زمین جتنا ..... اور نہ ہی یہ آواز اصل ہے۔ یہ سب وہم ہے۔ اور وہم کسی کو نہیں بتاتے۔"

"لیکن ..... "

"میں تمہیں حکم دے رہا ہوں۔ یہ بات کسی سے نہیں کہنا ورنہ ..... "

"نہیں کہوں گی جی۔ کبھی تمہارا حکم ٹالا ہے۔" حاجرہ نے لجاجت سے کہا۔ "پر ایک بات میری بھی مانو گے؟"

"بولو ..... "

"دیکھو ..... اب دکان پر نہ جانا۔ بچے پریشان ہیں۔ تمہارے پیچھے بھاگیں گے تو کاروبار چوپٹ ہو جائے گا۔ ہماری تو گزر چکی۔ مگر انہیں تو زندگی گزارنی ہے۔ گھر چلانا ہے۔ سمجھ رہے ہو نا؟"

الٰہی بخش نے اثبات میں سر ہلایا۔ "سمجھ رہا ہوں حاجرہ، تم ٹھیک کہتی ہو۔ مگر کسی طرح انہیں سمجھانا کہ میں بیمار نہیں ہوں۔ اب تو صحت مند ہوا ہوں میں۔"

حاجرہ کا ہاتھ اب بھی لرز رہا تھا۔

"جاؤ ..... اب تم سو جاؤ۔"

الٰہی بخش حاجرہ کے جانے کے بعد بھی دیر تک جاگتا رہا۔ یہ اس کا معمول تھا۔ ہمیشہ کی طرح اس رات بھی سادی اس کے پاس آئی تو وہ دور سے ہاتھ ہلانے لگا۔ "نہیں سادی اب واپس چلی جاؤ ..... اور آج کے بعد کبھی نہ آنا۔"

"کیوں الٰہی بخش ..... ناراض ہو گئے ہو کیا؟"

''نہیں سادی، ناراض تو تم سے کبھی نہیں ہو سکتا۔ تمہارے تو بڑے احسان ہیں مجھ پر۔ بس اب تم سے رشتہ ٹوٹ گیا۔ یہیں تک تھا ہمارا ساتھ۔''

''بے وفائی کر رہے ہو؟''

''نہیں سادی، بے وفائی کا دور ختم ہو گیا۔ اب تو وفا کا دور ہے۔ میں اس کا ہو گیا، جس کا پہلے ہی ہو جانا چاہیے تھا۔''

سادی نے غور سے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ پھر آگے بڑھ کر اس کے سینے پر ہاتھ رکھا اور مسکرا دی۔ ''مبارک ہو الٰہی بخش، تمہیں منزل مل گئی۔ میں جاتی ہوں۔ الوداع۔''

''الوداع سادی!''

سادی چلی گئی۔ الٰہی بخش پھر بھی جاگ رہا تھا۔ وہ سرگوشی میں دل کی آواز سے آواز ملا رہا تھا۔ دیوانگی میں بھی اتنا ہوش تھا اسے کہ بچوں کی نیند خراب نہیں ہونی چاہیے۔

☆

دن رات بدل گئے تھے۔ زندگی بدل گئی تھی۔ الٰہی بخش اب دکان پر نہیں جاتا تھا۔ بعض اوقات دن میں کئی کئی بار اس پر دورے پڑتے اور کبھی دورے کے بعد کی کیفیت اس پر کئی کئی دن طاری رہتی اور کبھی ایسا بھی ہوتا کہ کئی کئی دن وہ نارمل رہتا۔ نارمل ہوتا تو وہ الٰہی بخش ہوتا۔ کیفیت میں ہوتا تو کچھ اور لگنے لگتا۔ ایسے میں زیادہ تر وہ چپ چاپ بیٹھا رہتا۔ اس کے ہونٹ ہلتے رہتے مگر آواز نہ ہوتی۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ کیفیت میں اس پر وحشت طاری ہو جاتی۔ ایسے میں وہ بغیر بتائے گھر سے نکل جاتا۔ کوئی اسے روک نہیں سکتا تھا۔ اس میں بلا کی طاقت آ جاتی۔ وہ کسی کے قابو میں نہ آتا۔ نہ جانے کہاں کہاں وہ مارا مارا پھرتا ...اور آخر میں گھر لوٹ آتا۔ مگر کبھی تو کئی کئی دن گھر سے غائب رہتا۔ واپس آتا تو وہ تھکن سے چور ہوتا۔ نڈھال لیٹا رہتا۔ یہ معلوم نہ ہوتا کہ وہ کہاں رہا ہے۔

وہ پہلے بھی نظریں نیچی کر کے بات کرنے کا عادی تھا۔ مگر اب تو وہ نظریں اٹھاتا ہی نہیں تھا۔ ایک بار اس نے نظریں اٹھائیں تو حاجرہ کو خوف آنے لگا۔ اس کی آنکھوں کی وہ چمک الاماں! ان سے توانائی پھوٹتی اور مسخر کرتی محسوس ہوتی تھی۔ ان میں اتنی طاقت محسوس ہوتی تھی کہ لگتا تھا کہ وہ پہاڑ کو بھی اٹھا کر ایک طرف رکھ سکتی ہیں۔ پھر ایک دن حاجرہ کو اندازہ ہو گیا کہ الٰہی بخش جب کیفیت میں ہوتا تو اسے نظر انداز کرنے میں ہی عافیت ہے۔ اس سے بات کرنا، اسے چھیڑنا ٹھیک نہیں۔ دشواری یہ تھی کہ بعض اوقات ظاہری حالت سے یہ پتا ہی نہیں چلتا تھا کہ وہ کیفیت میں ہے۔

اس روز وہ لنگری میں مسالہ کوٹ رہی تھی۔ سامنے چارپائی پر الٰہی بخش بیٹھا تھا۔ وہ کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ حاجرہ نے تین چار بار اسے پکارا۔ پھر جھنجلا کر بولی ''سنتے نہیں ہو جی، ذرا دروازہ کھول دو جا کر۔ کوئی ہے دروازے پر۔''

اس بار الٰہی بخش نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا اور بولا ''مجھے تنگ نہ کر۔ تو لنگری توڑتی رہ۔''

بات زبان سے ادا ہوئی تھی کہ پکے پتھر کی مضبوط لنگری ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ حاجرہ نے الٰہی بخش کو دیکھا۔ وہ پھر اپنی سوچوں میں گم ہو گیا تھا۔ ادھر دروازے پر دستک اب بھی ہو رہی تھی۔ اب مسالہ پیسنا تو ممکن نہیں تھا۔ وہ دروازہ کھولنے چلی گئی۔

حاجرہ نے اس واقعے کو زیادہ اہمیت نہیں دی۔ ایسا ہوتا ہے کہ پتھر کی لنگری رکھے رکھے بھی ٹوٹ جاتی ہے۔ مسالہ پیسنا ضروری تھا۔ وہ مسالہ لے کر پڑوس میں چلی گئی۔ ''ہماری لنگری ٹوٹ گئی ہے آج۔'' اس نے پڑوسن سے کہا۔

اس نے بٹا اٹھا کر مسالے پر پہلا رگڑا ہی لگایا تھا کہ یہ لنگری بھی ٹوٹ گئی۔ اس بار حاجرہ کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ کیا یہ الٰہی بخش کی بددعا کا اثر ہے۔

آنے والے وقت نے ثابت کر دیا کہ اب وہ جو لنگری بھی استعمال کرنا چاہے گی، وہ ٹوٹ جائے گی۔ اس نے یکے بعد دیگرے پانچ لنگریاں

منگوائیں اور پانچوں پہلے ہی رگڑے میں ٹوٹ گئیں۔

مدثر جھنجلا گیا۔ ”کیا کرتی ہو اماں لنگری کے ساتھ۔ جانتی ہو فیکسلا سے لانی پڑتی ہے۔ میں ہر بار دیکھ کر لنگری لایا ہوں۔“

”بس بیٹے، ایک بار لا دے۔ اب نہیں ٹوٹے گی انشاءاللہ“ حاجرہ نے گہری سانس لے کر کہا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ اسے کیا کرنا ہے۔ اس نے خود مسالہ پیسنا چھوڑ دیا۔ اس کام کے لئے اس نے ایک نوکرانی رکھ لی۔ مگر اب وہ پریشان ہو گئی تھی۔ اس کیفیت میں الٰہی بخش کو تو کچھ پتا نہیں ہوتا تھا۔ کوئی بیٹا کچھ کہہ بیٹھے اور خدانخواستہ وہ جواب میں کچھ کہہ دے۔ وہ ہر وقت بیٹوں کو سمجھانے، ٹوکنے لگی۔ یہ اس کے لئے روگ بن گیا تھا۔

☆

ایک دن مسئلہ بھی حل ہو گیا کہ کیفیت میں الٰہی بخش کہاں کہاں جاتا اور کیا کرتا پھرتا ہے!

الٰہی بخش دو دن سے غائب تھا۔ اب یہ ایسا معمول بن گیا تھا کہ وہ لوگ پریشان ہی نہیں ہوتے تھے۔ اس روز دوپہر سے کچھ دیر پہلے دروازے پر دستک ہوئی۔ حاجرہ کو خیال ہوا کہ الٰہی بخش آیا ہے۔ اس نے دروازہ کھولا تو سامنے اجنبی عورت کے ہاتھ میں مٹھائی کا بڑا ڈبہ تھا۔

”جی کس سے ملنا ہے؟“ حاجرہ نے پوچھا۔

”بابا یہیں رہتا ہے؟“ حاجرہ نے پوچھا۔

”کون بابا؟“ حاجرہ کو حیرت ہوئی۔

”پانی والا بابا!“

”کون پانی والا بابا، کس کو ڈھونڈ رہی ہو۔ کوئی نام تو ہوگا اس کا۔“

”نام کہاں بتاتا ہے وہ کہتا ہے بندہ ہوں خدا کا۔ ہم تو اسے پانی والا بابا کہتے ہیں۔ وہ بس پانی مانگ کر پیتا ہے۔ کہتا ہے۔ اندر آگ جل رہی ہے بجھتی ہی نہیں۔ پانی پلا دو۔“

اس دوران الٰہی بخش آ گیا۔ عورت نے کہا۔ ”یہی تو ہے پانی والا بابا۔“

”کیا بات ہے، بہن؟“ الٰہی بخش نے پوچھا۔

”بابا یہ میرا بیٹا واپس آ گیا ہے۔ میں تیرے لئے مٹھائی لائی ہوں۔“

”میرے لئے کیوں مائی، ہو مٹھائی؟“

”تم نے کہا تھا کہ یہ ایک مہینے کے اندر آ جائے گا۔ انتیسویں دن یہ گھر آ گیا۔“

”میرے کہنے سے نہیں، اللہ کے حکم سے آیا ہے۔“ الٰہی بخش نے ترشی سے کہا۔ ”مجھے تمہاری مٹھائی نہیں چاہئے۔ جاؤ اللہ کے نام پر غریبوں کو دو۔ اللہ کا شکر ادا کرو۔“ یہ کہہ کر الٰہی بخش اندر کمرے میں چلا گیا۔

دونوں عورتیں حاجرہ کی خوشامد کرنے لگیں کہ وہ مٹھائی رکھ لے۔ ”میں کیسے لے لوں۔“ حاجرہ نے کہا۔ ”تمہارا بابا جو منع کر رہا ہے۔“

حاجرہ نے ان سے تفصیل پوچھی تو پتا چلا کہ وہ لوگ نواں شہر سے آئے ہیں۔ الٰہی بخش کبھی کبھی وہاں جاتا ہے۔ وہاں کسی کے گھر سے پانی مانگتا ہے اور کئی کئی جگ پانی پی جاتا ہے۔ کہتا ہے اندر آگ ہی آگ ہے۔ بجھتی ہی نہیں۔

”بابا جس گھر سے پانی مانگتا ہے، جو کسی مشکل میں ہوں بڑی مشکل میں۔“ ادھیڑ عمر کی عورت نے بتایا۔

”تمہارا مسئلہ کیا تھا؟“ حاجرہ نے پوچھا۔

”یہ میرا بیٹا ہے۔ اس کا شوہر“ بوڑھی عورت نے ادھیڑ عمر عورت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”وہ بارہ سال پہلے روزگار کے سلسلے

میں کراچی گیا تھا۔ پہلے تو خط لکھتا رہا۔ پھر ہمیں تو یہ بھی نہیں معلوم تھا۔ یہ جیتا ہے یا مر گیا ہے۔ ہم بڑی تنگی میں رہے۔ اس کے بچے بھی تھے۔ جیسے تیسے گزارہ ہوتا رہا۔ بچے بڑے ہوئے تو کچھ سہارا ملا۔ پھر اس دن بابا آیا، پانی مانگا۔ میں نے پانی پلایا۔ یہ دو جگ پانی پی گیا۔ پھر بولا بہن تیرا بیٹا ایک مہینے کے اندر اندر آ جائے گا۔ اٹھائیسویں دن میرا بیٹا آ گیا۔"

وہ اب بھی مٹھائی کے لئے اصرار کر رہی تھیں کہ الٰہی بخش کمرے سے نکل آیا۔ "تم گئی نہیں؟" اس نے پوچھا۔

"مٹھائی لے لو نا بابا!"

"میں نے کہا نا، تمہارا بیٹا اللہ کے حکم سے واپس آیا ہے۔ اس کا شکر ادا کرو۔ اپنی حیثیت کے مطابق اس کے نام کی خیرات دو غریبوں کو۔"

"حکم اللہ کا تھا بابا پر وسیلہ تو تو تھا۔"

یہ سن کر الٰہی بخش آگ بگولا ہو گیا۔ "کفر کرتی ہے۔" وہ دہاڑا۔ "میرے کہنے سے تیرا بیٹا واپس آ گیا۔ تو مٹھائی لے آئی۔ میرے کہنے سے یہ واپس چلا گیا تو میرا سر پھاڑ دے گی۔ ہے نا۔ جا چلی جا۔" اس کے منہ سے جھاگ نکل رہا تھا۔

حاجرہ ڈر گئی۔ "خدا کے لئے آپ لوگ چلے جاؤ۔ یہ مٹھائی غریبوں میں بانٹ دینا۔"

وہ لوگ چلے گئے۔

ان کے بعد بھی اس طرح کے لوگ آتے رہے۔ کسی کے ہاں اولاد ہوئی تھی۔ کسی کا شوہر ٹھیک ہو گیا تھا۔ کسی کے گھر میں برکت ہو گئی تھی۔ سبھی نذرانے لاتے تھے۔ لیکن الٰہی بخش نے کبھی کوئی چیز قبول نہیں کی اس طرح خاصی تلخی ہو جاتی تھی۔

پھر ایک دن وہی دونوں عورتیں چلی آئیں۔ اس بار ان کے چہرے ستے ہوئے تھے۔ الٰہی بخش گھر میں موجود تھا۔

"بابا.... میرا بیٹا پھر چلا گیا۔ تم نے مجھے بددعا کیوں دی تھی۔" بوڑھی عورت نے کہا۔

"میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ تمہاری سوچ غلط ہے۔" الٰہی بخش نے نرم لہجے میں کہا۔ "نہ وہ میری دعا سے آیا تھا نہ میری بددعا سے گیا ہے۔ سب اللہ کا حکم ہے۔"

"مجھ پر رحم کرو۔"

"کفر مت بولو بہن!" الٰہی بخش دونوں ہاتھوں سے اپنے رخسار پیٹنے لگا۔ "تم میرا سر ہی پھاڑ دو۔ میں نے کہا تھا نا کہ چلا جائے تو میرا سر پھاڑ دینا آ کے۔"

دونوں عورتیں شرمندہ نظر آ رہی تھیں۔ "بابا، ہمارے لئے دعا کر دو نا۔" ادھیڑ عمر عورت گڑگڑائی۔

"دیکھو، وہ پھر آئے گا۔" الٰہی بخش بولا۔ "مگر اب وہ آتا جاتا رہے گا۔ وہاں بھی تو اس کے آنے کی دعا کرنے والے موجود ہیں۔ تم سے زیادہ انہیں اس کی ضرورت ہے۔"

"لیکن بابا......"

"بس اب جاؤ۔" الٰہی بخش نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

اس بار دونوں عورتیں خاموشی سے چلی گئیں۔

پھر یہ مشہور ہو گیا کہ پانی والا بابا کچھ نہیں لیتا۔ بلکہ دینے والوں سے ناراض ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد نذرانوں والے مسئلے سے نجات مل گئی۔

☆

الٰہی بخش کی طبیعت میں ٹھہراؤ آتا جا رہا تھا۔ وہ جو بے خودی اور مدہوشی کی کیفیات اس پر طاری ہوتی تھیں، ان کے درمیانی وقفے بڑھتے اور دورانیے کم ہوتے جا رہے تھے۔ جو روشنی اس کے اندر تھی، اچانک ہی اسے ملی تھی اور اس کے ظرف سے زیادہ تھی۔ مگر اب اتنے عرصے میں وہ بتدریج اس کا عادی ہو گیا تھا۔ اس کے نتیجے میں اس کے مزاج میں ٹھہراؤ، مٹھاس اور ٹھنڈک آ گئی تھی۔ وہ کیفیت اس پر اب بھی طاری ہوتی تھی۔ بلکہ کئی کئی دن طاری رہتی تھی۔ لوگ اسے تنگ بھی کرتے تھے۔ مگر اب اس کی زبان بے قابو نہیں ہوتی تھی۔ دینے والے نے اس کا ظرف بڑھا دیا تھا۔ اس کی سمائی بڑھ گئی تھی۔

اس کا حلقہ بھی بہت بڑھ گیا تھا۔ لوگ باقاعدہ اس کے مرید بن گئے تھے اور وہ خاصی تعداد میں تھے۔ ہر روز دو چار مرید آتے رہتے تھے۔ الٰہی بخش کسی سے کچھ لیتا نہیں تھا۔ دنیاوی معاملات سے اسے غرض نہیں رہی تھی۔ پھر بھی ایک روز یہ بات اس کی سمجھ آ گئی کہ یہ زبردستی کی مہمان داری بیٹوں کے لئے بوجھ بنتی ہے۔ اس کا ذہن اس مسئلے میں الجھ گیا۔ بالآخر اسے اس کا حل سوجھ ہی گیا۔

گاؤں سے باہر سامنے پہاڑی پر درختوں کا ایک جھنڈ تھا۔ وہاں چیڑ کا ایک بہت اونچا اور گھنا درخت تھا۔ اس درخت کے نیچے بیٹھنا اسے بہت اچھا لگتا تھا۔ عرصہ ہوا کہ وحشت کے عالم میں اس نے ادھر اُدھر بھٹکنا چھوڑ دیا تھا۔ جب بھی ایسا ہوتا وہ اس درخت کے نیچے آ بیٹھتا اور ذرا دیر میں پرسکون ہو جاتا۔ پھر وہ بیٹھا اللہ کا شکر ادا کرتا رہتا۔

اس نے معمول بنا لیا کہ صبح وہ گاؤں سے نکل جاتا اور اس درخت کے نیچے جا بیٹھتا۔ حاجرہ سے کہہ دیتا کہ کوئی آئے تو اسے وہیں بھیج دے۔ پھر اس نے نرمی سے عاجزی سے اپنے مریدوں سے کہا کہ وہ ہر روز یا کسی بھی روز نہ آیا کریں۔ بلکہ ہر مہینے چاند کی گیارہ تاریخ کو یہاں آیا کریں۔

اس کے زبان سے نکلی ہوئی بات پوری ہونے کے کئی واقعات ایسے ہوئے تھے کہ لوگ اس سے ڈرنے لگے تھے۔ انہوں نے بلا تامل اسکی بات مان لی۔ پہلے ماہ چاند کی دس تاریخ کو اس نے بیٹوں سے بات کی۔ ''کل مہمان آئیں گے۔ میں انکے لئے کھانے کا بندوبست کرنا چاہتا ہوں۔''

''آپ حکم کریں ابا۔ ہم بس تعمیل کرنے والے ہیں۔''

اگلی صبح بیٹوں نے کھانے کے لئے سودا سلف پہاڑی پر پہنچا دیا۔ الٰہی بخش نے کھانا پکانا شروع کیا۔ جلد ہی مرید آنے لگے۔ انہوں نے یہ ذمے داری سنبھال لی۔ الٰہی بخش اس فکر سے آزاد ہو گیا۔ وہ لوگوں کے مسائل سننے لگا۔

اس دن کے بعد ہر اسلامی ماہ کی گیارہ تاریخ کو یہ معمول بن گیا۔ کھانے کا اہتمام لنگر کا روپ دھار گیا۔ پھر ایک اور تبدیلی آئی۔ الٰہی بخش نے حاجت مندوں کو تعویذ لکھ کر دینے شروع کر دیئے۔ تھوڑے ہی عرصے میں شہرت ہو گئی۔ اللہ نے الٰہی بخش کے تعویذوں کو خاص تاثیر عطا کی تھی۔

بعض لوگ ایسے ہوتے تھے، جن کے مسائل ہنگامی نوعیت کے ہوتے تھے۔ وہ گیارہ تاریخ کا انتظار نہیں کر سکتے تھے۔ وہ پہاڑی پر پہنچ جاتے تھے۔ الٰہی بخش محسوس کرتا کہ معاملہ زیادہ اہم ہے تو وہ اسی وقت تعویذ لکھ دیتا۔ ورنہ گیارہ تاریخ کو آنے کو کہہ دیتا۔

پہلے کی نسبت اب اسے زیادہ فرصت میسر تھی۔ پہاڑی پر بیٹھ کر وہ گھنٹوں دنیا سے بے خبر سوچتا رہتا۔ ایسی باتیں جو کبھی اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھیں۔ مگر اب غور کرتے کرتے، اس کے ذہن میں روشنی کا جھما کا سا ہوتا۔ لگتا کہ بات اس کی سمجھ میں آ گئی ہے لیکن وہ اسے لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا تھا... دوسروں کو سمجھا نہیں سکتا تھا۔ وہ اٹھ کر مضطربانہ ٹہلنے لگتا۔ وہ زور زور سے خود سے باتیں کرتا۔ کبھی کوئی پتھر اٹھا کر دور اچھال دیتا۔ ایسے عالم میں جو لوگ اسے دیکھتے دیوانہ ہی سمجھتے۔ یہ بے بسی اور جھنجلاہٹ اسے مطالعے کی طرف لے گئی۔ شاعری کے مجموعے اس کے پاس پہلے ہی سے تھے۔ مگر اب وہ انہیں مختلف روشنی میں دیکھتا تھا۔ اس کے بعد مطالعے کی طلب بڑھی تو وہ دینی اور علمی کتب کی طرف راغب ہو گیا۔ مگر اس کے حصے میں وہی کتابیں آئیں، جو عام تھیں۔ خاص کتابوں تک اس کی رسائی ممکن ہی نہیں تھی۔

الٰہی بخش کو احساس ہوتا تھا کہ اس کے سینے میں کوئی معلم بیٹھا ہے۔ وہ اسے پڑھاتا، پڑھنے پر اکساتا اور مشکل مسائل سمجھاتا ہے۔ وہ جو کوئی بھی تھا، بہت اچھا استاد تھا۔ بہت اچھا رہنما تھا۔ اس نے کبھی بھٹکنے نہیں دیا۔

☆

ڈیرے دی ونڈ میں فرید حسین شاہ کی باڈی کے سامنے کچھ سادات اکٹھے تھے۔ چائے کا دور چل رہا تھا۔ سامنے ہی شاہ فرید کا پکا مکان تعمیر ہو رہا تھا۔

''یہ تم نے اچھا کیا شاہ فرید کہ مکان کی طرف دھیان دیا۔'' افضل شاہ نے کہا۔ ''ساری زندگی کچے مکان میں گزار دی۔''

''میں تو اب بھی نہیں چاہتا تھا'' شاہ فرید بولے۔ ''اس فانی دنیا میں مکان پختہ کرنے کا فائدہ۔ میں اس کچے مکان میں ہی خوش تھا۔ مگر بچوں کے خیال سے راضی ہو گیا۔''

''ہاں بھئی .... زمین دار لوگ ہی پیچھے رہ گئے اس معاملے میں۔'' شاہ نصیر نے تاسف سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''کام کرنے والوں نے اونچے مکان بنالئے۔''

شاہ فرید مختلف مزاج کے تھے۔ روایات کی پاس داری کرنے والے۔ لیکن بلا کے منکسر المزاج۔ غرور اور گھمنڈ سے کوسوں دور۔ وہ بولے۔

''مجھے کسی سے مقابلہ تھوڑا ہی کرنا ہے۔ ہر انسان اپنی جگہ ٹھیک ہے۔ کسی کو اللہ نے دیا اور کسی نے پکا مکان بنایا تو میرے لئے تو یہ خوشی کی بات ہے۔''

''نہیں شاہ فرید، یہ ضروری تھا۔'' انوار شاہ نے کہا۔ ''یہ وقت ایسا ہے کہ نیچ لوگ سر پر چڑھنے لگے ہیں۔''

شاہ فرید مصلحتاً خاموش ہو گئے۔ ورنہ عام طور پر وہ ایسی باتوں سے اختلاف کرتے تھے۔ ''ہاں جی، یہ تو سچ ہے۔'' افضل شاہ نے تائید کی۔ ''وہ پیر بخش جلاہے کے بیٹے الٰہی بخش کا سنا تم نے۔''

''کون .... وہ باڈہ بجنگ والا۔'' فرید شاہ بولے۔ ''اس کا تو برسوں سے نہیں سنا۔''

''لو .... سب کو معلوم ہے کہ وہ دیوانہ ہو گیا۔'' انوار شاہ نے بتایا۔ ''دکان کا رو بار بیٹے سنبھالتے ہیں۔''

''دیوانہ ہونا تو پرانی بات ہو گئی۔ اب تو وہ پیر بن گیا ہے۔'' افضل شاہ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''ہاں جی، مرید بھی کم نہیں ہیں اس کے۔'' شاہ نصیر نے کہا۔ ''تعویذ بھی لکھ کر دیتا ہے۔ مہینے کی گیارھویں کو لنگر بھی ہوتا ہے۔''

''اب جلاہے بھی پیر بننے لگے۔'' افضل شاہ بولے۔

وحید شاہ خاموشی سے باتیں سن رہے تھے۔ انہوں نے اب تک لب کشائی نہیں کی تھی۔ اچانک سامنے کچے راستے پر انہیں الٰہی بخش سڑک کی طرف جاتا دکھائی دیا۔ ''لو بھئی .... بڑی عمر ہے اس کی۔ ہم اسی کی باتیں کر رہے تھے اور وہ آ گیا۔''

انور شاہ نے الٰہی بخش کو پکارا۔ ''الٰہی بخش .... او الٰہی بخش!''

الٰہی بخش اس وقت کیفیت میں تھا۔ انور شاہ کی آواز اس کی محویت نہ توڑ سکی۔

''دیکھو تو، کیسے نظر انداز کر رہا ہے ہمیں۔ دماغ چڑھ گیا ہے اس کا پیر بن کے۔'' افضل شاہ نے تبصرہ کیا۔

اس پر انور شاہ کو جلال آ گیا۔ ''او الٰہی بخش سنتا نہیں ہے۔'' انہوں نے گرج کر کہا۔ ''ادھر آ۔''

اس بار الٰہی بخش کو احساس ہوا کہ کسی نے پکارا ہے۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ باڈی کے سامنے سے وہ لوگ بیٹھے نظر آئے۔ ''باجی .... مجھے آواز دی آپ نے؟'' اس نے نرم لہجے میں پوچھا۔

''ہاں الٰہی بخش ادھر تو آ۔''

الٰہی بخش ان کے قریب چلا گیا اور ہاتھ باندھ کر خادموں کی طرح کھڑا ہو گیا۔ ''حکم سرکار!''

''تو بہرا ہو گیا ہے الٰہی بخش یا جان بوجھ کر آواز نہیں سنی تھی؟'' انور شاہ نے ترش لہجے میں کہا۔

''نہیں باجی، آواز نہیں سنی تھی، ورنہ یہ گستاخی کیسے کرتا۔'' الٰہی بخش نے عاجزی سے کہا۔

''گستاخی کیسی، اب تو تو بھی باجی بن گیا ہے!'' افضل شاہ نے طنز کیا۔

''توبہ سرکار، بابا جی کوئی بن سکتا ہے۔ وہ تو اللہ پاک پیدا فرماتے ہیں۔ اللہ کی طرف سے یہ عزت پیدا ہوتے ہی مل جاتی ہے۔'' الٰہی بخش نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا ''میں تو جلاہا پیدا ہوا تھا سرکار!''

''پھر بھی پیر تو بن ہی گیا ہے تو۔'' شاہ نصیر بولے۔

''میں کہاں کا پیر، پیری تو آپ کے لئے ہے۔ میں تو خادم ہوں آپ کا۔''

''اور یہ مرید جو پال رکھے ہیں؟''

''زبردستی گلے پڑے ہیں پیرو، میں تو بس دل آزاری سے بچنے کے لئے چپ رہتا ہوں۔ دل نہیں توڑنا چاہتا کسی کا۔ اللہ جی کا حکم ہے نا شاہ جی سرکار۔''

''دل میں تو بہت خوش ہوتا ہوگا!'' وحید شاہ بولے۔

''خوش تو میں ہر حال میں رہتا ہوں سرکار، اس عزت کی کبھی آرزو نہیں کی تھی۔ پر وہ جسے چاہے عزت دے۔ اس کی مرضی تو حرف آخر ہے۔'' الٰہی بخش نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی۔

''یہ تو بتا کہ تعویذ میں کیا لکھتا ہے؟''

''ضرورت کے مطابق اللہ کے کلام کی کوئی آیت لکھ دیتا ہوں باجی، تاثیر تو وہی ڈالنے والا ہے۔''

''تو اب تو عالم بھی بن گیا؟''

''نہیں سرکار، علم تو بہت بڑی چیز ہے۔ جیسی جس کے گمان میں آئی۔ انسان تو بس صابر ہے پیرو، بڑی صبر والی ہے یہ مخلوق۔''

''لے..... انسان صبر میں کہاں، وہ تو بہت بے صبرا ہے۔''

''گستاخی معاف پیرو!'' الٰہی بخش نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا ''پر سب کچھ اس کے صبر ہی سے شروع ہوتا ہے۔ وہ ایک شاعر نے کہا تھا کبھی میں وہ صبر صمیم ہوں جس نے۔ بار امانت سر پہ لیا تھا کیسا شعر کہا ظالم نے!''

''شاعر تو یونہی بکتے ہیں۔'' انور شاہ نے غصے میں کہا۔

''نہ پیرو نہ۔ بہت بڑا شعر کہا ہے اس نے۔''

''میری سمجھ میں تو یہ صبر نہیں آتا۔''

''میری سمجھ میں بھی نہیں آتا تھا، پر اب آنے لگا ہے۔'' الٰہی بخش کہیں کھو گیا۔ اب جیسے وہ ان کے درمیان نہیں تھا۔ اس کا لہجہ اور انداز ہی بدل گیا۔ اب جیسے وہ خود سے باتیں کر رہا تھا۔ ''اللہ جی نے پکارا ہے کوئی جو میری ایک امانت کا بوجھ اٹھائے۔ یہ سن کر سمندر کی سانسیں ٹوٹنے لگیں۔ پہاڑ ہیبت سے لرزنے لگے۔ پوری کائنات پر لرزہ طاری ہو گیا۔ کسی کو طاقت، مجال نہیں تھی کہ وہ بوجھ اٹھاتا۔ یہ کائنات کا سب سے بڑا صبر ہے۔''

''یہ تو واقعی دیوانہ ہے، بے سروپا باتیں کر رہا ہے!'' انور شاہ نے کہا۔

''مجھے تو ایسا نہیں لگتا۔'' شاہ فرید بولے۔ وہ پہلی بار کچھ بولے تھے ''لیکن نہیں، یہ وہ باتیں کر رہا ہے جو دیوانوں ہی کی سمجھ میں آ سکتی ہیں۔'' پھر وہ الٰہی بخش کی طرف مڑے ''اور وہ امانت کیا تھی؟''

''وہ امانت اللہ کی تمام صفات کا پرتو تھا..... ہلکا سا عکس.....''

''میں سمجھا نہیں۔'' شاہ فرید نے کہا۔

''اللہ نے اپنی تمام صفات انسان کو ہی سونپ دیں۔ رحم، کرم، جبر پوری ننانوے صفات! اور اپنا اسم ذات نور سے لکھ کر پہلے ہی اس کی پیشانی میں رکھ دیا تھا۔ اللہ نے جب جن و ملائک کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو تو وہ شرک کا حکم تو نعوذ باللہ نہیں دیا تھا۔ وہ سجدہ آدم کے لئے نہیں تھا۔ وہ تو

پیشانی میں محفوظ اسم ذات کے لئے تھا، اللہ کے لئے تھا، اسی لئے تو شاعر نے کہا میں وہ اسم عظیم ہوں جس کو جن وملک نے سجدہ کیا تھا۔ پھر اپنی ننانوے صفات کا عکس انسان پر ڈالا تو اس نے یہ بتا دیا کہ انسان اس کا خلیفہ اس کا نائب ہے۔ اس میں اتنا صبر ہے کہ وہ یہ بوجھ اٹھا سکتا ہے تو انسان میں رحیمی بھی ہے، غفاری بھی، قہاری بھی......"

"کیا کفر بک رہا ہے؟" افضل شاہ غرائے۔

لیکن الٰہی بخش کہیں کھویا ہوا تھا۔ اس نے ان کی بات نہیں سنی۔ اسے تو ہوش بھی نہیں تھا کہ وہ کچھ لوگوں کے درمیان ہے۔ وہ تو جیسے خود سے باتیں کررہا تھا "تو انسان کا سب سے بڑا مسئلہ ان صفات کے درمیان توازن قائم کرنا ہے۔ رحمتوں کا، صفات کا یہ توازن صرف ایک انسان نے قائم کر کے دکھایا۔ میرے حضور رحمت العالمین ﷺ نے۔ یوں امانت کا حق ادا ہوا اور انسانیت سرخرو ہوئی۔"

شاہ فرید حیرت سے سن رہے تھے۔ یہ الفاظ، یہ باتیں الٰہی بخش کی نہیں لگ رہی تھیں۔ وہ تو عام سا آدمی تھا جو علم کے ع سے بھی کوسوں دور تھا۔

"ورنہ انسان تو عہد اعتدال سے گزر جانے والا ہے۔" الٰہی بخش کہے جا رہا تھا "وہ رحم کرنے میں حد سے بڑھا تو ظالم ہو گیا"

"وہ کیسے؟" شاہ فرید نے پوچھا۔

"آدمی جب حد سے گزر کر رحم کرتا ہے تو جس پر رحم کیا جا رہا ہو، اس پر وہ ظلم ہو جاتا ہے۔ یہی نہیں، خود رحم کرنے والا اپنے اوپر بھی ظلم کرتا ہے۔ اور انسان نے قہر کے معاملے میں اعتدال کا دامن چھوڑا تو چنگیز خان، ہلاکو خان اور ہٹلر بن گیا۔ ہر صفت رحمت والی ہے لیکن انسان نے اسے انسانوں کے لئے ایذا کا باعث بنا دیا۔ یہ امانت میں خیانت ہوئی......"

"اچھا الٰہی بخش، یہ بتاؤ کہ قہر اور جبر رحمت کیسے ہیں؟" شاہ فرید نے پوچھ

الٰہی بخش دونوں ہاتھوں سے رخسار پیٹنے لگا "میرے اللہ کی صفات تو رحمت ہی رحمت ہیں۔ رحمت کے سوا کچھ نہیں۔ اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گیا اور کچھ سوچنے لگا۔ خاصی دیر کے توقف کے بعد وہ بولا "فرض کرلیں کہ میں نے اپنے دل میں کسی برائی کا ارادہ کیا اور یہ سوچ کر گھر سے نکلنا چاہا۔ اللہ کے حکم سے میرے بچے کے پیٹ میں درد اٹھا۔ مجھے بچے سے محبت ہے۔ تو میں اپنا ارادہ بھول کر اس کی دوا دارو میں لگ جاؤں گا۔ یہ جبر ہے۔ بچے کے پیٹ میں درد کی وجہ سے میں ارتکاب گناہ سے بچ گیا۔ اور فرض کرلیں کہ میں پھر بھی باز نہیں آیا۔ میں وہ گناہ کرنے نکلا، اس بار اللہ کے حکم سے مجھے کسی شبے میں پولیس نے پکڑ لیا، تھانے میں مار پڑی مگر بالآخر جان چھوٹ گئی مگر میں ارتکاب گناہ نہ کرسکا۔ یہ بھی جبر ہے اور اللہ کی رحمت ہے۔ یہ پہلے کی نسبت زیادہ جبر ہے۔ اس لئے کہ پہلے مرحلے میں میرا صرف ارادہ تھا، گناہ کا تو جبر بھی ہلکا تھا مگر اب میں گناہ کے ارادے نکل کھڑا ہوا تھا تو رحمت کرنے والے نے جبر بڑھایا۔ مجھے قید کرایا، یعنی مجھے مہلت دی کہ میں اپنے ارادے سے باز آجاؤں۔ اب فرض کریں کہ میں بد نصیب پھر بھی باز نہیں آیا۔ تھانے سے چھوٹتے ہی میں آگے بڑھا کہ یہ گناہ تو میں کر کے رہوں گا۔ اب منزل سے کچھ فاصلے پر میرا حادثہ ہو جاتا ہے، میری ٹانگ ٹوٹ جاتی ہے۔ اب میں گناہ کی اہمیت ہی کھو بیٹھا ہوں۔ عمر بھی کے لئے لنگڑا تو ہو گیا لیکن میں پختہ ارادے کے باوجود اس گناہ سے تو بچ گیا۔ یہ جبر ہے اور رحمت ہے۔ ہے کہ نہیں؟ اللہ کو بندے کو گناہ سے بچانا ہے۔ اللہ نے قہر کر کے رحمت کی اور اس کے نامۂ اعمال کو اور سیاہ ہونے سے بچا لیا۔ پھر دنیاوی سزائیں آخرت کی سزا میں کمی کا موجب بھی ہوتی ہیں۔"

شاہ فرید کے منہ سے بے ساختہ کلمۂ تحسین نکل گیا۔ ان کا جسم لرز رہا تھا۔

اچانک الٰہی بخش کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اس کے منہ سے ایک نعرۂ مستانہ نکلا۔ اللہ ہو...... پھر وہ اس کی تکرار کرتا چلا گیا۔ اللہ ہو اللہ ہو... اور وہ لڑکھڑاتے قدموں سے ایک طرف چل دیا۔ وہ لوگ اسے جاتے دیکھ رہے تھے۔ سب کے جذبات مختلف تھے۔

☆

شاہ فرید کا مکان مکمل ہو چکا تھا۔

اس روز دوپہر کو وہ باہر نکلے۔ ان کا دل کچھ گھبرا رہا تھا۔ وہ سامنے گندم کے کھیت کی طرف گئے۔ سامنے ناڑی پر الٰہی بخش آتا دکھائی دیا۔ وہ کالج چوک کی طرف سے آ رہا تھا، انہوں نے اسے آواز دینے کا ارادہ کیا۔ لیکن پھر خود کو روک لیا۔ اسی لمحے الٰہی بخش نے سر گھما کر دیکھا اور اس کی نظر ان پر پڑ گئی۔ وہ کھیت کے پہلو میں بنے کچے راستے پر مڑ گیا جہاں وہ کھڑے تھے۔

ان دنوں الٰہی بخش بہت تکلیف میں تھا۔ اس کا جوڑوں کا درد بہت بڑھ گیا تھا۔ اس کا حلیہ بھی بہت خراب ہو رہا تھا۔ میلے کپڑے چکٹ تھے اور بال الجھے ہوئے۔ شاہ فرید کے سامنے پہنچ کر اس نے ادب سے انہیں سلام کیا اور پھر ان کا ہاتھ عقیدت سے چوما۔

شاہ فرید نے سلام کا جواب دینے کے بعد پوچھا۔ ''مجھے پہچانتے ہو الٰہی بخش۔''

''کیوں نہیں باجی سرکار!''

''اس دن تو تم نے مجھے نہیں پہچانا تھا۔''

''کس دن میرے سرکار۔'' الٰہی بخش نے تشویش سے پوچھا۔ ''کب میں گناہ گار ہوا تھا... مجھے بتائیں باجی۔''

شاہ صاحب نے اسے یاد دلانے کی کوشش کی لیکن الٰہی بخش کو وہ دن یاد ہی نہیں تھا۔ شاہ فرید کو اس کی اس روز کی گفتگو اب بھی یاد تھی۔ وہ سمجھ گئے کہ الٰہی بخش سچ بول رہا ہے۔ وہ اس روز یقیناً جذب کی کیفیت میں تھا۔

''لوگ کہتے ہیں کہ تم دیوانے ہو گئے الٰہی بخش؟''

''مجھے نہیں پتا باجی، پر میں نے کبھی کسی کو پتھر نہیں مارا، کوئی تکلیف نہیں پہنچائی۔''

''ٹھیک کہتے ہو۔'' شاہ فرید نے آہ بھر کے کہا ''نادان تو تمہیں پھر بھی دیوانہ کہیں گے۔ یہ بتاؤ، تم کیسے ہو الٰہی بخش؟'' ان کے لہجے میں بزرگانہ شفقت تھی، حالانکہ وہ عمر میں الٰہی بخش سے چھوٹے تھے۔

''غلام کے لئے دعا کریں سرکار۔'' الٰہی بخش نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا ''جوڑوں کے درد سے پریشان ہوں۔''

شاہ فرید خود کو اس کی طرف کھنچتا محسوس کر رہے تھے۔ انہیں اس دیوانے سے خوف نہیں محسوس ہو رہا تھا، بلکہ پیار آ رہا تھا ''اللہ بہتر کرے گا الٰہی بخش۔ یہ دنیاوی تکالیف تو آزمائش ہوتی ہیں۔ اللہ تمہیں سرخرو گزارے۔'' وہ کہتے کہتے رکے پھر بولے ''آؤ، میرے گھر چلو۔ کچھ دیر سکون سے بیٹھو۔ دھوپ بہت ہے۔''

''میرا یہ مقام نہیں سرکار!'' الٰہی بخش نے عاجزی سے کہا۔

شاہ فرید اصرار سے اسے گھر لے گئے۔ انہوں نے بیٹھک کا دروازہ کھولا اور اسے اندر آنے کو کہا۔

''میں ادھر باہر دہلی کے سامنے بیٹھوں گا باجی سرکار۔''

''نہیں، اندر آؤ۔''

الٰہی بخش نے چپلیں باہر اتار دیں اور یوں کمرے میں داخل ہوا جیسے مسجد میں جا رہا ہو۔

''آؤ، ادھر بیٹھو۔'' شاہ فرید نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

''خدا کے لئے باجی، یہ حکم نہ دیں۔'' الٰہی بخش گڑگڑایا۔ ''میں تو خاک نشین ہوں، اوپر بیٹھنے کو کہیں گے تو میں سر پھوڑ کر۔''

شاہ فرید جانتے تھے کہ وہ یہی کچھ کر گزرے گا۔ انہوں نے ایک نظر اسے دیکھا۔ وہ دست بستہ کھڑا تھا ''اچھا الٰہی بخش جہاں جی چاہے بیٹھ جاؤ۔''

''پہلے آپ بیٹھیں باجی۔''

شاہ فرید نیچے بیٹھنے لگے تو اس نے ان کے پاؤں پکڑ لئے "آپ اوپر بیٹھیں سرکار۔"
اب شاہ فرید کو احساس ہوا کہ ان کا واسطہ واقعی دیوانے سے پڑا ہے۔ اس کا رویہ انہیں شرمندہ کر رہا تھا لیکن وہ اسے روک بھی نہیں سکتے تھے۔ انہوں نے عافیت اسی میں جانی کہ بحث کرنے کے بجائے اس کی بات مان لیں۔ وہ صوفے پر بیٹھ گئے۔
ان کے بیٹھتے ہی الٰہی بخش ان کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ وہ ان کے پاؤں دبانے لگا۔
شاہ فرید کسمسائے "زیادہ نہ کرو الٰہی بخش مجھے شرمندگی ہوتی ہے۔ مان جاؤ"
"باجی ـــ یہ تو میرے جوڑوں کے درد کا علاج ہے۔ مجھے نہ روکیں ـــ آپ کو اللہ جی کا واسطہ۔"
شاہ فرید مزاج کے خلاف اسے برداشت کر رہے تھے۔
"ایک بات کہوں باجی، آج میرے باپ کی روح بہت خوش ہوگی۔"
"کیوں الٰہی بخش۔"
"ابا ساری عمر مجھے آل رسولؐ سے عشق کی تلقین کرتے رہے۔ میں کہتا عشق کیا نہیں جاتا، خود بخود ہو جاتا ہے۔ جب نصیب میں ہوا تو مجھے بھی ہو جائے گا۔" الٰہی بخش نے توقف کیا اور ایک گہری سانس لی۔ "آج میرے نصیب جاگ گئے۔ میرے اللہ جی نے مجھے عشق کی دولت دے دی۔ میں بہت خوش ہوں باجی۔ آج عاقبت سنورنے کا سامان ہوا ہے۔"
شاہ فرید کا چہرہ تمتما اٹھا لیکن دیوانہ ان کے اختیار میں نہیں تھا۔ انہوں نے دل میں خدا سے عرض کی مجھے تکبر اور گھمنڈ سے محفوظ فرما معبود۔
الٰہی بخش شاہ فرید کے پاؤں دبا تا رہا۔ اس کے چہرے پر خوشی کی ایسی چمک اور روشنی تھی کہ اس کے چہرے پر نگاہ نہیں ٹھہر رہی تھی۔
شاہ صاحب نے اندر گھر میں کھلنے والے دروازے کی طرف منہ کر کے پکارا "سجاد حسین ـــ سجاد حسین، ادھر آؤ۔"
چند لمحے کے بعد دروازہ کھلا اور ایک دراز قد خوش رو لڑکا کمرے میں آیا "جی ابو جان۔"
الٰہی بخش جھپٹ کر اٹھا اور سجاد کے ہاتھ چومنے لگا "ماشاءاللہ ماشاءاللہ" اس کے لہجے میں اور نگاہوں میں محبت تھی۔
"جاؤ بیٹے لسی لے کر آؤ۔"
"نہ سرکار، نہ" الٰہی بخش نے نفی میں سر ہلایا "مجھے بس ٹھنڈا پانی پلا دیں۔"
"یہ بھی ٹھنڈا پانی ہی ہے الٰہی بخش!" شاہ فرید نے کہا اور بیٹے کی طرف مڑے "جاؤ بیٹے، لسی لاؤ۔"
سجاد حسین چلا گیا تھوڑی دیر بعد وہ لسی کا جگ اور دو گلاس لے کر آیا اور بھر کر دونوں کو دیئے۔ اس کے جانے کے بعد شاہ صاحب نے اصرار کر کے الٰہی بخش کو لسی پلائی۔
لسی پینے کے بعد الٰہی بخش چھت کو تکنے لگا۔ اچانک اس کی نظر دیواروں پر پڑی جو رنگ و روغن سے محروم تھیں۔ "گستاخی معاف باجی سرکار!" اس نے کہا "اجازت ہو تو ایک بات کہوں۔"
"کہو الٰہی بخش۔"
"اللہ کے حکم سے آپ نے مکان بہت اچھا بنایا ہے۔ پر رنگ و روغن نہیں کرایا اب تک۔"
"کرا لوں گا کبھی۔" شاہ صاحب نے بے پروائی سے کہا۔
"شاہ صاحب یہ کام مجھے دے دیں۔"
"دیکھیں گے۔ ابھی تو میرا ارادہ نہیں۔"
الٰہی بخش نے جھپٹ کر ان کے پاؤں پکڑ لئے "باجی، یہ کام مجھے دیدیں۔ میں آپ کے گھر میں رنگ کروں گا۔"

شاہ فرید ہچکچا رہے تھے۔ "الٰہی بخش تمہارے لئے مشکل ہے۔ ایک تو جوڑوں کا درد۔ پھر عرصے سے تم نے یہ کام چھوڑا ہوا ہے۔"

الٰہی بخش انگلیوں پر گننے لگا "ستائیس سال ہو گئے سرکار ستائیس سال پہلے آخری بار یہ کام کیا تھا اس کا لہجہ خواب ناک ہو گیا۔ "بس پھر برش سے ناتا ٹوٹ گیا لیکن اب آخری بار آپ کا کام کرنا چاہتا ہوں۔"

"لیکن کیوں؟"

"باجی، اللہ نے مجھ بے ہنر کو یہ ہنر دیا تھا۔ اس سے میں نے ایک عمر حلال کی روٹی کمائی۔ دنیا سنواری، پھر یہ کام چھوڑ دیا۔ اب اس سے آخرت کا کام کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کے گھر میں محبت سے بہت اچھا رنگ کروں گا۔ کیا پتا آپ کی دعا سے، میری محبت سے خوش ہو کر اللہ جی مجھ گناہ گار کو بھی جنت میں ایک گوشہ دے دیں۔"

"لیکن الٰہی بخش ..."

"خدا کے لیے مجھے مایوس نہ کرنا باجی۔" الٰہی بخش نے پھر ان کے پاؤں پکڑ لئے۔

"اچھا ٹھیک ہے، الٰہی بخش۔" شاہ صاحب نے اپنے پاؤں سمیٹتے ہوئے کہا "میں تمہاری خوشی ضرور پوری کروں گا۔"

شاہ فرید کی ہچکچاہٹ بے سبب نہیں تھی۔ ان دنوں ان کا ہاتھ تنگ تھا۔ اسی لئے انہوں نے رنگ و روغن کا کام موخر کر دیا تھا۔

"چلیں بازار۔ میں آپ کو رنگ بھی رعایت پر دلاؤں گا۔"

"آج نہیں الٰہی بخش کل صبح چلیں گے۔" شاہ صاحب نے اسے ٹال دیا۔ "ابھی تم آرام سے بیٹھو۔"

☆

اگلی صبح نو بجے شاہ فرید اپنی ہانڈی میں روزمرہ کے کام نمٹا رہے تھے کہ الٰہی بخش نازل ہو گیا۔ دست بوسی کے بعد وہ بولا "باجی، چلیں۔"

"کہاں؟"

"بازار رنگ روغن کا سامان لینے۔"

"ابھی تو بازار کھلا بھی نہیں ہو گا۔" شاہ فرید بولے "تم سکون سے بیٹھو، چائے پیو، پھر بازار بھی چلیں گے۔"

الٰہی بخش وہیں زمین پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد میں شاہ صاحب کا منجھلا بیٹا اعجاز حسین چائے لے آیا۔ وہ چائے پیتا رہا۔

شاہ صاحب نے کچھ پیسوں کا بندوبست کر لیا تھا۔ عام حالت میں وہ ابھی رنگ نہ کراتے لیکن دیوانے کے آگے ہار گئے تھے۔ ساڑھے دس بجے کے قریب انہوں نے الٰہی بخش سے کہا "آؤ بازار چلیں۔"

دونوں بازار چلے گئے۔ الٰہی بخش انہیں ایک دکان پر لے گیا۔ وہاں اس نے ضرورت کی تمام چیزیں خریدیں اور اس کے بعد جو بھاؤ تاؤ شروع کیا تو دکان دار بھی پریشان ہو گیا۔

"دیکھو بابا، اتنے کا تو یہ مجھے بھی نہیں پڑتا" دیکھو دکان دار نے احتجاج کیا "اپنا نفع تو میں چھوڑ سکتا ہوں، نقصان میں مال دینے لگا تو چل لی میری دکان۔"

"ہر جگہ منافع نہیں دیکھتے بالکے۔" الٰہی بخش نے دبدبے سے کہا "ساری زندگی منافع لیا ہے، آج نقصان میں بھی دے کر دیکھ۔ جانتا نہیں، یہ کس کے گھر کا کام ہے" اس نے شاہ فرید کی طرف اشارہ کیا "مجھے دیکھ، میں اپنے منافع میں تجھے شریک کر رہا ہوں۔ کچھ آخرت کا سامان بھی کر لے۔"

شاہ صاحب کا شرمندگی سے برا حال تھا۔ وہ بولے "نہیں الٰہی بخش، ایسی رعایت مجھے نہیں چاہئے۔ میں پوری قیمت ادا کروں گا۔"

"باجی، کسی کی آخرت کے منافع کا معاملہ ہو تو مرضی کے خلاف بھی کر لیا کریں۔" الٰہی بخش نے شاہ صاحب سے کہا اور پھر دکاندار سے بولا

"بول کیا کہتا ہے۔"

دکاندار نے اس کی آنکھوں میں ایک پل دیکھا اور موم ہو گیا۔

الٰہی بخش نے اسی دن سے کام شروع کر دیا۔

شاہ صاحب پریشان تھے۔ جانتے تھے کہ الٰہی بخش جوڑوں کے درد کا مریض ہے۔ پھر اس کی عمر بھی کم نہیں تھی۔ صحت کی خرابی ویسے بھی عمر کو بڑھا دیتی ہے اور مکان ان کا، ماشاء اللہ بہت بڑا تھا اور دو منزلہ بھی۔ کام بہت تھا لیکن الٰہی بخش کو یہ گوارا نہیں تھا کہ اس کام میں کسی کو شریک کرے۔ سو وہ پریشان ہونے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

اب الٰہی بخش کے کام کی وہ رفتار بھی نہیں تھی۔ پھر بھی وہ بڑی لگن اور محبت سے کام کر رہا تھا۔ ایک دیوار پوری کرنے کے بعد وہ دیر تک کھڑا اسے ناقدانہ نظروں سے دیکھتا رہتا۔ اس مصور کی طرح جس نے کوئی شاہکار تخلیق کرنے کا ارادہ کر لیا ہو۔ پھر وہ دوبارہ اسی دیوار پر کام شروع کر دیتا۔

شاہ صاحب نے گھر میں کہہ دیا تھا کہ الٰہی بخش کے کھانے پینے کا خاص خیال رکھنا ہے۔ انہوں نے بیٹوں کو بھی ہدایت کر دی تھی کہ وہ الٰہی بخش کا خاص خیال رکھتے۔

شاہ صاحب کے بیٹوں کے لئے الٰہی بخش عجوبے سے کم نہیں تھا۔ شاہ صاحب کے چار بیٹے تھے۔ سب سے چھوٹا دلدار حسین تو بہت چھوٹا تھا۔ تین بیٹے سجاد حسین، اعجاز حسین اور تصور حسین سمجھدار تھے۔ تصور کو پیار میں گل پیر کہا جاتا تھا۔ تینوں لڑکوں کو قوالی سے بڑی دلچسپی تھی۔ شاہ صاحب کی مرضی کے خلاف وہ ڈیک لے آئے تھے۔ جب بھی موقع ملتا، وہ قوالی کا کوئی کیسٹ لگا دیتے۔

کام کی رفتار میں یہ ایک چیز بھی مانع تھی کہ کسی قوالی میں حضور ﷺ کا اسم مبارک آ جاتا تو بیٹھا ہوا الٰہی بخش کھڑا ہو جاتا اور ہاتھ سینے پر باندھ کر نظریں زمین پر جما دیتا۔ اسے ہوش ہی نہ رہتا۔ یہاں تک کہ گل پیر اسے ہلاتے ہوئے کہتا "بابا.... قوالی ختم ہو گئی ہے۔"

یہ بات قوالی کی حد تک نہیں تھی۔ گفتگو میں بھی کوئی حضور ﷺ کا اسم مبارک زبان پر لاتا تو الٰہی بخش احترام میں غلاموں کی طرح کھڑا ہو جاتا اور کھو جاتا۔ ایسی عقیدت اور احترام لڑکوں نے کہیں نہیں دیکھا تھا۔ الٰہی بخش خود ان کی اتنی عزت کرتا، جیسے وہ اس کے بزرگ ہوں۔

فرید شاہ صاحب کا معمول تھا کہ ہر روز الٰہی بخش سے اس کی ضرورت کئی کئی بار پوچھا کرتے۔ الٰہی بخش ہر بار یہی کہتا کہ اسے بس ان کی دعاؤں کی ضرورت ہے "مجھے کچھ نہیں چاہئے باجی، آپ بار بار کیوں پوچھتے ہیں۔"

"یہ میرا فرض ہے۔ تم میرے لئے کام کر رہے ہو۔ مجھے ہر طرح سے تمہارا خیال رکھنا ہو گا لیکن تم کبھی مانگتے نہیں۔"

"مجھے جو چاہئے، وہ مل رہا ہے اور کیا مانگوں؟" الٰہی بخش کہتا۔

شاہ فرید کے بیٹے، الٰہی بخش سے بہت مانوس ہو گئے تھے۔ کبھی موڈ میں ہوتا تو الٰہی بخش ایسی دانش کی باتیں کرتا کہ وہ حیران رہ جاتے۔ نبی کریم ﷺ کے احترام کا مظاہرہ بھی ان کے لئے بہت خوش کن تھا۔ مجموعی طور پر عمر کے فرق کے باوجود اس کی صحبت میں خوش رہتے۔

کام اپنی مخصوص رفتار سے چل رہا تھا۔ لیکن اس بات کا اعتراف سب کو تھا کہ الٰہی بخش غیر معمولی طور پر اچھا کام کر رہا ہے۔

ایک دن شاہ فرید معمول کے مطابق الٰہی بخش کے پاس آئے۔ شام کا وقت تھا، الٰہی بخش گھر جانے کی تیاری کر رہا تھا "کیسے ہو الٰہی بخش؟"

"اللہ کا شکر ہے باجی، بس جوڑوں کی تکلیف بہت بڑھ گئی ہے۔" الٰہی بخش نے کہا، پھر بولا "اجازت ہو تو کل کام سے چھٹی کر لوں سرکار۔"

"اجازت کی ضرورت نہیں۔ الٰہی بخش تم میرے نوکر تو نہیں ہو۔" شاہ صاحب نے کہا "تم جب چاہو، چھٹی کر سکتے ہو۔"

"پر میں تو اجازت لوں گا باجی۔ میں کل سول اسپتال جاؤں گا۔"

"نہیں، وہاں جانے کی ضرورت نہیں۔ وہاں کوئی پروا نہیں کرتا مریض کی۔ ناظم آباد میں ایک ڈاکٹر ظہیر ہے۔ تم کل سجاد حسین کے ساتھ اس کے پاس چلے جانا۔"

"باجی سرکار، میں آپ کا پیسہ نہیں خرچ کرانا چاہتا۔"

"ایسی کوئی بات نہیں۔ فیس وہ زیادہ نہیں لیتا۔ تم اپنی جیب سے دے دینا۔"

اس پر الٰہی بخش رضا مند ہو گیا۔ شاہ صاحب اسی شام ڈاکٹر ظہیر کے پاس چلے گئے۔ وہ ان کے معتقدین میں سے تھا۔ شاہ صاحب جا کر اسے سمجھا آئے۔

اگلے روز الٰہی بخش سجاد حسین کے ساتھ ڈاکٹر ظہیر کے پاس چلا گیا۔ ڈاکٹر نے بڑی توجہ سے اسے دیکھا۔ تمام دوائیں اپنے پاس سے دیں اور پھر سجاد حسین سے بولا "چھوٹے شاہ جی، اسے آرام کی ضرورت ہے کم از کم ایک ہفتہ اسے بستر پر لٹائیں چلنے بھی نہ دیں۔"

"فیس کیا دوں ڈاکٹر صاحب؟" الٰہی بخش نے پوچھا۔

"اب آل رسول ﷺ سے کیا فیس لوں گا۔ اللہ اوپر ہی کچھ نواز دے تو اچھا ہے۔" ڈاکٹر نے کہا۔

الٰہی بخش بہت خوش ہوا۔ اس نے کہا "آپ بہت اچھے ہیں ڈاکٹر صاحب، ہر مسلمان کو ایسے ہی سوچنا چاہئے۔"

الٰہی بخش کو اس دوا سے بہت فائدہ ہوا۔ بڑی وجہ یہ تھی کہ ڈاکٹر پر اس کا اعتقاد ہو گیا تھا۔

اسی شام شاہ فرید پھر ڈاکٹر کے پاس گئے۔ ڈاکٹر واقعتاً کچھ لینا نہیں چاہتا تھا لیکن شاہ صاحب نے با اصرار اسے پوری فیس اور دواؤں کے پیسے دیے اور تاکید کی الٰہی بخش کو اس بات کا علم نہیں ہونا چاہئے۔

الٰہی بخش نے بہ مشکل ایک دن ڈاکٹر کی ہدایت پر عمل کیا مگر دوسرے ہی دن کام میں مصروف ہو گیا۔ شاہ صاحب نے دیکھا تو بہت خفا ہوئے "تمہیں ڈاکٹر نے منع کیا تھا۔" انہوں نے پہلی بار الٰہی بخش سے سخت لہجے میں بات کی "کیوں خود کو تکلیف میں ڈالتے اور مجھے گناہ گار کرتے ہو۔"

"یقین کریں باجی سرکار، مجھ سے قسم لے لیں، بستر پر لیٹنے سے زیادہ آرام مجھے آپ کے کام میں ملتا ہے۔" الٰہی بخش نے لجاجت سے کہا۔

شاہ صاحب نے بہت سمجھایا مگر دیوانے سے انہیں ہارنا پڑتا تھا۔

ایک دن شاہ فرید بانڈی میں بھینس کے لئے چارہ بنا رہے تھے۔ اچانک الٰہی بخش ان کے پاس آیا اور ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔

"کیا بات ہے الٰہی بخش؟" شاہ صاحب نے پوچھا۔

"وہ باجی سرکار کل چاند کی گیارھویں تاریخ ہے۔"

شاہ صاحب مسکرائے "مجھے معلوم ہے۔ کل تمہارے مرید آئیں گے۔ تم چھٹی کرو گے۔ یہی بات ہے نا۔ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں، تم اپنی مرضی کے مالک ہو، آزاد آدمی ہو۔"

"یہ بات نہیں سرکار۔"

"تو پھر کیا بات ہے؟"

"وہ... سرکار... بات یہ ہے کہ سرکار..." الٰہی بخش سے بات نہیں کی جا رہی تھی۔

شاہ صاحب نے نظریں اٹھا کر حیرت سے اسے دیکھا۔ اس کی ہچکچاہٹ ان کی سمجھ میں نہیں آئی "کیا بات ہے الٰہی بخش؟"

الٰہی بخش نے دونوں ہاتھ جوڑ لئے "چھوٹا منہ اور بڑی بات ہے سرکار، ڈرتا ہوں، آپ گستاخی نہ سمجھیں۔"

شاہ صاحب نے اس کے دونوں ہاتھ تھام کر کھول دیئے "بولو الٰہی بخش تم مجھے جانتے ہو۔ میں تم پر کبھی غصہ نہیں کروں گا۔"

"سرکار... میں چاہتا ہوں کہ کل آپ کھانا میرے ساتھ کھائیں۔"

ایک لمحے کو شاہ فرید کی رنگت متغیر ہو گئی۔ پھر انہوں نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا "ٹھیک ہے الٰہی بخش... میں آؤں گا۔"

☆

اگلے روز شاہ فرید نے وعدہ جلدی سے نبھانے کا فیصلہ کر لیا۔ وجہ یہ تھی کہ وہ لنگر کا کھانا نہیں کھا سکتے تھے۔ روایات کی پاس داری بھی تو ان کی طبیعت میں تھی اور وہ الٰہی بخش کو انکار بھی نہیں کر سکتے تھے۔

وہ پہنچے تو الٰہی بخش کو اپنے ہاتھوں سے مرغ ذبح کرتے پایا۔ وہ انہیں دیکھ کر ہڑبڑا گیا ''اتنی جلدی آ گئے سرکار!'' اس نے جلدی جلدی خون میں لتھڑے ہوئے ہاتھ دھوئے اور ہاتھوں کو کپڑے سے صاف کر کے ان کے ہاتھ چومے۔

شاہ صاحب نے محسوس کیا کہ وہ انہیں ہمیشہ سے بھی زیادہ تعظیم دے رہا ہے۔ انہیں احساس نہیں تھا کہ اس کے مرید انہیں حیرت سے دیکھ رہے ہیں ''ہاں الٰہی بخش میں نے وعدہ پورا کر دیا ہے لیکن میں زیادہ دیر رکوں گا نہیں۔''

''آئیں تو ... میں آپ کو جلدی نہیں جانے دوں گا۔'' الٰہی بخش انہیں اس گھنے درخت کے نیچے لے گیا جہاں اس کی گدی تھی ''آپ یہاں تشریف رکھیں سرکار۔''

''نہیں ... یہاں نہیں بیٹھوں گا میں، یہ تمہارا مقام ہے۔'' شاہ صاحب نے کہا۔

''میرا مقام تو آپ کے قدموں میں ہے باجی، آپ کو قسم ہے دنیا کے بادشاہ کی بیٹھ جائیں۔''

''یہ مناسب نہیں الٰہی بخش!''

لیکن الٰہی بخش کی ضد کے سامنے انہیں ہتھیار ڈالنے پڑے۔ وہ بیٹھے تو الٰہی بخش نے ان کے پاؤں دبانے شروع کر دیئے۔ اپنے مرشد کو جو شاہ صاحب کے پاؤں دباتے دیکھا تو الٰہی بخش کے کچھ مرید بھی اس سعادت میں شامل ہونے لگے۔ مگر الٰہی بخش نے انہیں ڈپٹ دیا ''یہاں صرف میں باجی کے پاؤں دبا سکتا ہوں، کوئی اور نہیں۔''

تھوڑی دیر بعد الٰہی بخش نے ان سے اجازت چاہی ''سرکار، مجھے کھانا پکانا ہے۔''

شاہ صاحب کو حیرت ہوئی۔ الٰہی بخش کے مرید پہلے ہی کھانا پکانے میں مصروف تھے۔ بہر حال انہوں نے کچھ کہا نہیں۔ بعد میں الٰہی بخش پھر ان کے قدموں میں آ بیٹھا ''باجی ... میرے سرکار، آپ کے لئے دسترخوان بچھا دوں؟''

''الٰہی بخش مجھے بھوک نہیں ہے۔'' شاہ صاحب نے کہا۔

الٰہی بخش ان کے پاؤں دبوانے لگا۔ چند منٹ بعد اس کا ایک مرید اس کے پاس آیا۔ ''لنگر تیار ہے بابا۔''

''ٹھیک ہے تم جاؤ۔ میں آواز دے لوں گا۔''

دس منٹ گزر گئے تو شاہ صاحب نے الٰہی بخش سے کہا ''لنگر کیوں نہیں شروع کراتے الٰہی بخش۔''

''سرکار، آپ بسم اللہ کریں گے تو اس کے بعد ہی لنگر شروع کروں گا۔''

''الٰہی بخش میں تو یہ کھانا نہیں کھا سکتا۔''

الٰہی بخش اپنے دونوں رخسار پیٹنے لگا ''یہ آپ نے کیسے سوچا سرکار کہ میں اتنا گستاخ ہو سکتا ہوں!'' اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا ''میں نے علیحدہ سے ... اور خود اپنے ہاتھوں سے آپ کے لئے کھانا پکایا ہے۔ وہ مرغ میں آپ ہی کے لئے ذبح کر رہا تھا سرکار!''

شاہ فرید کو اس پر بہت پیار آیا۔ وہ پہلے ہی جانتے تھے اور اب پوری طرح سمجھ گئے کہ الٰہی بخش کس طرح کا آدمی ہے۔ اپنے مریدوں کے سامنے کوئی کسی اور کو اپنی گدی پر بٹھا کر اس کے پاؤں دبا سکتا ہے! کسی کے لئے کھانے کا ایسا اہتمام کر سکتا ہے!

رخصت ہوتے وقت شاہ فرید نے الٰہی بخش سے پوچھا ''تم نے ایسا کیوں کیا الٰہی بخش؟''

بات وضاحت طلب تھی لیکن الٰہی بخش سمجھ گیا کہ کہہ رہے ہیں ''آپ کی ذات سے دو فائدے اٹھا رہا ہوں باجی، ایک تو عاقبت سدھار رہا ہوں۔ دوسرے آپ جانتے ہیں کہ مرید ہاتھ چومیں تو مجھ جیسے کمزور اور چھوٹے آدمی کا نفس تو دنبہ بن جاتا ہے۔ میں نفس کے اس موٹے تازے دنبے کو

پینے نہیں دینا چاہتا۔ باجی ..... ایک شعر سناؤں۔''

''سناؤ الٰہی بخش۔''

''سادہ سا شعر ہے باجی، شاعر کہتا ہے۔

امیر اب تک ہوں میں اپنی انا کا
مجھے تو اپنے رستے میں بچھا لے

شاہ فرید کے ہونٹوں پر ستائشی مسکراہٹ ابھری۔

''باجی اب جس گیارھویں کو آپ نہیں آئیں گے، یہاں لنگر نہیں ہوگا۔''

''ایسی شرط نہ لگاؤ الٰہی بخش۔''

الٰہی بخش پھر رخسار پیٹنے لگا''شرط نہیں میرے سرکار یہ دل کی آواز ہے۔''

☆

شاہ فرید کے مکان کے رنگ و روغن کا کام مکمل ہو گیا لیکن جو تعلق قائم ہو گیا تھا، وہ الٰہی بخش کی زندگی میں نہیں ٹوٹا۔ ہر اسلامی ماہ کی دس تاریخ کو الٰہی بخش شاہ صاحب کے پاس آتا۔ سلام اور دست بوسی کرتا، پھر کہتا ''باجی۔''

''مجھے یاد ہے الٰہی بخش کل گیارہ تاریخ ہے۔'' شاہ صاحب اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی کہہ دیتے۔ ''میں یہ تاریخ کبھی نہیں بھولوں گا۔ تم ہر ماہ کیوں تکلیف کرتے ہو۔''

''تکلیف نہیں باجی، یہ میرا فرض ہے۔''

شاہ صاحب جاتے اور شریک ہوتے۔ سب کچھ اسی طرح ہوتا جیسے پہلی بار ہوا تھا۔ اب شاہ صاحب کے بیٹے بھی ضد کر کے ان کے ساتھ آ جاتے تھے۔ انہیں الٰہی بخش سے بڑی انسیت تھی۔ وہ وہاں جا کر بہت خوش ہوتے تھے۔

انہی معمولات میں تین سال گزر گئے۔ ان تین برسوں میں الٰہی بخش کی صحت اور خراب ہو گئی۔ اس کے سوا کچھ بھی نہیں بدلا۔

الٰہی بخش کے دل میں حج بیت اللہ اور روضہ رسول ﷺ پر حاضری کی خواہش شدید سے شدید تر ہوتی گئی تھی۔ لیکن اس نے اس سلسلے میں کبھی بیٹوں سے بھی فرمائش نہیں کی۔ پھر اللہ نے بیٹوں ہی کے دل میں ڈال دی۔ اسی سال انہوں نے مل کر اسے تیس ہزار روپے دیئے کہ وہ حج کر آئے۔

اس سال الٰہی بخش بہت خوش تھا۔ اس کی آرزو پوری ہونے والی تھی۔ وہ دن گن رہا تھا۔

ایک دن وہ پہاڑی پر اپنے پسندیدہ درخت کے نیچے کسی سوچ میں کھویا ہوا تھا کہ ایک شخص اس کے پاس چلا آیا ''بابا ..... پانی والے بابا۔'' اس نے کئی بار پکارا۔

الٰہی بخش نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔ اسے ایک نظر میں اندازہ ہو گیا کہ آنے والا بڑا ضرورت مند ہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے، جنہیں وہ پینے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کا جسم رہ رہ کر لرز رہا تھا۔ ہونٹ بھی کپکپا رہے تھے۔

الٰہی بخش اسے غور سے دیکھتا رہا۔ آنے والا جوان تھا۔ اس کی عمر تیس سے زیادہ نہیں تھی۔

''کیا بات ہے بالکے۔''

''میرے لئے دعا کرو بابا۔''

''مسئلہ کیا ہے؟''

''بابا..... میرا بیٹا ہے چار سال کا۔ ہمیں جان سے بھی پیارا ہے۔ وہ کسی خطرناک بیماری میں مبتلا ہے۔ مجھے تو بیماری کا نام بھی معلوم نہیں ڈاکٹر کہتا ہے، آپریشن پر پچیس ہزار کا خرچہ ہوگا تو وہ انشاء اللہ ٹھیک ہو جائے گا، ورنہ.....'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

''تو پھر۔''

جوان آدمی روتے روتے رکا۔ میرے لئے دعا کرو بابا۔ میں تو مشکل سے سو روپے روز کماتا ہوں۔ گھر کا خرچ بھی پورا نہیں پڑتا۔ زمین یا کوئی ایسی چیز بھی میرے پاس نہیں جسے بیچ کر پچیس ہزار کروں۔ میں کیا کروں بابا۔ اللہ جی سے دعا کرو۔ وہ مجھے پچیس ہزار دیکر میرے بیٹے کو بچالے۔''

الٰہی بخش کو اس پر بے ساختہ پیار آیا۔ اس نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس نے چار سال کے بچے کا تصور کیا، جو دھیرے دھیرے موت کی سرحد کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اللہ کا حکم ہوا اور پچیس ہزار روپے مل جائیں تو وہ بچہ جوان ہوگا، اس کی شادی ہوگی، اس کے بچے ہوں گے.....

''بابا، میرے لئے یہ اکلوتا بیٹا ہی سب کچھ ہے۔ یہ پیدا ہوا تھا تو ڈاکٹر نے کہہ دیا تھا کہ اب ہمارے ہاں اولاد نہیں ہوگی کبھی۔ بابا، میری نسل اسی سے چلنی ہے۔'' جوان آدمی پھر رونے لگا۔

یا اللہ..... اس بچے کو درازی عمر عطا فرما۔ الٰہی بخش کے دل سے آواز اٹھی۔ اسی لمحے اس کے ذہن میں آندھیاں چلنے لگیں۔ پچیس ہزار روپے، آپریشن، بچے کی زندگی، یہ لفظ اس کے ذہن میں گردش کر رہے تھے۔ پھر ایک اور لفظ تقر کنے لگا..... حج..... حج..... حج!

فیصلہ بہت مشکل تھا۔ ایک طرف آگے جانے والے زندگی تھی اور دوسری طرف موت کی طرف بڑھتی ہوئی زندگی کی سب سے بڑی اور آخری آرزو۔ ایک اپنے لئے تھی اور دوسری کسی اور کے لئے۔ اسے باپ کے الفاظ یاد آئے۔ اللہ سے عشق کے لئے اس کے بندوں سے عشق..... اور عشق میں حساب کتاب تو نہیں ہوتا اور حساب کتاب میں بھی ننھا پودا گرنے والے دیمک زدہ بوڑھے درخت سے بھاری ہوتا ہے۔

مشکل سے سہی، الٰہی بخش فیصلے پر پہنچ گیا۔ اس نے سرد آہ بھرتے ہوئے جوان آدمی سے کہا ''مت رو بالکے۔ اللہ بہتر کرے گا۔ لیکن پہلے تجھے میری ایک بات ماننا ہوگی۔''

جوان آدمی اسے پر امید نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''تو یہاں درخت کے نیچے لیٹ کر سونے کی کوشش کر۔ سو گیا تو انشاء اللہ تیرا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ یہ نہ پوچھنا کہ کیسے حل ہوگا۔''

جوان آدمی لیٹ گیا۔ پریشانی میں نیند رات کو بھی نہیں آتی۔ لیکن اس سے الٰہی بخش نے بات ہی ایسی کی تھی کہ وہ پانچ منٹ کے اندر اندر سو گیا۔ الٰہی بخش اٹھا اور اپنے گھر کی طرف چل دیا۔ واپس آیا تو اس کے پاس وہ تیس ہزار روپے تھے جو اس نے حج کے لئے رکھے تھے۔

اس نے جوان آدمی کو جگایا نہیں۔ وہ سو کر اٹھا تو الٰہی بخش نے کہا ''لے بالکے، انشاء اللہ تیرا مسئلہ حل ہوگا۔ میری ہدایت پر عمل کر۔ کھڑا ہو، اور بسم اللہ پڑھ کر سامنے کی طرف چل۔ ہر درخت کی جڑ دیکھتا رہ۔ انشاء اللہ سات درخت پورے ہونے سے پہلے تیرا مسئلہ حل ہو جائے گا۔''

جوان آدمی اٹھ کھڑا ہوا۔

''لیکن یاد رکھ، اس واقعے کا کبھی کسی سے ذکر نہ کرنا اور نہ کسی کو بتانا کہ مجھ سے ملا تھا۔

جوان آدمی بسم اللہ پڑھ کر آگے چل دیا۔ اسے یقین نہیں تھا کہ اسے کچھ ملے گا۔ مگر وہ قطار کے ہر درخت کی جڑ کو غور سے دیکھتا رہا۔ بلکہ وہ جھک کر ٹٹولتا بھی تھا۔ پانچویں درخت پر پہنچ کر ٹٹولنے کی ضرورت نہیں رہی۔ کپڑے کی وہ پوٹلی دور سے ہی نظر آ رہی تھی۔ اس نے بسم اللہ پڑھ کر بے تابانہ پوٹلی اٹھائی اور اسے کھول کر دیکھا۔ اس میں نوٹ ہی نوٹ تھے۔

تیس ہزار روپے!

''جا بالکے، بیٹے کا علاج کرا۔ اللہ اسے زندگی دے۔ اب اس کے صحت مند ہونے تک یہاں نہ آنا۔'' الٰہی بخش نے پکار کر کہا۔

جوان آدمی کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ وہ تیز قدموں سے پہاڑی سے اترنے لگا۔

☆

وقت سست رفتاری سے گزرتا رہا۔ الٰہی بخش کی صحت خراب تر ہوتی گئی۔ لیکن معمولات جاری رہے۔ شاہ فرید سے اس کی عقیدت میں اضافہ ہوتا گیا۔ حج کے دن قریب آ رہے تھے۔ ایک دن مبشر نے کہا "ابا تم نے حج کا کیا کیا؟"

الٰہی بخش سر جھکائے بیٹھا رہا۔

"ابا کیا بات ہے خیر تو ہے۔"

"بیٹے تو سمجھ لے کہ میرا حج ہو گیا۔ اللہ قبول کرنے والا ہے۔" الٰہی بخش نے دبے دبے لہجے میں کہا۔

"میں سمجھا نہیں ابا۔"

"پیسے خرچ ہو گئے بیٹے۔"

"کوئی بات نہیں ابا۔" مبشر نے بلا توقف کہا "اگلے سال سہی ابا، پیسوں کی فکر نہ کرو۔"

الٰہی بخش کا دل شکر سے معمور ہو گیا۔ اللہ نے کیسی سعادت مند اولاد دی ہے اسے۔ اس کا خیال تھا کہ بیٹا اس پر برسے گا۔ تیس ہزار روپے کوئی چھوٹی رقم تو نہیں ہوتی۔ بیٹا پوچھے گا کہ کیا کیا اس رقم کا۔ "دیکھ بیٹے اللہ نے زندگی دی تو اگلے سال سہی کون جانے۔" اس نے آہ بھر کے کہا۔

"اللہ تمہیں ہمارے سر پر سلامت رکھے ابا، دل چھوٹا نہ کرو۔" مبشر نے اسے تسلی دی۔

"ایک بات بتا بیٹے۔" الٰہی بخش نے کہا "تو ناراض تو نہیں مجھ سے۔"

"کیسی باتیں کرتے ہو ابا؟"

"تو نے پوچھا ہی نہیں کہ میں نے وہ رقم کہاں خرچ کر دی۔"

"ابا پہلی بات یہ ہے کہ تمہارے پیسے تھے۔ تمہارا اختیار تھا، جہاں چاہتے خرچ کرتے۔ دوسری بات یہ کہ مجھے معلوم ہے کوئی بڑی، بہت بڑی ضرورت ہو گی، ورنہ تم حج کے پیسے خرچ کرنے والے نہیں ہو۔ اب مجھے تم سے ویسے ہی کچھ پوچھنے کا حق نہیں ہے۔"

"اللہ تجھے خوش رکھے بیٹے، میرے سارے بیٹے اللہ کی مہربانی سے اتنے اچھے ہیں۔ اللہ اجر دینے والا ہے۔"

الٰہی بخش نے کسی کو نہیں بتایا کہ اس نے پیسے کہاں خرچ کیے ہیں۔

ذی الحجہ کا مہینہ شروع ہونے سے چند روز پہلے ہی سے الٰہی بخش کی طبیعت بگڑنے لگی۔ وہ اس حد تک بیمار ہوا کہ بستر سے لگ گیا۔ اسے خیال آیا کہ اس حال میں تو وہ حج کر بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کے اندر ایک طمانیت پھیل گئی۔ جو ہوا تھا، اسی میں بہتری تھی۔ اللہ بہترین رہنمائی فرماتا ہے۔

حاجرہ دن رات اس کی دیکھ بھال میں لگی رہی۔ بیٹے بھی خدمت کر رہے تھے۔ لیکن الٰہی بخش جانتا تھا کہ اس کی حالت مسلسل بگڑ رہی ہے۔ اس نے کسی کو یہ بات بتائی نہیں۔ بقر عید سے دو دن پہلے یہ حال ہو گیا کہ وہ بغیر سہارے چل نہیں سکتا تھا۔

عید کے دن الٰہی بخش بہت مضطرب تھا۔ اصرار کر کے وہ نماز پڑھنے گیا۔ اس نے بیٹھ کر نماز ادا کی۔ گھر پہنچا تو وہ بے حد نڈھال تھا۔ کچھ دیر وہ لیٹا رہا پھر اچانک وہ اٹھ بیٹھا۔ اسے خیال ہی ایسا آیا تھا۔

وہ اٹھ ہی رہا تھا کہ جزل نے اسے تھام لیا "کیا کام ہے ابا مجھ سے کہو۔"

"کام ایسا ہے بیٹے کہ خود ہی کرنا ہے۔" الٰہی بخش اتنا کہتے کہتے ہانپ گیا "مجھے شاہ صاحب سے ملنے جانا ہے بیٹے۔ ڈیرے دی وڈھ۔"

"وہ تو بہت دور ہے ابا، میں انہیں بلا لاتا ہوں۔"

الٰہی بخش کا ہاتھ اٹھا لیکن اس نے خود کو روک لیا "نہیں بیٹے، میں گستاخی نہیں کر سکتا۔ تو نے ایسا سوچا کیسے۔"

"ابا... تمہاری حالت ایسی ہے..."

"میں جا سکتا ہوں اور جاؤں گا۔ تو مجھے لے چل بیٹے۔" الٰہی بخش گڑگڑانے لگا۔

مزمل نے سوالیہ نظروں سے ماں کو دیکھا۔عمر بھر اطاعت کرنے والی حاجرہ نے اثبات میں سر ہلایا۔وہ انکار کیسے کر سکتی تھی۔

''ٹھیک ہے ابا، میں گاڑی لے آتا ہوں۔''

''بیٹے مجھے پیدل جانا ہے۔''

بادل ناخواستہ مزمل اسے سہارا دے کر باہر لے آیا۔الٰہی بخش کو ہر چند قدم کے بعد رکنا پڑتا تھا۔ ہر بار وہ رکتا تو بیٹے کے چہرے غور سے دیکھتا لیکن سعادت مند بیٹے کی پیشانی پر کوئی شکن اور چہرے پر تکدر کا کوئی سایہ نظر نہیں آیا۔

دھوپ چڑھ رہی تھی۔انہوں نے آدھے سے کچھ زیادہ فاصلہ طے کیا ہوگا کہ سامنے سے فرید شاہ آتے نظر آئے۔وہ الٰہی بخش اور مزمل سے عید ملے۔

''آپ کہاں جا رہے ہیں باجی سرکار؟'' الٰہی بخش نے ہانپتے ہوئے کہا۔

''تمہاری ہی طرف جا رہا تھا الٰہی بخش۔پتا چلا تھا تم بیمار ہو۔''

الٰہی بخش کا جسم لرزنے لگا ''مجھے گناہ گار کر رہے تھے باجی!'' اس کے لہجے میں شکایت تھی۔

''کیسی باتیں کرتے ہو۔اس حال میں میرے پاس آ کر تم مجھے گناہ گار کر رہے تھے۔کیا میں تم سے ملنے نہیں آ سکتا۔''

''میری زندگی میں تو یہ ممکن نہیں سرکار!''

''اب کیا ارادہ ہے؟''

''آپ کے ساتھ آپ کے گھر چلوں گا باجی۔''

شاہ فرید نے محبت سے اس کا ہاتھ تھام لیا ''بہت ضد کرتے ہو۔چلو، میں تمہیں لے کر چلوں گا۔''

الٰہی بخش اچانک تن کر سیدھا ہو گیا اور جیسے جسم میں نئی روح دوڑ گئی ہو ''آپ میرا ہاتھ تھام کر مجھے سہارا دے رہے ہیں باجی۔''

''ہاں یہ میرا حق بھی اور میرا فرض بھی۔''

الٰہی بخش مزمل کی طرف مڑا ''بیٹے تو گھر چلا جا۔اب مجھے تیرے سہارے کی ضرورت نہیں۔'' اس کے لہجے میں توانائی تھی ''دو گھنٹے بعد تو مجھے لینے کے لئے آ جانا۔''

''اس کی ضرورت نہیں۔'' شاہ فرید نے کہا۔ ''میں الٰہی بخش کو خود لے آؤں گا۔''

مزمل نہ چاہتے ہوئے بھی واپس چلا گیا۔شاہ فرید، الٰہی بخش کو سہارا دے کر اپنے گھر تک لائے۔انہوں نے پلنگ پر بٹھایا اور تواضع کی لیکن ان کے اصرار کے باوجود الٰہی بخش لیٹنے کو تیار نہیں ہوا۔

''باجی کل گیارہ تاریخ ہے۔''

''مجھے یاد ہے الٰہی بخش۔ہمیشہ یاد رہتا ہے۔'' شاہ فرید نے ہمیشہ کی طرح کہا۔

''پھر بھی باجی، میرا تو فرض ہے کہ دعوت دینے آؤں۔''

''ایک بات بتاؤں الٰہی بخش۔'' شاہ صاحب نے کہا۔ ''مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے۔''

الٰہی بخش نے گہری سانس لی۔ ''زندگی کام آ گئی سرکار، موت آسان ہو گئی۔'' اس نے کہا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔دیر تک روتا رہا۔ ہچکیاں بندھ گئیں۔ ''میں اس قابل نہیں تھا کہ باجی سرکار، بس اللہ کی دین ہے۔اس کا کرم ہے۔اب مجھے زندگی سے کچھ نہیں چاہیے۔''

سجاد حسین نے اسے پانی لا کر دیا۔پانی پی کر اس کی طبیعت ذرا سنبھلی۔وہ دیر تک شاہ صاحب کی باتیں سنتا رہا۔خود وہ بہت کم بولا اور اس نے ایک سیکنڈ کے لئے بھی پیٹھ نہیں لگائی۔شام ہوئی تو شاہ صاحب نے کہا ''الٰہی بخش اب کہو تو میں تمہیں گھر لے چلوں۔''

الٰہی بخش اٹھ گیا۔ رخصت ہوتے وقت اس نے شاہ صاحب کے بیٹوں کے ہاتھ بڑی بے تابی سے چومے۔ باہر نکلتے ہوئے اس نے دیوار کو بڑی محبت سے چھوا۔ اس کے ہونٹ یوں ہل رہے تھے جیسے وہ دیوار سے کچھ کہہ رہا ہو۔ دیوار پر رنگ اس کا تھا۔

باہر نکلا تو وہ جھکا اور اس نے دروازے کی چوکھٹ کو چھوا۔ اس کے ہونٹ پھر ہلے

راستے میں اس نے شاہ صاحب سے کہا "ایک بات میں بھی کہوں باجی۔"

"کہو الٰہی بخش!"

"اب شاید میں یہاں کبھی نہ آؤں۔ اصل میں میں آپ کو آخری سلام کرنے آیا تھا۔"

"اللہ تمہیں بہت عمر دے الٰہی بخش، ایسی باتیں نہیں سوچتے۔"

الٰہی بخش نے کچھ نہیں کہا۔ اپنے گھر پہنچ کر اس نے کہا "باجی۔ میرے گھر میں نہیں آئیں گے۔"

"کیوں نہیں۔"

الٰہی بخش کی آواز توانا ہو گئی۔ وہ چیخ چیخ کر حاجرہ اور بیٹوں کو ہدایت دیتا رہا کہ وہ شاہ صاحب کی تواضع کریں۔ شاہ صاحب نے بھی اس روز تعرض نہیں کیا۔ ان کے جانے کے بعد الٰہی بخش اچانک نڈھال ہو گیا۔ رات ہوتے ہوتے اس کی طبیعت بہت بگڑ گئی۔ بیٹے ڈاکٹر کو بلانے پر مصر تھے لیکن اس نے انہیں روک دیا "کل تک میں ٹھیک نہ ہوا تو ڈاکٹر کو بلا لینا۔" اس نے کہا۔ "اب تم لوگ میرے پاس بیٹھو۔"

حاجرہ اس کے پاؤں دبانے لگی۔ مبشر سر سہلا رہا تھا اور مدثر اور مزمل اس کے ہاتھ سہلا رہے تھے۔

"دیکھو کوئی قیامت تک نہیں جیتا۔ کوئی ساری عمر اپنوں کے ساتھ نہیں رہتا۔" اس نے کہا۔ "میری باتیں غور سے سنو ......اور یاد رکھنا۔"

حاجرہ چپکے چپکے رونے لگی۔

"دیکھو لوگ مجھے پہاڑی پر دفن کرنا چاہیں گے، ایسا نہ ہونے دینا۔ مجھے گاؤں کے قبرستان میں دفن کرنا۔" وہ بیوی اور بیٹوں کی کیفیت سے بے نیاز کہتا رہا "میرا پیغام سب کو دے دینا کہ میری قبر پر صرف فاتحہ پڑھیں۔ اسے مزار نہ بنائیں۔ شرک نہ کریں، میں کسی قابل نہیں تھا، صرف دل آزاری سے بچنے کے لئے جھوٹا پیر بن گیا تھا۔ اور میرے بیٹو، یہ لنگر کا سلسلہ بھی بند کر دینا۔ اور تم تمہیں جو میں ہمیشہ سمجھاتا رہا ہوں وہی کرنا، لوگوں کی عزت لوگوں سے محبت، سادات کا احترام، اور ہاں، میرے ہر معاملے میں باجی سے مشورہ کرنا۔ تم سب بھی میری کوتاہیاں معاف کر دینا اور دوسروں سے بھی کہنا کہ میں نے سب سے معافی مانگی ہے۔ مجھے معاف کر دیں۔ میری مغفرت کے لئے دعا کرتے رہنا اور دوسروں سے بھی کرانا۔"

وہ کہتے کہتے چپ ہو گیا۔ دیر تک چپ رہا۔ مبشر نے دیکھا۔ وہ سو گیا تھا۔ اس نے اشارے سے دوسروں کو بتایا۔ تینوں بھائی دبے قدموں وہاں سے ہٹ آئے۔ صرف حاجرہ اس کے پاؤں دباتی رہی۔ پاؤں دبتے دباتے وہ خود بھی سو گئی۔

صبح وہ جاگی تو الٰہی بخش اس وقت بھی سو رہا تھا۔ اس نے اٹھ کر اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ بہت پرسکون اور صحت مند لگ رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی خوب صورت مسکراہٹ تھی، جیسے کوئی بہت حسین خواب دیکھ رہا ہو۔

حاجرہ کو احساس ہوا کہ وہ بے حس و حرکت ہے۔ اس نے اسکی پیشانی کو چھو کر دیکھا۔ وہ برف سے ٹھنڈی ہو رہی تھی۔ پنچھی پنجرہ توڑ کر اڑ چکا تھا۔

وہ ذی الحجہ کی گیارہ تاریخ تھی لیکن اس روز لنگر نہیں ہوا۔ مرید آئے تو اسی لئے تھے لیکن اس روز انہیں بس مرشد کو کندھا دینا تھا۔ جنازے میں ایک ایسا جوان شخص بھی تھا جو رو رہا تھا اور چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا ۔۔ بابا ۔۔ پانی والے بابا ۔۔ میرا بچہ ٹھیک ہو گیا ہے بابا ۔۔!

ہانڈہ ونگ کے جلاہے الٰہی بخش کی کہانی ختم ہو چکی تھی۔ الٰہی بخش کی کہانی، جس کا خمیر ہی عشق سے اٹھا تھا!

☆

لیکن الٰہی بخش کی کہانی اب بھی ختم نہیں ہوئی تھی!

چوتھے دن تینوں بیٹوں نے ماں کے سامنے وہ بکس کھولا جسے الٰہی بخش بہت عزیز رکھتا تھا۔ کسی کو چھونے نہیں دیتا تھا۔ بکس کھلنے کے بعد وہ سب حیران کھڑے تھے۔ بکس میں زیادہ چیزیں نہیں تھیں۔ سب سے اوپر ایک پھول دار کاغذ اور ایک چھوٹا سا کارڈ تھا۔ کارڈ پر بہت خوبصورت تحریر میں لکھا تھا۔ ''الٰہی بخش کے لئے سالگرہ کی دلی مبارکباد اور نیک خواہشات اور خلوص و محبت کے ساتھ۔ سادی''

پھول دار کاغذ کے نیچے پیکٹ تھا۔ مزمل نے پیکٹ کو کھولا تو گتے کی پیکنگ نمودار ہوئی۔ پیکنگ میں سے ہلکے نیلے رنگ کی خوبصورت شیشی نکلی، جس میں زرد سیال بھرا ہوا تھا۔ یقیناً وہ کوئی خوشبو تھی۔ ..... باہر کی خوشبو۔

مزمل نے بلا ارادہ اسپرے کیا۔ خوشبو کی پھوار نکلی اور خوشبو ہر طرف پھیلنے لگی۔ وہ بہت پیاری خوشبو تھی۔

دونوں بھائیوں نے چونک کر دیکھا تو مزمل کھسیا گیا۔ مگر خوشبو پر اس کا اختیار نہیں تھا۔ وہ تو اب پھیل رہی تھی۔

''یہ کیا ہے؟'' حاجرہ نے مدثر سے پوچھا۔

''خوشبو ہے اماں، ابا کے کسی دوست نے کبھی انہیں تحفہ دیا تھا۔''

تینوں بھائیوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں طے کیا کہ وہ ماں کو حقیقت کبھی نہیں بتائیں گے۔ تینوں اپنی اپنی جگہ سادی کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ کیسا عجیب نام ہے ..... سادی! اس سادی سے ابا کا کیا تعلق ہوگا۔ یہ کب کی بات ہے۔ کہاں کی بات ہے..... ؟

خوشبو کے نیچے ایک پینٹ اور شرٹ تھی۔ جوتے تھے جس میں جرابیں تھیں۔ کپڑے بالکل نئے لگ رہے تھے۔ الٰہی بخش نے ہمیشہ اس بکس کا بہت خیال رکھا تھا۔ باقاعدگی سے فنائل کی گولیاں ڈالا کرتا تھا۔

سب حیرت سے ان چیزوں کو دیکھتے رہے۔ یہ طے تھا کہ کپڑے ایک بار بھی نہیں دھلے تھے۔ بیٹے سوچ رہے تھے ..... ابا نے یہ کپڑے پہنے ہوں گے۔ جانے کیا عمر ہوگی اس وقت ان کی ..... کیسے لگ رہے ہوں گے انہیں پہن کر۔ وہ تصور میں باپ کو یہ کپڑے پہنے دیکھنے لگے۔

حاجرہ بھی سب کچھ دیکھ اور سوچ رہی تھی۔

وہ سب وقت کے طلسم کے اسیر تھے۔ وقت ہی اس طلسم کو توڑ سکتا تھا اور وقت نے ہی توڑا۔

دروازے پر دستک نے ان سب کو چونکا دیا۔ مدثر نے کہا ''میں دیکھتا ہوں۔''

اس نے جا کر دروازہ کھولا۔ سامنے ایک موٹر سائیکل کھڑی تھی۔ موٹر سائیکل سوار وردی پہنے ہوئے تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پیکٹ تھا ''الٰہی بخش صاحب یہیں رہتے ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''جی..... کیا بات ہے؟''

''یہ پیکٹ ہے ان کے نام۔''

''کہاں سے آیا ہے؟''

''کراچی سے آیا ہے؟''

''کراچی سے، آپ الٰہی بخش صاحب کو بلا دیں۔''

''وہ تو نہیں آسکتے۔'' مدثر نے اداسی سے کہا۔

''تو ان سے رسید پر دستخط کرا دیں۔''

''تین دن پہلے ابا کا انتقال ہو چکا ہے۔''

کوریئر کو شاک لگا۔ وہ وہیں دعا کے لئے بیٹھ گیا۔ پھر اس نے کہا ''مجھے بہت افسوس ہے جناب، آپ اس رسید پر دستخط کر دیں۔''

مدثر نے دستخط کئے اور پیکٹ لے کر گھر میں آ گیا۔

گھر میں اس پر بحث شروع ہوئی کہ پیکٹ کھولا جائے یا نہیں۔ پیکٹ پر بھیجنے والے کا پتا موجود تھا۔ وہ آفتاب نامی کسی ایڈووکیٹ نے بھیجا تھا۔ ان میں سے کوئی بھی اسے نہیں جانتا تھا۔ آخر مزمل نے کہا۔ ''ابا نے کہا تھا میرے معاملے میں باجی سے مشورہ کرنا۔ ہمیں یہ پیکٹ لے کر باجی کے ہاں چلنا چاہئے۔''

اس پر دوسرے دونوں بھائی بھی متفق ہو گئے۔ حاجرہ کو تو کسی معاملے سے دلچسپی نہیں تھی۔ وہ بس گم صم بیٹھی تھی۔

تینوں بھائی پیکٹ لے کر شاہ فرید کے گھر پہنچے۔ شاہ صاحب نے انہیں عزت سے بٹھایا۔ ''کیا بات ہے بالکو؟''

''باجی ابا کے نام یہ پیکٹ آیا ہے۔ ہمیں اسے کھولنا چاہئے یا نہیں۔ ہم یہ آپ کے پاس لے آئے ہیں۔'' مدثر نے کہا اور پیکٹ شاہ صاحب کی طرف بڑھا دیا۔

شاہ صاحب نے پیکٹ لے لیا۔ ان کے کانوں میں الٰہی بخش کی کہی ایک بات گونج گئی۔ اس نے کہا تھا میں اپنے بچوں کو اپنے بارے میں سب کچھ بتانا چاہتا ہوں۔ کچھ چھپانا نہیں چاہتا ان سے لیکن مجھے بتانا نہیں آتا کیسے بتاؤں۔

شاہ صاحب نے سوچا ممکن ہے، یہ پیکٹ ہی بچوں کو باپ کے بارے میں کچھ بتانے والا ہو ''تم لوگ اسے کھول لو۔'' انہوں نے کہا۔

''باجی آپ ہی کھول کر دیکھ لیں۔ پھر فیصلہ بھی آپ ہی کریں گے کہ اس کا کیا کیا جائے۔ ابا نے ہمیں یہی ہدایت کی تھی۔'' مبشر نے کہا۔

شاہ فرید نے بڑی احتیاط سے لفافہ چاک کیا۔ اندر سے ایک خط اور ایک اور لفافہ نکلا۔ انہوں نے خط پڑھا۔

الٰہی صاحب،

آپ کو حیرت ہو گی کیونکہ آپ مجھ سے واقف نہیں۔ میں بھی آپ سے واقف نہیں ہوں۔ میں اپنا تعارف کرا دوں، میرا نام آفتاب حسین ہے اور میں وکیل ہوں۔ گزشتہ بیس سال سے میں اپنی موکلہ محترمہ سعدیہ بیگم کے مالی اور کاروباری امور کا نگراں ہوں۔ کوئی چھ ماہ پہلے بیگم صاحبہ نے مجھے طلب کر کے ایک خط اور آپ کا پتہ دیا تھا اور ہدایت کی تھی کہ ان کی موت کے بعد میں یہ خط آپ کو پوسٹ کر دوں۔

آپ کو یہ جان کر دکھ ہو گا کہ ابھی چند روز پہلے دس ذی الحجہ کو شام چھ بجے محترمہ سعدیہ بیگم کا انتقال ہو گیا۔ ان کی ہدایت کے مطابق آپ کی یہ امانت کوریئر سروس کے ذریعے آپ کو ارسال کر رہا ہوں۔

کارِ لائقہ سے یاد فرمائیے گا۔ والسلام۔

خلوص کیش۔

آفتاب حسین ایڈووکیٹ۔

شاہ فرید خط پڑھنے کے بعد چند لمحے سوچ میں ڈوبے رہے۔ پھر انہوں نے خط مدثر کی طرف بڑھا دیا۔ تینوں بھائیوں نے مل کر وہ خط پڑھا اور شاہ صاحب کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''میرا خیال ہے، یہ ذاتی نوعیت کا خط ہے۔ تمہیں یہ خط پڑھ لینا چاہئے۔'' شاہ صاحب نے کہا۔

تینوں لڑکوں نے نفی میں سر ہلایا۔

''الٰہی بخش تمہارے سامنے اپنی پوری زندگی کھول کر رکھنا چاہتا تھا۔ یہ بات اس نے خود مجھ سے کہی تھی۔ لیکن وہ بے بسی محسوس کرتا تھا، کچھ بتا نہ سکا۔ شاید یہ تمہارے لئے موقع ہے کہ تم اپنے باپ کو جان سکو۔ اسے سمجھ سکو۔ یہ خط کھول لو۔ تمہیں یہ حق حاصل ہے۔'' شاہ صاحب نے کہا۔

تینوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ تینوں متفق تھے۔ مدثر نے کہا ''باجی، اپنے معاملات کے لئے ابا نے آپ کو نامزد کیا تھا۔ آپ یہ خط کھول لیں اور پڑھ لیں۔ پھر مناسب سمجھیں تو ہمیں بھی پڑھنے کی اجازت دے دیں۔''

شاہ فرید چند لمحے ہچکچائے پھر انہوں نے دوسرا لفافہ چاک کیا اور خط نکال لیا۔ ان کے ہاتھوں میں لرزش تھی اور دل کانپ رہا تھا۔ وہ مرنے والے کی ذاتی زندگی میں داخل ہونے والے تھے۔ کون جانے، اس میں کیسے کیسے راز ہوں۔
چھلکتی آنکھوں سے انہوں نے خط پڑھنا شروع کیا۔

☆

عزیز دوست

السلام علیکم

مجھے بھول گئے ہو۔ عرصہ بھی تو اتنا بیت گیا۔ تیسری دہائی گزری جا رہی ہے۔ درمیان میں کئی بار تمہیں خط لکھنے کو جی چاہا لیکن سوچا کہ وہ مقصد ہی فوت ہو جائے گا جس کے لئے اتنی اذیت سہی ہے، حالانکہ جانتی تھی کہ وہ مقصد کبھی پورا نہیں ہوا۔

یہ خط تمہیں ملے گا تو میں اس دنیا میں نہیں ہوں گی۔ شرم آتی تھی، اسی لئے یہ شرط رکھی کہ یہ خط میرے مرنے کے بعد تمہیں پوسٹ کیا جائے۔ میری ایک بہت بڑی غرض تم سے وابستہ ہے۔ وہ غرض نہ ہوتی تو شاید اب بھی تمہیں خط نہ لکھتی۔ اس غرض کے لئے ہی یہ ضروری تھا کہ تمہیں سب کچھ بتاؤں تاکہ تم میری غرض پوری کر سکو۔

اس خط میں کچھ اعترافات ہیں اور کچھ انکشافات۔ اس یقین کے ساتھ پڑھنا کہ ایک ایک لفظ سچ ہے کوئی مرنے والا جھوٹ نہیں بولتا۔ میں بھی سب کچھ سچ لکھ رہی ہوں۔ بے حجاب ہو کر لکھ رہی ہوں۔ برا لگے تو مجبور سمجھ کر مجھے معاف کر دینا لیکن میری غرض پوری کر دینا۔

میں اس دوپہر کو کبھی نہیں بھولی جب طارق روڈ کے فٹ پاتھ پر بیٹھے ہوئے ایک رنگ ساز کو میں نے پہلی بار دیکھا تھا۔ آج میں اعتراف کر رہی ہوں کہ مجھے پہلی ہی نظر میں تم سے محبت ہو گئی تھی۔

میں اس وقت بہت کم عمر تھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ مقام اور مرتبے کا فرق کتنا بڑا ہوتا ہے۔ پھر بھی میں نے اس محبت کی نفی کی، اس کا مذاق اڑایا۔ میں اس طرف نہیں گئی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ بات آگے بڑھے۔ اس کے باوجود مجھ سے نہیں رہا گیا۔ میں ایک بار اور گئی اور تمہیں دیکھا۔ یوں کہ تمہیں بھی پتا نہیں چلا ہوگا۔

پھر قسمت تمہیں میرے گھر محسن بنا کر لے آئی۔ تم نے میرے چھوٹے بھائی کی جان بچائی تھی۔ اللہ جنت نصیب فرمائے، میرے پاپا بہت اچھے انسان تھے۔ محسنوں کی عزت کرتے تھے۔ انہوں نے تمہیں پرکھا اور پھر میرا ہی ڈرائیور بنا دیا۔ اب میں کیا کرتی۔ فیصلہ کرنے والے نے فیصلہ کر دیا تھا کہ مجھے تم سے محبت کرنی ہے۔

میں پہلی ہی نظر سے جانتی تھی کہ تم بھی پہلی ہی نظر میں مجھ سے محبت کرنے لگے ہو۔ تم مجھے کالج لے جاتے اور لانے لگے تو میری آنکھیں خواب دیکھنے لگیں۔ میں اپنی عمر سے بڑی اور سمجھدار ہو گئی۔ میں نے سوچا تمہیں ڈرائیوری چھوڑ کر دفتری کام کی طرف راغب کروں گی۔ پاپا اس سلسلے میں بخوشی کام آتے۔ تم مزید تعلیم حاصل کرتے اور شاید کسی دن تمہارے پاس وہ سب کچھ ہوتا جو پاپا کے پاس تھا۔ میں نے اللہ کی نوازشات دیکھی ہیں۔ میرے پاپا بھی غربت ہی سے یہاں تک پہنچے تھے۔ تو یہ سب کچھ سوچا تھا میں نے!

لیکن اس سلسلے میں تم سے ہونے والی گفتگو نے میری آنکھیں کھول دیں۔ مجھے پتا چل گیا کہ حقیقت پسندی کیا ہے اور اس کے کیا تقاضے ہیں۔ تم جو تھے وہی رہنا چاہتے تھے۔ اب میں سوچتی ہوں کہ یہ درست ہے۔ آدمی کو وہی رہنا چاہئے جو وہ ہے۔ تم میری خاطر سمجھوتے تو نہیں کر سکتے تھے۔ تمہیں مجھ سے محبت تھی تو اس لئے کہ تم اس محبت پر مجبور تھے۔ پھر میری سمجھ میں یہ بات آ گئی کہ تم نے مجھے پانے کا کبھی سوچا بھی نہیں۔ تم مجھے پانا ہی نہیں چاہتے۔ تمہاری محبت بے غرض اور بہت بلند ہے۔

یاد ہے، تم نے مجھ سے کہا تھا، نیچے سے اوپر جانا مشکل ہے۔ ہاں اوپر سے نیچے آنا آسان ہے۔ اور یہ بھی کہ کیا اوپر ہے اور کیا نیچے، یہ تو اپنا اپنا نقطہ نظر ہے۔ میں تمہاری خاطر سمجھوتے کر سکتی تھی نیچے آسکتی تھی۔ میں بانڈہ بننگ میں دال چاول چنتے چارہ بناتے، اپلے تھاپتے زندگی گزار سکتی تھی لیکن عزت جاتی رہتی۔ میں بغاوت کرتی تو والدین کی عزت بھی جاتی اور میں تمہارے گھر میں بھی عزت کی مستحق نہ ہوتی۔

میں اعتراف کر رہی ہوں کہ محبت تو مجھے ہو گئی تھی۔ لیکن محبت کیسے کی جانی چاہئے، یہ میں نے تم سے سیکھا۔ مگر میرے اور تمہارے انداز میں ایک بڑا فرق تھا۔ تم محبت کئے جاتے تھے لیکن تمہیں میرے جذبات اور محسوسات سے کوئی غرض نہیں تھی۔ محبت مجھ پر کیسے اثر انداز ہوگی، یہ تم نے کبھی سوچا بھی نہیں جبکہ مجھے تمہاری فکر تھی۔ میں نے یہ محسوس کیا کہ شہر اور شہر کے لوگوں، بالخصوص خواتین کے بارے میں تمہارے نظریات اور طرح کے ہیں۔ تمہارے خیال میں وہاں حیا اور آبرو کی کوئی اہمیت نہیں۔ یہ غلط تھا اور غلط ہے، میں تمہیں سمجھا سکتی تھی لیکن نہیں، مجھے تو تمہارے نظریات کی اس خامی سے فائدہ اٹھانا تھا۔

چنانچہ میں نے تمہارے لئے شاہد کا ہوا تخلیق کر ڈالا۔ میری سوچ یہ تھی کہ یا تو تم رقابت میں مبتلا ہو کر میرے تجویز کردہ سمجھوتے کو قبول کر لوگے یا پھر مجھے برا سمجھ کر میری محبت چھوڑ دو گے اور نفرت کرنے لگو گے۔ اب سوچتی ہوں کہ میرا سوچنے کا انداز بچکانہ تھا۔ دونوں میں سے ایک بات بھی نہ ہوئی۔ ہاں شاید شہر اور شہریوں کے بارے میں تمہارا نظریہ اور پختہ ہو گیا۔

میں اس کے بعد پیچھے نہیں ہٹ سکتی تھی اور نہیں ہٹی۔ یونیورسٹی میں میں ہر روز تمہارے لئے اپنی آوارگی کے ثبوت فراہم کرتی رہی۔ لیکن تمہارا کچھ نہیں بگڑا، البتہ عشق کا مفہوم مجھ پر واضح ہوتا چلا گیا۔

میں نے کئی بار سوچا کہ پاپا سے بات کروں۔ میں جانتی تھی کہ پاپا دشواری سے سہی، میری بات سمجھ اور مان لیں گے، اس لئے کہ ان کے لئے میری خوشی اہم تھی۔ لیکن مسئلہ امی کا تھا۔ امی ابتدا ہی سے چڑتی تھیں اور ان کا چڑنا بے سبب بھی نہیں تھا۔ بیٹی کو ماں سے زیادہ کوئی نہیں سمجھتا۔ ماں، بیٹی کی ہر نظر، ہر لہجہ اور ہر خواہش پہچانتی ہے۔ ہمارے درمیان کبھی اس موضوع پر اشارتاً بھی بات نہیں ہوئی۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ امی نے مجھے پہلی ہی نظر میں پہچان لیا تھا۔ اسی دن جب میں نے طارق روڈ پر پہلی بار تمہیں دیکھا تھا، امی میرے ساتھ تھیں۔ شاید امی نے تبھی سمجھ لیا تھا اور پھر تم ہمارے گھر آ گئے اور میرا تمہارا ساتھ رہنے لگا۔ امی کھل کر کچھ کہہ نہیں سکتی تھیں۔ تو وہ تم سے نفرت کے سوا اور کیا کرتیں۔

تم نہیں جانتے الٰہی بخش کہ میں نے کتنی کرب ناک راتیں نیند سے محروم گزاری ہیں۔ آدمی اچھا ہو اور خود کو بدترین ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہو تو وہ کیسے کرب سے دوچار ہو سکتا ہے۔ پھر اس کا نتیجہ بھی کچھ نہیں نکل رہا تھا۔ میری صحت تباہ ہونے لگی۔

پھر وہ واقعہ پیش آ گیا۔ جب امی نے تم پر چوری کا الزام لگایا۔ اس روز میرے غم و غصے کی کوئی حد نہیں تھی۔ لیکن میں چھوٹی تھی۔ امی کا کچھ بگاڑ نہیں سکتی تھی۔ میں جانتی تھی کہ تم کتنے سچے اور خوددار آدمی ہو۔ مجھے یقین تھا کہ تم ملازمت چھوڑ دو گے۔ لیکن پھر مجھے اندازہ ہوا کہ تمہارا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ میں نے سمجھ لیا کہ تم مجھ سے یونہی بے لوث محبت کرتے، میری خدمت کرتے پوری زندگی بھی گزار سکتے۔ یعنی ضائع کر سکتے ہو۔ اور اتنا اچھا آدمی ایسے انجام کا مستحق نہیں ہوتا۔ پھر مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ امی اب روز کسی نہ کسی بہانے تمہیں ذلیل کریں گی اور تم میری محبت کی خاطر اسے سہہ لو گے۔ سہتے سہتے عزت نفس سے محروم ہو جاؤ گے۔ تمہاری خوب صورت روح کچلی جائے گی، یہ مجھے گوارا نہیں تھا۔ میں تمہیں ویسا ہی خوب صورت، پھلتا پھولتا اور کامیاب انسان دیکھنا چاہتی تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اب تمہارے جانے کا وقت آ گیا ہے۔ وہ بہت تکلیف دہ فیصلہ تھا اور وہ نتیجہ حاصل کرنے کا جو طریقہ میں نے اپنایا، وہ اور زیادہ اذیت ناک تھا۔ اس روز میں نے خود کو تمہارے سامنے بالکل گرا لیا۔ خود کو ذلیل کر لیا میں نے۔ مگر مجھے طمانیت یہ تھی کہ اب تم مجھ سے محبت ترک کر دو گے۔ گھر جاؤ گے، شادی کرو گے اور اچھی زندگی گزارو گے۔ اپنی اولاد کی تربیت اچھی طرح کرو گے۔

میری اس حرکت نے تمہیں جانے پر مجبور کر دیا۔ تم جا رہے تھے تو میں تمہیں کھڑکی سے دیکھ رہی تھی۔ میری آنکھیں برس رہی تھیں لیکن دل میں

اذیت میں لپٹی ایک خوشی تھی کہ میں تمہارے کام آئی۔ میں نے محبت کا حق ادا کر دیا۔

صبح پاپا اور امی کو پتا چلا کہ تم چلے گئے ہو۔ پاپا نے کہا۔ کیوں۔ میں نے تو اس سے معافی مانگی تھی اور اس نے کہا ہی نہیں تھا کہ وہ جا رہا ہے۔ وہ ایسے بغیر بتائے جانے والا تو نہیں۔ پاپا کی بات ٹھیک تھی۔ وجہ میں جانتی تھی لیکن بتا نہیں سکتی تھی۔ میں نے امی سے کہا۔ پورا گھر چیک کریں، کہیں وہ کچھ چرا کر تو نہیں لے گیا۔ امی نے کچھ نہیں کہا۔ وہ شرمندہ ہو کر رہ گئیں۔

پاپا کو تم سے کتنی انسیت تھی اس کا تم اندازہ نہیں کر سکتے۔ میرے لئے کبھی کوئی ڈرائیور نہیں رکھا گیا۔ بلکہ پاپا نے میری وہ کار ہی فروخت کر دی۔ تمہارے اس کوارٹر میں بھی کوئی نہیں رہا۔

میں اگلے ہی روز تمہارے کوارٹر میں گئی۔ مجھے امید تھی کہ نفرت کی وجہ سے تم میری دی ہوئی چیزیں چھوڑ گئے ہو گے۔ لیکن وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ سوائے ایک پرانی قمیص کے۔ مجھے مایوسی ہوئی لیکن میں نے سوچا، میں نے حرکتیں ہی ایسی کی ہیں کہ تھوڑے دنوں میں تم مجھے بھلا کر نئی زندگی شروع کر دو گے۔ تمہاری پرانی قمیص، میں اپنے ساتھ لے آئی کہ اس میں تمہاری خوشبو بسی تھی۔ وہ قمیص آج بھی میرے پاس موجود ہے۔ وقت گزرتا گیا۔ تعلیم مکمل کر کے میں نے پاپا کے کاروبار میں دلچسپی لی۔ سب کچھ سنبھالنے لگی۔ پھر یکے بعد دیگرے پاپا اور امی مجھے چھوڑ گئے۔ اظہر شادی کر کے علیحدہ ہو گیا۔ میں اکیلی رہ گئی۔ لیکن میں بہت خوش تھی۔

میں اکثر تمہارے کوارٹر میں چلی جاتی۔ کبھی کبھی گھنٹوں وہاں بیٹھی رہتی۔ ملازمہ ہر روز کوارٹر کی صفائی کرتی تھی۔ شام کو وہاں روشنی کر دی جاتی۔ وہاں میں نے کبھی اندھیرا نہیں رہنے دیا۔ اس کوارٹر کو میں نے کبھی غیر آباد نہیں رہنے دیا۔

میں خوش تھی کہ تم شہری بدکردار اور آوارہ ساری کو بھول گئے ہو۔ مگر پھر میری یہ غلط فہمی دور ہو گئی۔ ایک رات میری آنکھ کھلی اور مجھے احساس ہوا کہ تم مجھے یاد کر رہے ہو۔ میں تمہارے سامنے بیٹھی ہوں۔ اس کے بعد ہر رات پچھلے پہر یہی ہونے لگا۔ میری آنکھ کھلتی اور میں تمہارے کوارٹر میں چلی جاتی۔ تم سے باتیں کرتے کرتے وہیں سو جاتی۔

اب سے کوئی تین ساڑھے تین سال پہلے مجھے صاف لگا کہ یہ ناتا ٹوٹ گیا ہے۔ پھر مجھے کبھی تمہاری یاد نہیں آئی۔ مجھے کبھی کسی نے نہیں جگایا۔ وہ بڑی محرومی تھی لیکن نجانے کیوں مجھے یہ اطمینان تھا کہ تم مجھ سے خفا نہیں ہو۔ تب میں مطالعے کی طرف راغب ہو گئی۔ یوں ایک دن بڑا مسئلہ حل ہو گیا۔ تمہیں یاد ہے، سہیلی بدرش کے وہ شعر ہماری سمجھ میں نہیں آئے تھے

میں وہ اسم عظیم ہوں جس کو
جن و ملک نے سجدہ کیا تھا
میں وہ صبر صمیم ہوں جس نے
بار امانت سر پہ لیا تھا

سوچتے سوچتے یہ تو میری سمجھ میں آ گیا کہ انسان کی پیشانی میں اسم اللہ کا نور رکھا گیا ہے۔ سجدہ اسی کو کرایا گیا تھا۔ دوسرا شعر عجب طرح سے سمجھ میں آیا۔

میں جن حالات سے گزری تھی، ان میں آدمی جبر اور قدر کے فلسفے میں الجھ ہی جاتا ہے۔ میں سوچتی کیا میں چاہتی تو تم سے شادی کر سکتی تھی۔ کیا یہ میرے اختیار میں تھا۔ تمہاری محبت تو مجھے زبردستی سونپی گئی تھی۔ میں نے بارہا ارادہ تو تم سے محبت نہیں کی تھی۔ میں سوچتی کیا میں مجبور نہیں ہوں۔ یہ مجھے اختیار ہے۔ اگر میں مجبور محض ہوں تو پھر سزا کیسی اور جزا کیوں۔ اس سلسلے میں، میں مطالعہ کرتی رہی۔ ایک دن میں مولانا ابوالاعلیٰ سے مودودی کی کتاب جبر وقدر، پڑھ رہی تھی کہ ٹھٹک گئی۔ لکھا تھا۔ انسان کی عظمت اس میں بھی ہے کہ اس نے اللہ کی ایک عظیم امانت کا بوجھ اٹھایا۔

شاہ فرید پڑھتے پڑھتے رک گئے۔ ان کے کانوں میں الٰہی بخش کی آواز گونجی۔ اللہ جی نے پکارا۔ ہے کوئی جو میری ایک امانت کا بوجھ

اٹھائے۔ یہ سن کر سمندر کی سانسیں ٹوٹنے لگیں۔ پہاڑ ہیبت سے لرزنے لگے۔ پوری کائنات پر لرزہ طاری ہو گیا......

شاہ صاحب حیرت سے خط پڑھتے گئے۔ لفظوں کا فرق تھا۔ خط میں بھی وہی کچھ لکھا تھا جو الٰہی بخش نے کہا تھا۔ وہ پڑھتے چلے گئے۔

یوں میری سمجھ میں ناصر کاظمی کا وہ شعر آ گیا۔ یقین ہے کہ تم بھی سمجھ چکے ہو گے۔ پھر بھی یہ سب لکھ دیا ہے کہ تم سے تعلق کی وجہ سے ضروری تھا۔ یہی ایک چیز تو تم سے شیئر کر سکتی ہوں میں۔

اب میں اپنی غرض بھی بیان کر دوں جس نے یہ خط لکھوایا ہے۔ میرے نزدیک تم بہت بڑے انسان تھے...... بڑے مقام والے پھر بھی میں ہمیشہ تمہارے لئے دعا کرتی رہی کہ اللہ تمہیں بڑا مرتبہ عطا فرمائے...... آخرت میں بڑا مقام۔ مجھے اللہ کی ذات سے یقین ہے کہ ایسا ہی ہو گا اور ایسا ہوا تو تم جنت میں جاؤ گے۔ جنت میں تم اپنی مرضی کا ساتھی بھی مانگ سکتے ہو۔ میری التجا ہے کہ اس موقع پر تم رب کریم سے مجھے طلب کر لینا...... اپنی سادی کو۔

یقین کرو، اس خواہش ہی کی وجہ سے میں نے شادی نہیں کی کہ کہیں اور پابند ہو جاؤں گی۔ دنیا میں اونچ نیچ ہے۔ تفریق ہے، اس لئے ہم نہیں مل سکے۔ تو وہاں تو مل سکتے ہیں، جہاں یہ جھگڑے نہیں ہوں گے، نہ کوئی شہری ہو گا نہ دیہاتی۔ میں نے شادی نہیں کی، سو اب تم اللہ کے حضور مجھے طلب کر سکتے ہو۔

میں شہری عورت ہوں۔ وفا کا دعویٰ ہے نہ حیا کا۔ لیکن اللہ کی پاکی کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ مجھے کبھی کسی مرد نے چھوا تک نہیں۔ اس لمس کے سوا میرے جسم پر کوئی داغ نہیں جو اس آخری رات تم سے لپٹنے کا نتیجہ ہے۔ اللہ نیتوں کا حال جانتا ہے۔ وہ بھی میں نے خواہش کے تحت نہیں کیا تھا۔ صرف تمہیں بھگانا مقصود تھا اور اس پر بھی اللہ سے توبہ کرتی رہی ہوں اور یقین ہے کہ میری توبہ قبول کر لی گئی ہے۔ میں بے داغ ہوں الٰہی بخش!

اب میں اس دنیا میں نہیں، مجھے امید ہے کہ تم میری آخری خواہش وقت آنے پر ضرور پوری کرو گے۔ میں تو اب بس تمہارا انتظار کروں گی۔ میری ہر غلطی کو معاف کر دینا۔

فی امان اللہ

فقط

تمہاری اور صرف تمہاری سادی!

......☆......

شاہ صاحب شل ہو رہے تھے۔ ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ ان کی سمجھ میں سب کچھ آ گیا تھا...... وہ بھی جو انہوں نے نہیں دیکھا تھا اور جو وہ نہیں جانتے تھے۔ دیر تک وہ ساکت بیٹھے رہے۔ آنکھوں سے آنسو بہتے رہے۔

پھر انہوں نے لرزتے ہاتھوں سے وہ خط مدثر کی طرف بڑھایا "یہ بھی پڑھ لو بالکو۔ تمہارا باپ تمہیں اپنی زندگی دکھانا چاہتا تھا۔ اللہ نے اس کی یہ خواہش بھی پوری کی دی۔"

تینوں لڑکے خط پڑھنے لگے۔

باؤنڈ بننگ کے جلاہے عاشق الٰہی بخش کی کہانی اختتام کو پہنچ گئی تھی۔

☆......☆......

لیکن نہیں۔ الٰہی بخش کی کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی تھی!

الٰہی بخش کی وفات کو دو ماہ ہوئے ہوں گے کہ حاجی نیاز محمد، شاہ فرید سے ملنے ان کے گھر آئے۔ انہوں نے اس بار حج کی سعادت حاصل کی تھی۔ انہوں نے شاہ فرید کو کھجور اور آب زم زم کا تحفہ پیش کیا اور ایک تسبیح بھی دی۔

دونوں باتیں کرتے رہے پھر حاجی نیاز محمد نے کہا "سنا ہے کہ الٰہی بخش فوت ہو گیا۔"

"ہاں بھئی موت تو سب کے لئے ہے۔ اللہ جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ بہت نیک آدمی تھا۔" شاہ صاحب بولے۔

"اس کے ہاں دعا کرنے چلیں گے۔"

"ضرور کیوں نہیں۔"

"دراصل اس کی ایک امانت ہے میرے پاس۔" حاجی صاحب نے وضاحت کی۔ "حج سے واپسی پر مجھے کراچی میں رکنا پڑ گیا تھا۔ یہاں آنے میں دیر ہو گئی۔"

دونوں باؤنڈ بننگ کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔

شام کا وقت تھا۔ الٰہی بخش کے تینوں بیٹے گھر میں موجود تھے۔ دعا ہوئی، پھر حاجی نیاز محمد نے وہ تھیلا کھولا، جو ان کے ہاتھ میں تھا "میرے پاس الٰہی بخش کی کچھ امانتیں ہیں۔" انہوں نے کہا "ایک تو الٰہی بخش کی اپنی ہے اور باقی آپ گھر والوں کے لئے۔"

لڑکے حیرت سے انہیں دیکھ رہے تھے۔

حاجی صاحب نے زم زم کی پانچ شیشیاں، کھجوریں، تین ٹوپیاں، پانچ تسبیحیں اور ایک جاء نماز دی "یہ زم زم کی ایک شیشی ایک تسبیح آپ پانچوں کے لئے ہے، میرا مطلب ہے تم تینوں کے اور تمہاری والدہ اور ہمشیرہ کے لئے۔ ٹوپی ایک ایک تم تینوں کے لئے ہے اور جاء نماز تمہاری ماں کے لئے۔ الٰہی بخش نے یہی کہا تھا مجھ سے۔"

مدثر نے تمام چیزیں لے لیں "جزاک اللہ فی الدین حاجی صاحب!"

حاجی صاحب نے پھر تھیلے میں ہاتھ ڈالا اور اس بار ایک بڑا رومال اور دعاؤں کی ایک چھوٹی سی کتاب نکالی۔ "اور یہ ہیں الٰہی بخش کی امانتیں۔"

"یہ ابا نے کب دیں آپ کو؟"

"حج کے بعد" حاجی نیاز محمد نے کہا روضہ رسول اکرم ﷺ کے سامنے اس سے ملاقات ہوئی۔ میں نے اس سے خیریت پوچھی۔ وہ کہنے لگا...... طبیعت ٹھیک نہیں ہے نیاز محمد۔ میں نے اس سے پوچھا...... یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے الٰہی بخش اس نے دکھایا دعاؤں کی یہ کتاب اس رومال میں لپٹی ہوئی تھی۔ میں نے کہا، یہ مجھے دے دو، اس نے یہ دونوں چیزیں مجھے دے دیں۔ پھر بولا...... نیاز محمد میرا ایک کام کرو گے۔ اس نے مجھ سے یہ تمام

چیزیں گھر لانے کی فرمائش کی۔ تم لوگوں کے نام لے کر کہا کہ کس کے لئے کیا لے جانا ہے۔ میں نے کہا یہ سب تو تم خود بھی لے جا سکتے ہو الٰہی بخش تو وہ اداسی سے کہنے لگا نہیں میں بہت بیمار ہوں۔ خود ہی پہنچ جاؤں تو بڑی بات ہے۔ تم بس میرا یہ کام کر دو۔ میں نے وعدہ کر لیا اور اللہ کی عنایت سے پورا بھی کر دیا۔ اب یہ الٰہی بخش کی امانتیں بھی لے لو بیٹے......"

شاہ فرید کی اپنی کیفیت عجیب تھی......وہ الٰہی بخش کے بیٹوں کی طرف کیا دھیان دیتے۔

حاجی نیاز محمد کا ہاتھ بڑھا ہوا تھا۔ لیکن کتاب اور رومال لینے کے لئے کوئی ہاتھ نہیں بڑھا۔ الٰہی بخش کے تینوں بیٹوں کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

"یہ لے لو نا بیٹے!" حاجی صاحب نے کہا۔

"چاچا آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔" مدثر نے رندھی ہوئی آواز میں کہا "ابا حج پر جا ہی نہیں سکے تھے۔"

حاجی نیاز محمد ہکا بکا رہ گئے "کیسی باتیں کر رہے ہو! میں خود ملا ہوں اس سے!"

"کوئی اور ہو گا چاچا۔ شکل ملتی ہو گی۔" مزمل بولا۔

"ہاں چاچا حج کے خرچ کے پیسے تو ابا نے پہلے ہی خرچ کر دیئے تھے۔ نہ خرچ کیے ہوتے تب بھی ابا کی حالت ایسی نہیں تھی کہ حج کر سکتے۔" مبشر نے اس کی تائید کی۔

"اور بقر عید کی اگلی صبح ابا کا انتقال ہو گیا تھا۔" مدثر نے کہا۔

"اور عید کے دن ابا باجی سے ملنے گئے تھے۔" مزمل نے شاہ فرید کی طرف اشارہ کیا۔

حاجی نیاز محمد نے تائید طلب نظروں سے شاہ فرید کی طرف دیکھا۔ انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا "یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں نیاز محمد۔"

"کچھ بھی ہو۔ مجھے یقین ہے کہ وہ الٰہی بخش ہی تھا۔" حاجی نیاز محمد نے کہا "تم یہ رومال دیکھو۔ یہ الٰہی بخش کا نہیں ہے کیا۔"

مدثر نے رومال لے کر اسے کھولا۔ وہ الٰہی بخش کا پسندیدہ رومال تھا۔ رنگین رومال، جس پر روضہ مبارک کی شبیہہ بنی تھی۔ الٰہی بخش اس رومال کو سر پر لپیٹے رہتا تھا۔ گزشتہ کئی روز سے یہ رومال نظر نہیں آ رہا تھا لیکن مدثر کو یاد تھا کہ الٰہی بخش نے عید کی نماز یہی رومال سر پر باندھ کر ادا کی تھی

"بھائی ذرا دکھاؤ تو۔" مزمل نے ہاتھ بڑھایا "یہ تو ابا کا ہی رومال معلوم ہوتا ہے۔"

"مجھ پر شک کرتے ہو۔ کیا میں جھوٹ بولوں گا۔" حاجی نیاز محمد بگڑ گیا۔

"غصہ نہ کرو نیاز محمد!" شاہ فرید نے ان کا کندھا تھپکا "لڑکوں کا قصور نہیں۔ بات ہی ایسی ہے۔"

اب مبشر رومال کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے کہا "یہ دیکھو۔ یہ ابا ہی کا رومال ہے۔"

ان سب نے دیکھا۔ رومال کے کنارے پر ننھے ننھے حروف میں الٰہی بخش کا نام لکھا تھا۔ رومال ایک بار لانڈری میں دیا گیا تھا۔ وہاں سے آیا تو یہ نام لکھا ہوا تھا۔ اب وہ سب گنگ تھے۔ ان کے سامنے ایک ایسی حقیقت تھی جو ان کی عقل سے ماورا تھی۔

دیر تک خاموشی رہی۔ حاجی نیاز محمد کے تصور میں وہ منظر چل رہا تھا، جب انہوں نے الٰہی بخش کو روضہ مبارک کے سامنے دیکھا تھا۔

"یہ کیسے ممکن ہے۔" مزمل بڑبڑایا۔

"یہ سب کیا ہے باجی؟" مدثر شاہ فرید کی طرف مڑا۔

"یہ اللہ کی باتیں ہیں بالکو، وہ جانے۔" شاہ فرید نے کہا "ہر بات سمجھنے کے لئے نہیں ہوتی۔ بعض باتیں پہلے ماننی پڑتی ہیں، پھر خود سمجھ میں آ جاتی ہیں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن......"

''میں تم لوگوں سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔'' شاہ فرید نے کہا۔ ''اور تم سے بھی نیاز محمد...... '' وہ نیاز محمد کی طرف مڑے۔ ''میں چاہتا ہوں کہ یہ بات بس ہم لوگوں کے درمیان رہے۔ اس کا کبھی کسی سے تذکرہ نہ کرنا۔''

''کیوں باجی؟''

''دو نقصان ہیں اس کے۔ کچھ لوگ تو اسے جھوٹ سمجھیں گے...... مذاق اڑائیں گے اور کیوں کہ یہ سچ ہے، اس لئے وہ نقصان میں رہیں گے...... دوسرے جو لوگ اسے سچ مان لیں گے، وہ الٰہی بخش کی قبر پوجنا شروع کر دیں گے۔''

''سچ کہتے ہیں آپ'' حاجی نیاز محمد بولے۔

''اور تم جانتے ہو کہ یہ تمہارے ابا کو پسند نہیں تھا۔'' شاہ صاحب نے لڑکوں سے کہا ''ورنہ وہ پہاڑی پر دفن ہونے کی مخالفت نہ کرتا۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں باجی!'' مدثر نے کہا۔

''بس اس کو بھول جاؤ۔ اب ہم چلتے ہیں۔''

لڑکوں نے انہیں احترام سے رخصت کیا اور ان کے جاتے ہی گھر میں اس رومال کو تلاش کرتے رہے لیکن وہ رومال انہیں کیسے ملتا! وہ رومال جو حاجی نیاز محمد انہیں دے کر گئے تھے اور جو بیٹھک میں میز پر رکھا تھا، وہ رومال گھر میں کہیں اور کیسے ملتا!

وہ تینوں گھر سے نکلے اور باپ کی قبر کی طرف چل دیئے۔

ڈیرے دی وِنڈ نامی گاؤں کے محلے سادات آبادی میں واقع فرید حسین شاہ کے مکان کے اوپری حصے میں آج بھی الٰہی بخش کا کیا ہوا وہی رنگ چمک رہا ہے...... الٰہی بخش کا رنگ!